زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

ثاقبہ رحیم الدین کی تصانیف
جنوری 2008ء تک

ادبی کتابیں

مرتب شدہ کتابیں

بچوں کے لئے کتابیں

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہار سُو

جلد: ۱۷ شمارہ مئی جون ۲۰۰۸ء

مجلسِ مشاورت
قارئینِ چہار سُو

زرِ سالانہ
دلِ مضطرب نگاہِ بیتاب

چہار سُو کا زیرِ نظر شمارہ!

عالمی تجار کے بھیس میں انسان نما حیوانوں کی ذہنی صحت یابی

کی دعا سے منسوب ہے!!

ہوسِ زر کے عارضے میں مبتلا یہ لوگ، جسم و جاں کی خاص نعمتِ خداوندی کو

سٹے بازی کی نظر کر کے غریب کو غریب تر، نحیف کو نحیف تر اور ضعیف کو ضعیف تر

بنانے کی کوشش میں، کرۂ ارض کی ناتوانی یا شاید ناتمامی کا باعث بن رہے ہیں!!!

بانی مدیرِ اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیرِ مسؤل

گلزار جاوید

مدیرِ معاون

بینا جاوید

رابطہ: 537' ویسٹریج-III' راولپنڈی۔ فون: 92-51-5462495 فیکس: 5467235 ای میل: waqars_oma@yahoo.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسُو

○○○

قرطاسِ رالف رسل
اعزاز کے نام

○○○

- بصد اظہارِ تشکر -

محترم محمود ہاشمی / ڈاکٹر ارجمند آرا / جناب یعقوب نظامی / پرویز خان صاحب اور عزیزی فاری شاہ

O

زندگی کا نغمہ

رالف رسل (لندن)

میں 1918 میں پیدا ہوا اور سولہ برس کی عمر میں کیمیونسٹ تحریک سے وابستہ ہو گیا اور ابھی تک خود کو کیمیونسٹ تصور کرتا ہوں۔ 1946 سے اب تک کیمیونسٹ تحریک سے وابستہ لوگوں پر بدعنوانی کے الزام بھی لگے اور کیمیونسٹ تحریک کو زوال کا سامنا بھی رہا حتیٰ کہ سویت یونین کی متحدہ ریاست بھی ٹوٹ گئی مگر میرے خیال میں انسانی اقدار کو سمجھنے اور انسانیت کی خدمت کرنے کا اب بھی بہترین ذریعہ کیمیونسٹ تحریک ہی ہے۔ 1937 سے 1940 تک میں نے اس نظریہ سے متعلق بہت سا مواد اور خطوط سینٹ جان کالج میں پڑھے تھے۔ ازاں بعد قریب چھ سال کا عرصہ میں نے فوجی ملازمت میں بھی گزارا ہے جس میں سے قریب ساڑھے تین سال یعنی مارچ 1942 تا اگست 1945 کا عرصہ میں نے برطانوی فوجی کے طور پر انڈین فوج کے ساتھ انڈیا میں گزارا ہے۔ اردو اُس وقت، فوج کی زبان تھی۔ میرے لئے مسئلہ یہ تھا کہ میں کسی طرح یہ زبان سیکھوں۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ گفتگو کر کے اردو زبان سے واقفیت حاصل کروں۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ میں خود اردو مسودے پڑھنا شروع کروں۔ میں نے اردو زبان میں ہونے والے کارل مارکس اور لینن کے تراجم پڑھ کر اردو زبان میں کسی قدر مہارت حاصل کی۔

اس عرصہ کے دوران میرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ میں اردو لٹریچر تک رسائی حاصل کر سکتا۔ البتہ جب میں نے فوج کی ملازمت کے بعد اورینٹل کالج آف لندن میں داخلہ لیا تو اردو کی بابت میرے اشتیاق نے مجھے اردو میں ڈگری حاصل کرنے پر اُکسایا۔ چنانچہ 1949 میں اردو اور معاون زبان کے طور پر سنسکرت میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایک سال کے لئے مجھے لیکچرار کی آفر ہوئی جو میں نے بخوشی قبول کر لی۔ اس کے بعد میں تعلیمی چھٹیوں پر انڈیا اور پاکستان کے دورے پر چلا گیا۔ میرا زیادہ وقت علی گڑھ میں گذرا جہاں اُس وقت کے عالم، ادیب اور سکالر کے ساتھ تبادلہ خیال کرتے کرتے میری اردو کافی بہتر ہو گئی۔ یہیں میری دوستی جناب خورشید اسلام سے ہوئی۔ 1953 تا 1956 کے دوران خورشید السلام کے ساتھ میں بطور ''OVERSEAS LECTURER'' کے منسلک رہا۔ اس عرصے میں ہم دونوں نے مل کر یہ طے کیا کہ ہم مشترکہ طور پر، ایک ایسی سلسلے وار کتاب تحریر کریں جس کی مدد سے انگلش بولنے والے لوگ اردو ادب بلخصوص مغل دور کے اہم شعرا کے علاوہ غالب کی بابت تفصیل سے معلومات حاصل کر سکیں۔

میں نے اپنی تقرری کے دوران تعلیمی نصاب میں، بہتری کا عمل جاری رکھا اور ایک کورس ترتیب دے کر اپنی یونیورسٹی کے طلبا کی آسانی کے لئے 1980 میں ''آسان اردو'' کے نام سے شائع کرایا اور کیسٹ کے ذریعے بھی عام کیا۔ 1981 میں ''اردو نظم کے خاص میزان'' کے نام سے بھی ایک کتاب شائع ہوئی۔ اس کے بعد بالغ انگریزوں کے لئے ایک ایسا کورس ترتیب دیا جس کی مدد سے وہ ہندوستان میں بسنے والے بچوں اور بڑوں کے ساتھ آسان اردو میں گفتگو کر سکیں۔ یہ قصہ 1981 میں میری قبل از وقت ریٹائرمنٹ کا ہے۔ جب میں یونیورسٹی سے ہٹ کر عام لوگوں کو والتھم فوریسٹ، برمنگھم، بلیک برن، شوالے اور شیفیلڈ میں اردو سکھانے جایا کرتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس وقت عام لوگوں کو اردو سیکھنے کے لیے جو کورس میں نے ترتیب دیا تھا وہ ابتدائی مرحلے کا تھا مگر مجھے امید تھی کہ یہ اُن سکولوں میں بھی پڑھایا جائے گا جہاں میں اور میرے ساتھی اردو پڑھانے جایا کرتے تھے۔ اس کورس کا نام'' FOR LEARNERS IN BRITIAN'' تھا۔ اگر یہ کورس ہندوستان اور پاکستان میں، ابتدائی اردو سیکھنے والوں کے لئے استعمال میں لایا جاتا تو ذخیرۂ الفاظ کے باعث کافی مفید ہوتا۔

اہم تصانیف

(مضامین اس میں شامل نہیں ہیں)

۱۔ اپنی پہلی دو کتابیں میں نے خورشید الاسلام کے ساتھ مل کر لکھیں۔ پہلی کتاب کا عنوان تھا:

Three Mughal Poets: Mir, Sauda, Mir Hasan

اس کتاب کو Harvard University Press, USA، نے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا۔ اس کا برطانوی ایڈیشن Allen and Unwin نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔

۲۔ ***Ghalib: Life and Letters***

اس کتاب کے بھی دو ایڈیشنز نکلے۔ اسے بھی Harvard University Press اور Allen and Unwin نے شائع کیا۔

باقی درج ذیل کتابیں میری اپنی ہیں۔

۳۔ ***The Pursuit of Urdu Literature: A Select History***

اسے انگلینڈ میں Zed Press اور ہندستان میں Oxford University Press, India نے ۱۹۹۲ء میں شائع کیا۔

۴۔ ***An Anthology of Urdu Literature***

اسے انگلینڈ میں Carcanet نے اور ہندستان میں Viking نے شائع کیا۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی، اور اس کا عنوان رکھا گیا: ***Hidden in the Lute*** بعد میں عنوان بدل کر ***An Anthology of Urdu Literature*** کر دیا گیا اور اس کا پیپر بیک ایڈیشن ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔

۵۔ غالب کی فارسی غزلوں سے انتخاب: ترجموں کے ساتھ

اس کتاب میں غالب کے فارسی اشعار کے ساتھ افتخار احمد عدنی کا اردو ترجمہ اور میرا انگریزی ترجمہ شامل ہے۔ آمنے سامنے کے صفحات پر ایک طرف انگریزی ترجمہ اور ایک طرف فارسی متن اور اس کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی نے انجمن ترقی اردو پاکستان کے تعاون سے ۱۹۹۷ء میں شائع کی۔

۶۔ ***The Famous Ghalib***

اس کتاب کو Roli Books نے ہندستان سے ۲۰۰۰ء میں شائع کیا۔ اس میں غالب کی اردو غزلوں کا انتخاب اور اس کا انگریزی ترجمہ شامل ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اشعار کا متن اردو، دیوناگری اور رومن میں دیا گیا ہے۔

۷۔ ***How Not to Write the History of Urdu Literature and Other Essays on Urdu and Islam***

اسے Oxford University Press, India نے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا۔

۸۔ ***The Oxford India Ghalib: Life, Letters and Ghazals***

یہ کافی ضخیم کتاب ہے اور ۲۷۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سے اکثر چیزیں وہ ہیں جو پہلے بھی شائع ہو چکی تھیں لیکن آخری حصے میں غالب کی فارسی شاعری پر الیساندرو بوسانی (Alessandro Bausani) کا مضمون ہے اور فارسی غزلوں کا انتخاب اور میرا انگریزی ترجمہ شامل ہے۔ یہ کتاب Oxford University Press, India سے ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی۔

۹۔ ***The Seeing Eye: Selection from the Urdu and Persian Ghazals of Ghalib***

یہ کتاب الحمرا، پاکستان نے ۲۰۰۳ء میں شائع کی۔ اس میں غالب کی اردو اور فارسی غزلوں کا وہی انتخاب اور ترجمہ ہے جو Oxford India Ghalib میں ہے، لیکن اس میں انگریزی ترجمے کے ساتھ اردو اور فارسی متن آمنے سامنے چھپے ہیں۔ Oxford India Ghalib میں اردو فارسی متن شامل نہیں ہے۔

۱۰۔ اردو ادب کی جستجو

یہ ***The Pursuit of Urdu Literature*** کا اردو ترجمہ ہے جسے محمد سرور رجا نے کیا ہے۔
اسے انجمن ترقی اردو پاکستان نے ۲۰۰۳ء میں شائع کیا۔

''ضربِ تنقید''

○ ''انتظار صاحب کے لیے اطلاعاً عرض ہے کہ اگر اُن کے بقول حمید نسیم راسخ العقیدہ مسلمان تھے تو دانتے اور ایلیٹ کو جنون کی حد تک عیسائیت سے عشق تھا۔''

○ ''فاروقی صاحب کا کہنا ہے کہ چونکہ اردو ادب کا ایک بڑا حصہ شاعری پر محیط ہے اور افسانہ و ناول' وغیرہ کا باقاعدہ وجود نہیں ہے تو ان اضاف پر تنقید ہو تو کہاں سے ہو۔ یہ ایک بہت کمزور اور پھسپھی دلیل ہے''

○ ''یہ تو ایک دنیا نے دیکھ لیا کہ اوراق' شب خون اور دوسرے چند فیشن زدہ جرائد میں بیانیے کے خدوخال کو مسخ کر کے ہیئت اور تکنیک کے نام پر جن بے معنی' چیستانی تحریروں کو افسانے کا نام دیا گیا ہے وہ نہ تو مغربی جدیدیت کے رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں اور نہ انھیں علامتی تحریروں کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔''

○ ''اگر قارئین رائٹرز گلڈ کے پہلے دو چار سالوں کا جائزہ لیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ اس دوران صرف شہاب صاحب' جمیل الدین عالی صاحب' ابن انشا صاحب' شاہد احمد دہلوی صاحب اور جناب اشفاق احمد جیسے بانی ممبران نے نہ صرف یہ کہ نام و دام کمایا بلکہ حکومت کے اکاؤنٹ پر پاکستان کے افلاس زدہ رائٹرز کے نام نہاد نمائندے بن کر' کرۂ ارض کے اطراف چکر کاٹنے کی کوشش میں مصروف رہے۔''

○ ''ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے اپنی موکر کتاب ''نئی تنقید'' میں جدیدیت کی جو تعریف کی ہے اگر اس کو وزیر آغا صاحب اور فاروقی صاحب درست تسلیم کرتے ہیں تو پھر راقم یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ ان ہر دو فاضل حضرات کو خود ان کے تعلق نے گمراہ کر دیا تھا۔

مذکورہ بالا اقتباسات نامور افسانہ نگار جناب ناصر بغدادی کی تازہ کتاب ''ضربِ تنقید'' سے رقم کیے گئے ہیں۔ جناب ناصر بغدادی کے نقطہ نظر سے اختلا اور اتفاق ہر صاحب شعور کا حق ہے مگر جس طور جناب ناصر بغدادی نے نہایت قلیل عرصے میں ''بادبان'' کے اداریوں کے ذریعے اپنے تنقیدی شعور اور تنقیدی اپچ کا لوہا منوایا ہے اسکی روشنی میں ان کی تازہ تنقیدی کتاب ''ضربِ تنقید'' اردو ادب میں ایک بے باکانہ اسلوب کی حامل ایسی کتاب تصور ہوگی جس میں مصنف نے ہر اُس موضوع کو زیر بحث بنایا ہے جس کی بابت اُن کے ذہن میں کسی نہ کسی نوعیت کے تحفظات موجود تھے۔ وقت کا تقاضا اور ضرورت بلکہ لازمی ہے کہ جناب ناصر بغدادی جیسے لوگ آگے بڑھ کر تمام تر مصلحتوں' مجبوریوں اور لاچاریوں سے ماورا ہو کر اپنی بات کہنے کی جرأت کریں۔ بات ہوگی تبھی آگے بڑھے گی' اختلاف ہوگا تو اُس کے بطن سے کسی نہ کسی قسم کا اتفاق برآمد ہوگا۔ لہذا جناب ناصر بغدادی کی تازہ کتاب ''ضربِ تنقید'' ہر اُس ادیب' شاعر' نقاد اور صاحبِ علم کے لیے اُتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ اندھیرے کے لیے روشنی' دشمنی کے لیے دوستی، بھوک کے لئے خوراک اور جاہل کے لیے کتاب۔ یہ کتاب بھی ہے اور کتاب کی جانب بڑھنے والے سفر کا پیش خیمہ بھی۔ جس کی دستیابی' بادبان پبلی کیشنز' 8/14,2-E' بلاک 14 'معمار اسکوائر' گلشن اقبال' کراچی۔75300

براہِ راست

اردو زبان اُس سخت جان محبوب کی مانند ہے جو ان گنت و ان شمار بے وفائیوں اور بے مہریوں کا درد و کرب سہنے کے باوجود' ہمیشہ عاشقِ صادق کی راہ تکا کرتی ہے' اور جب' یہ عاشقِ صادق میسر آتا ہے تو اس کی اُڑان اور اُٹھان اس قدر دیدنی ہوا کرتی ہے کہ رشک کے ساتھ' حسد کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے!

پروفیسر رالف رسل اردو زبان' اردو ادب' اردو شاعری کے ایسے سچے' کھرے اور بے لوث عاشقِ صادق ہیں جن پر نہ صرف اردو زبان' اردو ادب' اردو شاعری بلکہ ان کے عشق میں گرفتار ہر ہر فرد رسل صاحب کی فتوحات کی نسبت کبھی رشک کے احساس سے سرشار ہوتا ہے تو کبھی حسد کی کیفیت میں مبتلا ہونے لگتا ہے!!

آج کی انجمن میں ہم جناب رسل کے حیات و کارناموں سے مقدور بھر آگاہی کے بعد یکجا و یک جان ہو کر' خدائے بزرگ و برتر کے حضور جناب رسل کی صحت یابی اور درازئ عمر کی دعا صدقِ دل سے کریں گے!!!

(گلزار جاوید)

☆ انٹرویو کی ابتدا ہم آپ کو جارجی (GEORGY) کے نام سے مخاطب کر کے اس سوال سے کرنا چاہیں گے کہ نوردگم کے فرمان کے مطابق آپ اپنی تکمیل کرنے میں کس قدر کامیاب ہو سکے ہیں؟

☆☆ میرے خیال میں کسی بھی انسان کی تکمیل ایک طرح سے اس کی موت ہوا کرتی ہے میں بھی طبعی موت سے پہلے جستجو کو جاری رکھنا چاہتا ہوں۔

☆ کیا اب بھی آپ ایک ساتھ چائے کے دو کپ پیا کرتے ہیں نیز سگریٹ اور شراب سے مراسم کس نوعیت کے ہیں؟

☆☆ میں نے کبھی سگریٹ نہیں پیا اور کبھی اس کی خواہش نہیں ہوتی ہے۔ جہاں تک شراب کا تعلق ہے تو جب کبھی کوئی مہمان آجائے تو اس کے ساتھ کچھ شوق فرما لیتے ہیں۔ اکیلے میں ہفتے میں دو یا تین دفعہ وہسکی کے پیگ ہو جاتے ہیں۔ چائے میں صبح کے وقت پیتا ہوں لیکن اب دو پیالے والی بات نہیں رہی۔ شام کے چھ بجے بھی پیتا ہوں اسطرح دن میں کئی کپ ہو جاتے ہیں لیکن صبح اور شام کی چائے ضروری ہے۔

☆ قیامِ برصغیر کے دوران' ہندوستانی کھانے آپ بڑی رغبت سے کھایا کرتے تھے۔ وطن واپسی کے بعد کب تک وہاں کے کھانوں کا ذائقہ آپ کو اپنی یاد دلاتا رہا اور آپ نے کن ذرائع سے اپنی خواہش کی تکمیل کی؟

☆☆ یہ دلچسپ بات ہے کہ 1946 میں لندن یونیورسٹی میں اُردو پڑھنی شروع کی اُس وقت ایک ہی ہندوستانی ریسٹورنٹ تھا جو کہ صحیح معنوں میں ہندوستانی ریسٹورانٹ کہا جا سکتا تھا۔ اس کا نام شفیع ریسٹورانٹ تھا اور اُس کا ذکر سجاد ظہیر کی کتاب ''لندن کی ایک رات'' میں بھی ہے۔ لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد ہندوستانی ریسٹورانٹ کی کثرت ہو گئی اور Super market جیسے مارکس اینڈ سپنسر (Marks & Spencer) میں ہندوستانی کھانے عام ملتے ہیں۔ کھانے میں ہر طرح کے کھاتا ہوں اور باقی تمام کھانوں کی طرح یہاں ہندوستانی کھانے بھی بہت عام ہیں۔

☆ مشرقی کھانوں کی طرح مشرقی تہذیب (آپ کے خیال میں اگر کوئی ہے) سے آپ کس طرح متاثر ہوئے۔ کچھ اس کے حسن و قبح پر اظہار خیال فرمایئے؟

☆☆ اُردو والے جب مشرق کی بات کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں ہوتا ہے۔ عرب، ایرانی، ہندوستانی، پاکستانی مسلمان وغیرہ۔ حالانکہ مشرق کے بہت وسیع معنی ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے اردو زبان کے ذریعے سے مجھے مشرقی تہذیب سے واسطہ پڑا۔ شروع میں میں یہ سنتا رہا کہ اردو والے غزل کو پسند کرتے ہیں۔ لہذا میں نے غزل کا مطالعہ شروع کیا تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا اور میں نے اس کے بارے میں ایک مضمون لکھا'' The Pursuit of Urdu Ghazal'' وہ مضمون مختلف کتابوں میں شائع ہوا ہے۔ میرا ایک مجموعہ ہے'' The Pursuit In Urdu Literature'' اس میں پہلا مضمون ہی وہ ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا

ہے۔زیر بحث مضمون کا اردو ترجمہ بھی موجود ہے جو کہ ''محمد سرور رجا'' صاحب نے کیا ہے۔ تو یوں جب شروع میں مجھے غزل سمجھ میں نہ آئی تو میں نے سوچا کہ مجھ میں کوئی کمی ہے اور مجھے مزید علم حاصل کرنا چاہیے لہٰذا میں نے بے شمار کتب کا مطالعہ کیا اور اب نہ صرف غزل بلکہ مشرقی تہذیب کے بارے بھی میری رائے بہت عمدہ اور علم کافی وسیع ہے۔

☆ پرانے دوستوں میں کون کون بقید حیات ہیں۔ اور کن کن سے ملاقات ہوا کرتی ہے اور ملاقات میں گفتگو کا موضوع اکثر کیا ہوا کرتا ہے؟ کچھ تفصیل بھائی بہنوں اور بیٹا بیٹیوں کے بارے میں بتا سکیں؟

☆☆ میرے دوست دو قسم کے ہیں ہندوستانی اور پاکستانی دوست' آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ میں بہت پرانا کمیونسٹ ہوں۔ یعنی تیس کے عشرے میں میں کمیونسٹ ہو گیا تھا اور اب بھی میرا وہی نسب العین ہے۔ مانا کہ اب یہ تحریک قریب قریب ختم ہو گئی ہے لیکن میں اب بھی اپنے نظریے پر قائم ہوں۔ اُس زمانے میں' جب میں پہلی دفعہ تعلیمی رخصت لے کر ہندوستان گیا تو تین لوگوں سے خاص طور پر ملاقات ہوئی۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان میں سے ایک ہندو دوسرے مسلمان اور تیسرے سکھ تھے۔ سوم آنند پنجابی ہیں اور دہلی میں مقیم ہیں لیکن اُس نسل کے ہندو جو اردو کو ادبی زبان سمجھتے تھے۔ ہندی ان کو برائے نام آتی ہے چونکہ اردو ان کی اصل زبان ہے۔ کبھی کبھی آل انڈیا ریڈیو میں کام کرتے ہیں۔ حیدرآباد دکن کے ایک اردو اخبار ''سیاست'' کے لئے مضامین بھی لکھتے ہیں۔ دوسرے سجاد علی صاحب جو کہ جامعہ ملیہ دہلی میں پڑھاتے ہیں میرے بہت پکے دوست ہیں۔ میں جب بھی ہندوستان جاتا تھا ان ہی کے گھر قیام کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب مجیب صاحب شیخ الجامعہ ہوا کرتے تھے انہوں نے مجھ سے گلہ کیا کہ آپ میرے ہاں قیام کیوں نہیں کرتے تو میں نے ان سے کہا کہ جناب آپ لکھنوی آدمی ہیں اور آپ کو یہ علم ہونا چاہیے کہ وضع داری کیا ہوتی ہے۔ میرا جواب سن کر مجیب صاحب خاموش ہو گئے۔ سجاد صاحب کی اولاد سے میرے تعلقات اب بھی ہیں۔ ان کی بڑی بیٹی تسلیم جمال جسے پیارے سب گڈی کہتے ہیں سے میری اب بھی ''E-Mail'' کے ذریعے خط و کتابت ہے۔ تیسرے دوست ہیں جو گندر سنگھ شمشیر وہ ہندوستان سے انگلستان آ کر آباد ہو گئے یہیں شادی کی اور یہیں اُن کی اکلوتی بیٹی پیدا ہوئی۔ بیوی کی وفات کے بعد جو گندر صاحب کینیڈا منتقل ہو گئے مگر ہمارا رابطہ اسی طرح استوار ہے۔ یہ بات تو آپ کے علم میں ہے ہی کہ جو گندر صاحب زیادہ تر پنجابی میں ہی لکھتے ہیں۔ اردو کے حوالے سے جو خاص لوگ ہیں ان سے میری بہت گہری دوستی نہیں لیکن تعلقات اچھے ہیں۔ ایک زمانے میں کرشن چندر میرے بہت اچھے دوست تھے۔ منٹو سے میری صرف ایک ملاقات ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو کافی پسند کیا تھا۔ علی سردار جعفری' احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض سے میری اچھی راہ رسم تھی۔ پہلی دفعہ میں سن پچاس میں لاہور گیا تو فیض صاحب کے ہاں ہی ٹھہرا تھا تو شوکت تھانوی سے بھی ملاقات رہی۔ نئے لوگوں کے ناموں سے میں واقف تو ہوں مگر ان کی تصانیف میں نے زیادہ نہیں پڑھیں۔ جہاں تک سوال کے اس حصے کا تعلق ہے جس میں آپ نے میری اولاد اور بھائی بہنوں کے بارے میں دریافت کیا ہے۔ میری تین اولادیں ہیں۔ بیٹے آئین جو سب سے بڑے ہیں 1951 میں پیدا ہوئے۔ بڑی بیٹی سارہ جو 1954 میں پیدا ہوئیں چھوٹی بیٹی ہیلن 1960 میں پیدا ہوئیں۔ تینوں شادی شدہ ہیں البتہ چھوٹی بیٹی کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ آپ کی دعا سے ہمارے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ ہر مہینے باقاعدگی سے ملاقات ہوتی ہے۔ 1948 میں میری شادی ہوئی تھی اور 1989 میں بیوی سے علیحدگی ہو گئی لیکن ہمارے تعلقات کشیدہ ہرگز نہیں ہیں۔

☆ سنا ہے! آپ دوستوں کے بارے تفصیل جاننے کے بڑے شائق ہیں۔ کچھ لوگ آپ کی اس عادت کو کمیونسٹ سائیکی سے بھی جوڑتے ہیں؟

☆☆ یہ بات کسی حد تک صحیح ہے اور میرے مزاج میں بھی شامل ہے کہ جب میں کسی آدمی کو پسند کرتا ہوں تو اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ شاید میری اس عادت کا کمیونسٹ عقیدے سے بھی کسی حد تک تعلق ہو۔ ڈاکٹر ارجمند آرا نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں بھی اس بات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

☆ دوران ملازمت ماتحت ملازمین میں اشتراکی نظریے کی تبلیغ سے آپ کیا نتائج حاصل کرنا چاہتے تھے اور آپ کو اپنے مقصد میں کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی؟

☆☆ جہاں تک سوال کامیابی اور ناکامی کا ہے اس کا فیصلہ آپ یا دوسرے لوگ کریں تو بہتر ہے۔ میرے عمل کی بابت یہی کہا جا سکتا ہے کہ میں وہی کرتا تھا جو دیگر کمیونسٹ لوگ کیا کرتے ہیں۔

☆ اکادمک کام کی فائل بنانا اپنی جگہ مستحسن سہی مگر دوستوں کو اس کی ترسیل کے مقاصد کیا تھے؟

☆☆ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' میں اپنے دوستوں کو کچھ نہیں بھیجا کرتا تھا البتہ جب میں اپنی کوئی کتاب چھاپتا تو اپنے دوستوں کو سنانا ضرور تھا جس کے باعث میرے ساتھ کام کرنے والے میرے متعلق بھی کچھ جانتے تھے مگر میں نے اہتمام کے ساتھ نہیں کبھی کوئی چیز نہیں بھیجی۔

☆ روزنامچہ لکھنے کی عادت کب اور کن وجوہات کی بنا پر آپ کی روٹین میں شامل ہوئی اور اب تک لکھے گئے روزنامچوں سے آپ اور آپ کے احباب نے کس طرح سے استفادہ کیا؟

☆☆ روزنامچہ لکھنے کا سلسلہ 1980 سے شروع ہوتا ہے اور اس کے سارے سودے میرے پاس محفوظ ہیں اور میں ابھی بھی روزنامچہ لکھتا ہوں۔ ہفتہ گزرنے کے بعد پورے ہفتے کے چیدہ چیدہ حالات قلم بند کرتا ہوں پہلے پہل کچھ خاص دوستوں کو دکھاتا تھا از اں بعد کئی دوسرے دوستوں نے فرمائش کی تو قریب پچاس لوگوں کو E-mail کے ذریعے ارسال کرتا ہوں۔ یہاں یہ بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ میری آپ بیتی ’’Findings Keepings‘‘ کی پہلی جلد شائع ہو چکی ہے دوسری اسد زیدی صاحب جلد ہی انڈیا سے شائع کرنے والے ہیں تیسری اور آخری جلد کا سوادابھی دو تہائی کے قریب تیار ہے۔

☆ انگریز شاونزم سے بچپن میں نفرت کے اسباب کیا تھے اور آج اس کی بابت آپ کس مقام پر کھڑے ہیں؟

☆☆ مجھے ہر قسم کے شاونزم سے نفرت ہے چاہے وہ ہندو، مسلم شاونزم ہو یا کوئی اور مجھے اس کی بابت سوچ کر ہی سخت تکلیف ہوتی ہے اور میں ایسے لوگوں سے شدید نفرت کرتا ہوں جو انسانوں سے ان کی شناخت کے حوالے سے نفرت کرتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے لوگ گولی مار دینے کے لائق ہیں۔ I Hate Them انگریز شاونزم میری تنقید کا ہمیشہ نشانہ رہا ہے میری لڑائی ہمیشہ ان لوگوں کے خلاف رہی ہے جو انگلینڈ میں کالے اور گوروں کے درمیان تفریق کرتے ہیں۔

☆ فیلوز کو سر نہ کہنے کے اسباب کیا تھے؟

☆☆ یہ اسکول کے زمانے کی بات ہے میں اپنے اساتذہ کو سر کہہ کر مخاطب نہیں کیا کرتا تھا۔ میرے اس عمل پر میری ایک ٹیچر نے خوشی کا اظہار کیا۔ ویسے یہ سر وغیرہ کہنے کی عادت مجھے اب بھی نہیں ہے نہ مسٹر اور مسز وغیرہ۔ اردو بولتے وقت بھی میں تکلفات میں نہیں پڑتا۔ مثلاً تشریف لائیے' آیئے یا بیٹھیے۔ نہ اپنے بارے میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے عرض کیا۔ صرف یہ کہنا پسند کرتا ہوں کہ میں نے کہا میں کہتا ہوں۔ میں اس کی وضاحت کچھ اس طرح بھی کرنا چاہوں گا کہ فارسی کا ایک شعر ہے جس کے معنی کچھ اس طرح ہیں ’’میں ساری زندگی اپنے معشوق کی خدمت کرتا رہا اور مجھے اس بات پر فخر ہے‘‘ اب معشوق کا لفظ یہاں بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے مخاطب ایک شخص بھی ہو سکتا ہے ایک عقیدہ' ایک نصب العین یا خدا کی ذات بھی ہو سکتی ہے میرے بارے میں یہ بات کمیونزم پر صادق آتی ہے۔

☆ سوئس حکام کے ساتھ نباہ نہ ہونے کی وجوہات اور اس کے رد عمل میں ملنے والی دھمکیوں سے آپ کس طرح نبرد آزما ہوئے؟

☆☆ یہ جوانی کے باتیں ہیں' جب حوصلے جواں اور ہمت مضبوط ہوا کرتی تھی۔ میرے خیال میں اس وقت حافظہ اس حوالے سے کچھ اور کہنے پر آمادہ نہیں۔

☆ کیا آپ اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ دنیا میں بڑے کارنامے انجام دینے والے کسی نہ کسی شکل میں نارمل انسان نہ تھے؟

☆☆ جن لوگوں نے اپنی زندگی میں کسی نہ کسی طور کوئی منفرد کارنامہ سرانجام دیا اس کی بنا پر انہیں نارمل انسان نہیں کہا جاتا۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ پاگل یا دیوانے تھے۔ بلکہ اس کا یہ مفہوم نکالنا چاہیے کہ وہ زیادہ بہتر دماغ اور زیادہ بہتر صلاحیتوں کے حامل انسان تھے۔

☆ احباب رسل کی معقول تعداد آپ کے مزاج کے بے چینی اور بے صبری نیز اپنے سے بڑی عمر کی خواتین میں آپ کی دلچسپی کو نفسیاتی کجی سے تعبیر کیا کرتی ہے؟

☆☆ نوجوانی میں میرا معاملہ ایک بڑی عمر کی خاتون کے ساتھ ہوا اور کچھ عشق وشق کا چکر بھی رہا لیکن اس کے علاوہ کسی اور بڑی عمر کی خاتون میں میری دلچسپی نہیں رہی نہ میں نے کبھی اپنے ذہن کی ہیجانی کیفیت کو محسوس کیا ہے لہٰذا اس بابت میرا کچھ کہنا زیب نہیں دیتا۔

☆ آپ کے ہاں جنسی رویوں میں عدم تحفظ کا احساس کس جانب اشارہ کرتا ہے؟

☆☆ میں اس سوال کے جواب میں فقط اتنا کہنا چاہوں گا کہ میں آپ کی رائے سے متفق نہیں ہوں۔

☆ ایک رائے یہ ہے کہ آپ اپنی تحریروں میں بلا جواز اس وقت جنسی حوالے شامل کر لیتے ہیں جب آپ کو اپنی تحریر کے بودے پن کا احساس ستانے لگتا ہے؟

☆☆ میں نے اپنی آپ بیتی میں نہایت ایمانداری اور تفصیل کے ساتھ اپنے جنسی رویوں کے بارے میں لکھا ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا مگر میں اس بات کا قائل ہوں کہ میں نے جوانی میں کوئی ایسے کام نہیں کیے جو بہت سارے لوگوں نے کیے ہوں تو اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔

☆ آپ کی ناکام ازدواجی زندگی کے اسباب کی بابت بھی ابہام پایا جاتا ہے؟

☆☆ میں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ

میری ازدواجی زندگی ناکام نہیں تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اگر زیادہ خوش نہیں تھا تو تکلیف میں بھی نہیں تھا۔ اصل میں ہمارے مزاج کا فرق ہمارے درمیان حائل تھا جس کا سبب میری بیوی کی کم تعلیم کو بھی گردانا جا سکتا ہے مگر میں اس بات کو اہمیت نہیں دیتا میں اسے مزاج کے مختلف ہونے سے ہی تعبیر کروں گا۔

☆ کمیونسٹ تحریک سے آپ کی وابستگی سب پر عیاں ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ ہمارے قارئین کو ان شخصیات اور لٹریچر سے آگاہ فرمائیں جس کے زیرِ اثر آپ کا میلان اس جانب پختہ ہوا؟

☆☆ اس سوال کے جواب میں پوری کتاب تحریر کی جا سکتی ہے لہذا میں آپ اور آپ کی توجہ اپنی آپ بیتی ''Findings Keepings'' کی جانب مبذول کرانا چاہوں گا جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر ارجمند آرا نے ''جوئندہ یابندہ'' کے نام سے کیا ہے۔ اور یہ کتاب پاکستان میں سٹی پریس کراچی سے دستیاب ہے۔

☆ جوانی کے ایام دوسری جنگ عظیم کے دور سے نہ گزرتے تو آج ہم کس قسم کے رسل سے ہم کلام ہوتے یعنی تب بھی آپ کا رجحان اشتراکی تحریک کی جانب ہوتا؟

☆☆ میرے خیال میں مفروضہ پر مبنی سوال پوچھنا بے سود ہے اگر مگر کی بحث میں پڑے بغیر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ دوسری عالمی جنگ کے زمانے اور فوجی ملازمت کے دوران میں نے بہت کچھ سیکھا۔ ساڑھے تین سال کے مختصر عرصے میں بہت سے لوگوں سے ملا چونکہ میں کمیونسٹ تھا اس لیے انڈیا کی آزادی کا خواہش مند تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ مجھے کمیونسٹ تحریک اور اس سے وابستہ لوگوں کی مدد کے سلسلے میں کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ''Militry Intelligence'' کو میری سرگرمیوں کا علم تھا اور انہوں نے میرے کمانڈنگ آفیسر سے بھی اس بارے میں پوچھ تاچھ کی مگر مجھے کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔

☆ کمیونسٹ تحریک کی بابت آج آپ کس مقام پر کھڑے ہیں۔ آپ کے خیال میں یہ نظریہ تھا، تھیوری تھی، تحریک تھی یا سحر بیانی اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو دنیا کا نقشہ اور حالات کس طرح کے ہوتے؟

☆☆ جس وقت میں کمیونسٹ ہوا اس تحریک کا نصب العین جو اس وقت تھا اب بھی ہے اس میں کوئی غلطی اب بھی میرے خیال میں نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اسٹالن کا دور کیسا تھا۔ اس زمانے میں ہمیں یہ سمجھ نہ تھی کہ لوگ اس پر الزام کیوں لگاتے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ کمیونسٹ تحریک کی مزمت میں ایسا کرتے ہیں۔ اگرچہ کچھ الزامات درست بھی تھے۔ اس دور کے بعد کمیونسٹ تحریک اور کمیونسٹ ملکوں میں جو کچھ ہوا اس کا کمیونسٹ تحریک سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ جیسا کہ چائنیز کمیونسٹ پارٹی کو میں صحیح معنوں میں کمیونسٹ نہیں سمجھتا۔ میں ہر ناانصافی اور ظلم کے خلاف ہوں۔ اگر کمیونسٹ لوگ کسی طرح کے ظلم و ناانصافی کا حصہ ہوں تو میں ان کے بھی خلاف ہوں۔ اب جو Kerela اور ویسٹ بنگال میں کمیونسٹ تحریک باقی ہے ان میں بہت سی خامیاں ہوں گی مگر انہوں نے کئی اچھے کام بھی کیے ہیں۔ مثال کے طور پر انڈیا کی مختلف ریاستوں میں حکومتیں بدلتی رہیں لیکن ویسٹ بنگال میں اب بھی کمیونسٹ پارٹی کی حکومت ہے اور لوگ وہاں کمیونسٹ پارٹی کو اب بھی ووٹ دیتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ ان لوگوں نے عوام کی خدمت کی ہے۔ بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ سوویت یونین میں کمیونزم کے خاتمے کے بعد حالات کہیں بدتر ہیں۔

☆ کمیونسٹ تحریک آپ کے خیال میں ختم ہو چکی یا نہیں گر جواب نا میں ہے تو آپ اس تحریک کے مستقبل کی بابت کیا پیش گوئی کرنے کی پوزیشن میں ہے؟

☆☆ میرے خیال میں کمیونسٹ تحریک عملی طور پر ختم ہو چکی ہے ساؤتھ افریقہ اور ویسٹ بنگال وغیرہ میں اب بھی وہ لوگ اچھے کام کر رہے ہیں مگر میرے خیال میں اس طرح کمیونسٹ تحریک کا Revival نہیں ہو سکتا۔ میں ان لوگوں کی قدر کرتا ہوں جو انفرادی طور پر کمیونسٹ تحریک سے وابستہ ہیں۔ انگلینڈ میں تو کئی چھوٹی چھوٹی پارٹیاں اب بھی موجود ہیں لیکن میں کسی سے بھی وابستہ نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے بلکہ پختہ ایمان ہے کہ ہر سیاسی پارٹی کا ہر لیڈر جھوٹا ہوتا ہے۔

☆ برطانیہ کے مفادات دوسروں کے مفادات سے بالاتر کی سوچ کس سائیکی کی عکاس ہے؟

☆☆ میرے خیال میں کسی قوم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے مفادات کو دوسروں کے مفادات سے بالاتر سمجھے۔ میں اس طرح کی سوچ سے شدید نفرت کرتا ہوں۔ میرے خیال میں نہ صرف برطانیہ بلکہ تمام ممالک اپنے مفادات دوسرے ممالک کے مفادات سے بالاتر رکھتے ہیں۔ But I Do Not Agree With Any Of Them Include America,Russia or Britains.

☆ کیا برطانیہ کی جگہ اب کسی اور ملک کا نام تحریر نہ ہونا چاہیے جس کی کالونی بننے پر برطانیہ عظمیٰ بھی فخر محسوس کرتا ہے؟

☆☆ میرے خیال میں برطانیہ کی حکومت امریکہ کو Follow کرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ American Slaves ہیں۔ یہ غلط ہے بلکہ

دونوں حکومتیں مکمل طور پر غلط ہیں۔

☆ برطانیہ اور فرانس کی حکومتیں کن وجوہات کی بنا پر ادولف ہٹلر کے لئے ہمدردی کے جذبات رکھتی تھیں اور ہٹلر نے کن وجوہات کی بنا پر اس سافٹ کارنر کا فائدہ نہ اٹھایا؟

☆☆ جب روس میں کمیونسٹ حکومت بنی تو باقی دنیا کا خیال تھا کہ اُنہیں ختم کر دیا جائے۔ فرانس اور برطانیہ بھی اس بات کے حامی تھے کہ روس کی حکومت ختم ہو جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ہٹلر کو خوش رکھیں گے تو وہ روس پر حملہ کر دے گا۔ اس لیے انہوں نے جرمنی کا مقابلہ نہیں کیا اور اس کا نقصان بھی انہیں خود اٹھانا پڑا۔

☆ یورپ جنگ کے زمانے کی تاریخ مسخ کر کے کیا نتائج حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آپ کے خیال میں وہ اپنے مقاصد میں کس حد تک کامیاب ہوا؟

☆☆ دوسری عالمی جنگ کے بعد ساری مغربی دنیا کی حکومتیں یہ چاہتی تھیں کہ وہ اس حقیقت کو چھپائیں کہ جرمنی کو سوویت یونین کی وجہ سے شکست ہوئی ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جرمنی کی شکست کا باعث سوویت یونین کی حکومت تھی۔ یہ لوگ دنیا کے سامنے یہ تصویر پیش کرنا چاہتے تھے کہ ہم نے جرمنی کو شکست دی ہے۔ بڑی حد تک یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے اور مغربی ملکوں کی بڑی اکثریت اس بات کو سچ مانتی رہی کہ جرمنی کو انہوں نے شکست دی ہے۔

☆ آپ کیا تصور کرتے ہیں فرینچ سوویت طرز کا معاہدہ برطانیہ اور دیگر اتحادی ممالک میں اگر طے پا جاتا تو جنگ کا نتیجہ اور دنیا کا نقشہ کس قسم کا ہوتا؟

☆☆ اگر 1939 کے شروع میں برطانیہ، فرانس اور روس کا عالمی معاہدہ ہو جاتا تو دوسری عالمی جنگ کبھی شروع نہ ہوتی۔

☆ ایک زمانے میں آپ نے جرمن طاقت کو تاریخ کی مکروہ اور غیر انسانی طاقت سے تعبیر کیا تھا اگر آپ سے آج کوئی اس بابت دریافت کرے تو آپ کیا فرمانا پسند کریں گے؟

☆☆ میں آج بھی اس نظریے پر قائم ہوں کہ جرمن طاقت اور حکومت اُس وقت ایک Evil سے کم نہ تھی۔ گو کہ اب وہ اسے بالکل نہیں مانتے۔

☆ آپ نے مہاتما گاندھی کے سیاسی کردار پر شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے مگر برصغیر کے دوسرے سیاسی لیڈروں اور تقسیم ہند بالخصوص تحریک پاکستان کی بابت آپ کے ہاں خاموشی ہے؟

☆☆ گاندھی کے بارے میں ایک کتاب "Gandhi The Mahaatma And The Ism" میں اُن کی بابت تفصیلی معلومات دستیاب ہیں۔ گاندھی وہ واحد ہندوستانی لیڈر تھے جو ہندوستان کی آزادی کا خواب پورا کر سکتے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی لیڈر ایسا نہ تھا جو آزادی کی تحریک کو زندہ رکھ سکتا۔ آزادی کی کوئی راہ تھی تو وہ گاندھی کے بغیر نامکمل تھی۔ گاندھی نے اس تحریک کو اپنی شرطوں پر چلایا۔ بنیادی طور پر گاندھی زمینداروں اور سرمایہ داروں کے حق میں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان لوگوں کو اپنے ملازمین کی طرف ہمدردانہ برتاؤ کرنا چاہئے۔ گاندھی ایسا کہتے ضرور تھے مگر وہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مفادات کو بھی کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔ میرے خیال میں گاندھی کے اس عمل نے ان کے سیاسی قد کو کافی نیچا کیا۔ میں سمجھتا ہوں وہ ایک بزرگ اور ولی کی مانند تھے۔ ہندو مسلم فسادات کے دوران انہوں نے جس عمل کا مظاہرہ کیا ساری دنیا کو اس کے لیے ان کی عزت کرنا چاہیے۔

جہاں تک سوال آپ کے اشتیاق کا ہے تو میرے خیال میں آپ جناح صاحب کی بابت میری رائے دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ جناح صاحب ایک سچے لیڈر اور بڑے قانون دان تھے مگر میرے لیے ان کی Idialogy سے اتفاق کرنا قدرے دشوار ہے۔ میرے خیال میں جناح صاحب کی پالیسیاں ان کی قوم کے حق میں نہ جا سکیں۔ میں اس بات سے بھی اتفاق نہیں کرتا کہ جناح صاحب کو قدرت کی جانب سے مزید مہلت ملتی تو وہ پاکستان کو اپنے تصورات سے ہم آہنگ ریاست بنانے میں کامیاب ہو جاتے۔ پاکستان کی آزادی کے وقت بنگالی اپنے لیے ایک آزاد ریاست چاہتے تھے لیکن جناح صاحب نے یہ منظور نہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ صرف ایک ریاست آزاد ہوگی جس کی زبان اردو ہوگی جو کہ بنگالیوں کے ساتھ ناانصافی تھی۔ جبکہ جناح صاحب بذات خود اردو بولنے اور لکھنے پر قادر نہ تھے۔ ان سب باتوں کی روشنی میں، میں خود کو تقسیم ہند کا حامی نہیں گردان سکتا۔ اب تو اس موضوع پر کچھ کہنا بھی لاحاصل ہے البتہ! اس کے اثرات اب بھی ہمارے سامنے موجود ہیں اور مسلم لیگ ابھی بھی ان سے نبرد آزما ہے۔

☆ تقسیم ہند سے قبل آپ نے برصغیر کے باشندوں میں جس غلامانہ ذہنیت کا ذکر فرمایا ہے اس کی وجوہات تو اُن کی کم علمی اور پس ماندگی تھی۔ آج کے برصغیر میں انگریزی زبان اور انگریزی کلچر کا چلن کس رویہ کی نشان دہی کر رہا ہے؟

☆☆ غلامانہ ذہنیت کا جہاں تک سوال ہے تو یہ اس وقت تمام ہندوستانیوں میں بڑی حد تک پھیلی ہوئی تھی اور اب بھی کافی حد تک باقی ہے لیکن یہ جو انگریزی سیکھنے پر زور ہے اس کی بھی معقول وجوہات ہیں۔ انگریزی ایک گلوبل زبان کا روپ دھار چکی ہے اس میں مہارت حاصل

کر کے آپ ساری دنیا میں نہ صرف ملازمتوں کے مواقع حاصل کر سکتے ہیں اور ترقی کے دوسرے ذرائع بھی آپ کی دسترس میں آجاتے ہیں لہٰذا انگریزی سیکھنے یا نہ سیکھنے سے غلامانہ ذہنیت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

☆ آپ ہمیں ان وجوہات کی بابت تفصیل سے بتلائیں جن کے سبب آپ نے 1946 میں فوج کی ملازمت اور کیمونسٹ تحریک سے متاثر ہو کر اردو کی تعلیم اور تدریس کا انتخاب کیا؟ جبکہ قیامِ برصغیر کے دوران ہندی، بنگالی، مدراسی، ملیالم، کنٹر، اڑی وغیرہ سے بھی آپ کا ربط تھا؟

☆☆ جب میں انڈین آرمی میں تھا تو میرے تمام سپاہی ساؤتھ کے لوگ تھے جو اس زمانے کی اصطلاح میں مدراسی کہلاتے تھے۔ تامل ناڈو کرناٹک اور کیرالا کے لوگوں میں خاص کر مجھے کیرالا کے لوگ زیادہ اچھے لگے فوج کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اگر مجھے ملیالم سیکھنے کا موقع ملتا تو اچھا ہوتا لیکن وہاں ایسا کوئی انتظام نہ تھا اور اس وقت تک مجھے اچھی خاصی اردو آ چکی تھی لہٰذا میں نے اردو کے لیے ہی درخواست دے دی۔ اس طرح میں اردو کے میدان میں چلا آیا۔ میں سمجھتا تھا کہ اردو سیکھنے کے بعد ہندوستان کی باقی زبانیں سیکھنا میرے لیے آسان ہو جائے گا مگر میری یہ سوچ غلط ثابت ہوئی۔ اردو میں میری دلچسپی ہونے کے باوجود میں اردو والوں سے واقف نہ تھا لیکن میرے کچھ ہندوستانی دوست انگلستان میں P.H.D کر رہے تھے جس کی وجہ سے اردو سے میرا تعلق پختہ سے پختہ تر ہوا۔ میں سمجھتا ہوں اگر میں یہاں کے لوگوں کو اردو کے بارے میں کچھ بتا سکوں تو یہ اردو کے ساتھ کیمونزم کی بھی خدمت ہوگی۔ مختلف قوموں اور برادریوں کے درمیان دوستی کے جذبات پھیلانا بھی کیمونزم کی خدمت ہے۔

☆ اردو کے ساتھ ربط نے آپ کے نجی رشتوں کو کیونکر متاثر کیا اور آپ نے اس کا ازالہ کس طرح کیا؟

☆☆ اردو کے ساتھ رابطے نے میری نجی زندگی کو کسی بھی طرح سے متاثر نہیں کیا۔ میرے کئی دوست اردو لکھنے پڑھنے والے ہیں اور میں ان سب کو بہت پسند کرتا ہوں۔ خاص طور پر محمود ہاشمی مجھے کافی پسند ہیں۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ ہاشمی صاحب آجکل کافی بیمار ہیں۔ میں ان کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہوں۔

☆ ہماری خواہش ہے کہ آپ ہمیں اپنے ان کارناموں سے باخبر فرمائیں جو آپ نے گذشتہ ساٹھ سالوں میں اردو زبان اور اردو ادب کے حوالے سے سرانجام دیے ہیں؟

☆☆ میں آج کل ایک "Web Site" بنا رہا ہوں جو کہ کافی تفصیل میں ہے۔ میں آپ کو اس ویب سائٹ کا ایڈریس دے رہا ہوں جہاں سے آپ اور آپ کے قارئین کو میرے کام کی مکمل تفصیل مل جائے گی۔

www.ralphrussell.com.uk

☆ انڈوپاک کے کن اہلِ قلم سے آپ کی ملاقاتیں رہیں، کس سے آپ کو مل کر خوشی ہوئی، کس کی تخلیقات سے آپ متاثر ہوئے؟

☆☆ میں جب جب ممبئی جاتا تھا تو سیدھا کرشن چندر کے گھر جاتا تھا۔ ان کی زیادہ تر تخلیقات میرے خیال میں فضول ہیں مگر وہ انسان بہت عمدہ تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ انکی تخلیقات کا تین چوتھائی حصہ ضائع بھی کر دیں تو اردو ادب کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ جو حصہ بچے گا اس میں ان کی بہت عمدہ تخلیقات یقیناً شامل ہونگی۔ ان کی ایک کہانی "کالو بھنگی" کا میں نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو مجھے بہت پسند ہے۔ اس کے علاوہ جن لوگوں سے تعلق رہا ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام لینا ضروری ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر، گورنر، نائب صدر اور صدر کے ادوار میں ان کا کافی قرب مجھے حاصل رہا۔ میں ان کی ہمیشہ عزت کرتا تھا اور کرتا رہوں گا۔ اس کے علاوہ محمد مجیب، عابد حسین اور پاکستان میں عبادت بریلوی سے بہت اچھے تعلقات تھے اور میں جب بھی پاکستان جاتا تو ان کے گھر ہی ٹھہرتا۔

☆ آپ کے خیال میں اردو ادب کی کونسی اصناف اور اہلِ قلم عالمی ادب میں جگہ پانے کے مستحق ہیں؟

☆☆ شاعری میں ذاتی طور پر مجھے غزل پسند ہے لیکن انگریزی داں لوگوں کے لیے غزل کی کافی تشریح درکار ہے۔ مختصر افسانے کا جہاں تک تعلق ہے اس میں بہت عمدہ کام ہوا ہے۔ پریم چند سے لیکر عصمت، منٹو، بیدی اور کرشن کافی اہم ہیں۔ مگر ترجمے کا جہاں تک سوال ہے کسی انگریز کو کہیں کہ یہ اردو کا ترجمہ ہے تو وہ سب سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ یہ اردو کیا چیز ہے جس کے باعث ان لوگوں کو ترجمے پر مائل کرنا کافی دشوار ہے۔ اردو ناولوں میں بھی اگرچہ کچھ خامیاں ہیں لیکن پھر بھی قابلِ ستائش کام ہوا ہے۔ "بازارِ حسن" اور "میدانِ عمل" عمدہ ناولوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔

☆ اردو ادب پر لکھی جانے والی تنقید کے معیار کی بابت بے لاگ رائے سے نوازیے؟

☆☆ میں نے سنا ہے مگر چند پڑھا نہیں کہ آج کل کئی تنقید نگار پڑھنے کے لائق ہیں۔ جس زمانے میں میرا ہندوستان جانا ہوتا تھا اس زمانے کے تنقید نگاروں کے بارے میں میری رائے زیادہ اچھی نہیں تھی۔ مثال کے طور پر احتشام حسین کو لے لیجئے میں سمجھتا تھا کہ ان کی تنقید بالکل بیکار ہے۔ اسی طرح سرور صاحب کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ انہوں نے انگریزی ادب اور تنقید کا کافی مطالعہ کیا

ہے۔ غالب کا مسئلہ لیجئے غالب پر میں نے بہت کام کیا ہے۔ غالب کے بارے میں لوگوں نے جو کچھ لکھا مجھے وہ سب کچھ پڑھنے کی خواہش نہیں تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میں خود ان کا کلام پڑھوں اور اپنی رائے قائم کروں۔ اس کے بعد مجھے دوسروں کی رائے میں دلچسپی نہیں رہے گی۔

☆ تیز رفتاری سے بدلتی دنیا اور اردو شاعری میں قافیہ پیمائی یعنی غزل کی بابت آپ کیا رائے رکھتے ہیں اور اس کے مستقبل کی نسبت کیا کہنا چاہتے ہیں؟

☆☆ تمیں کی دہائی سے بہت سے لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ غزل کا کوئی مستقبل نہیں ہے مگر میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں اردو غزل ایک توانا صنف ہے اور اس کو باقی رہنا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ غزل کو سمجھنے کے لیے مغرب کے لوگوں کو کافی تشریح کی ضرورت ہے۔ میر تقی میر، غالب، داغ، حسرت موہانی سے لیکر آج تک کئی شعراء اچھی غزل کہہ رہے ہیں۔ اقبال کے بارے میں، میں نے ایک مضمون لکھا ہے جس کے مطالعے کے بعد اقبال کی نسبت آپ میری رائے سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ اقبال کے خودی کے نظریے سے تو میں متفق ہوں لیکن مسلمان تاریخ کے بارے میں ان کا نظریہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ اٹھارویں صدی میں جی رہے ہیں۔ اس کی مثال میں اسطرح دینا چاہوں گا کہ ان کا زیادہ کلام فارسی میں ہے۔ اقبال سمجھتے تھے کہ ہندوستان سے لیکر ایران تک سب لوگ فارسی کو اہمیت دیں گے۔ لیکن ایرانی کسی ہندوستانی شاعر کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ جاوید نامہ پڑھیے تو پتہ چلتا ہے کہ اقبال طاقت سے کافی مرعوب ہوتے تھے۔ یعنی اگر نادر شاہ جس نے ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کا قتل کیا ان کے نزدیک ایک اچھا انسان اور اچھا مسلمان تھا۔

☆ آپ کے خیال میں اردو زبان، اردو ادب ارتقا کے کس مرحلے میں ہے اور اس کے مستقبل کی بابت کس قسم کا حسن ظن قائم کیا جا سکتا ہے؟

☆☆ اس سلسلے میں میرے لیے کوئی رائے دینا ذرا مشکل ہے۔ انڈیا میں اردو زوال پذیر ہے'' It will not survive in any meaningful way.'' پاکستان کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ 50 کے بعد سے میرا رابطہ اس قدر نہیں رہا جس قدر اس سے قبل ہوا کرتا تھا۔

☆ اردو ادب کی چند شاہکار تخلیقات یا ادیبوں پر مغربی ادب کے چربے کا الزام بھی لگتا رہا ہے۔ آپکی رائے اس حوالے سے یقیناً اہمیت کی حامل ہوگی؟

☆☆ ناول نگار خاصی تعداد میں ہیں جن میں عورتیں نمایاں ہیں ان کے قارئین میں امریکی اور انگریز لوگ بھی شامل ہیں۔ اس حد تک آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے ناول انگریزی اور امریکی طرز پر لکھتے ہیں۔ بنیادی طور پر میں اس میں کوئی برائی نہیں سمجھتا۔ یہاں کی ادبی روایتوں میں بہت سی چیزیں اچھی بھی ہیں جن کو اپنانے میں کوئی قباحت نہیں لیکن جو لوگ صرف نقل کرتے ہیں یا مغرب کی اندھا دھند تقلید میں لگے رہتے ہیں انکی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ انیسویں صدی میں جب ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ نے انگریزی نقالی پر ناول لکھنے شروع کیے تو یہ اچھی بات تھی کیونکہ اردو ادب میں یہ صنف پہلے موجود نہ تھی لیکن نقل میں اپنا رنگ شامل نہ کیا جائے تو اس کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں ''امراؤ جان ادا'' اس وقت کے بہترین ناولوں میں سے ایک ہے۔

☆ آپ نہیں سمجھتے کہ مغرب اخلاقی زوال کی انتہاؤں پر پہنچ چکا ہے اس کا انجام اور اس کے بطن سے کس طرح کا نظام جنم لینے کو ہے؟

☆☆ میرے خیال میں یہ رائے درست نہیں ہے کہ مغرب اخلاقی زوال کے دہانے پر پہنچ چکا ہے۔ ہر چند کچھ قدریں ضرور گر رہی ہیں مگر پرانی اقدار کافی تعداد میں اب بھی باقی ہیں۔ یہ بات شاید یو ایس اے پر صادق آتی ہو کہ جب سے انہوں نے دنیا پر حکومت شروع کی ہے وہ کسی اور کے بارے میں جاننا نہیں چاہتے۔ انہیں صرف اپنے مفادات سے پیار ہے۔ لیکن وہاں بھی اچھے لوگ ہیں جو اپنی روایات سے کافی حد تک جڑے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ''مارٹن لوتھر کنگ'' اور وہ لوگ احترام کے لائق ہے جنہوں نے ویت نام کی جنگ کے خلاف احتجاج کیا۔

☆ جس طرح 1933 میں کوسٹرن نے مستقبل کی جنگوں کی نقشہ کشی کی تھی کیا آج آپ یا کوئی دانا و بینا شخص ہونا کی، کی اس جنگ کے انجام کے بابت کچھ بتلا سکتا ہے جو بلا سبب، بلا جواز اور بلا ضرورت، تیسری دنیا بالخصوص دنیائے اسلام پر مسلط کر دی گئی ہے؟

☆☆ یہاں دو باتیں اہم ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ کوسٹرن نے اس وقت جو پیش گوئی تھی وہ دوسری جنگ عظیم کی صورت میں سچ ثابت ہوئی۔ جرمنوں کی طاقت بھی ختم ہوئی۔ چائنہ کا انقلاب بھی اس کی مثال ہے۔ کیمونسٹوں کی آزادی اور انڈیا کا دنیا کے نقشے پر اہم حیثیت سے ابھرنا بھی کوسٹرن کی پیش گوئی کے عین مطابق ہی ہے۔ سر دست موجودہ عالمی صورتحال کے بارے میں کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ امریکہ کی تمام پالیسیوں میں اسرائیل کو اولیت حاصل ہے۔ اس کے بعد ان عرب ممالک کو اہمیت دی جاتی ہے جو امریکی مفادات کے نگہبان ہیں۔ ہر چند زبانی طور پر عرب ممالک اسرائیل کے خلاف ہیں مگر عملی طور پر وہ اسرائیل کے خلاف کچھ کر نہیں پاتے۔ ایسی صورت میں میں یا آپ کچھ کہہ سکتے ہیں نہ کر سکتے ہیں۔

☆

گنجِ گراں مایہ

محمود ہاشمی (برطانیہ)

رالف رسل کا نام میں نے آج سے قریباً نصف صدی پہلے سنا تھا، ایک محفل میں ایک صاحب نے باتوں باتوں میں کہا:

''یارا ایک انگریز ہے لیکن اردو بولتا ہے تو معلوم ہوتا ہے ماں کے پیٹ سے سیکھ کر آیا ہے''

محفل میں ایک کشمیری صاحب بیٹھے تھے، انھوں نے کہا:

''یارا کوئی کشمیری پنڈت ہو گا۔ گورا رنگ دیکھ کر تم نے اسے انگریز سمجھ لیا''

وہ صاحب بولے:

''بھئی! کشمیری پنڈت ہوتا تو نام ہی سے پتا چل جاتا۔ رالف رسل نام تھا۔ کیا یہ نام کسی کشمیری پنڈت کا ہو سکتا ہے؟''

لیکن ہمارے کشمیری دوست ہر بات جھٹلانے اور کسی کی ہرگز ہرگز نہ ماننے کے موڈ میں تھے۔ فوراً بولے:

اچھا تو تم رحمت رسول کی بات کر رہے ہو۔ بھئی! وہ واقعی کشمیری پنڈت نہیں۔ سوری آئی ایم ویری ویری سوری۔ اصل میں اس کا خاندان اور ڈاکٹر اقبال کا خاندان کشمیر کی وادی سے ایک ساتھ نکلے تھے۔ ڈاکٹر اقبال کے بڑے بزرگوں نے جونہی سرحد پار کی اور پنجاب کے شہر سیالکوٹ پہنچے تو وہیں ٹک گئے لیکن رحمت رسول کے باوا نے دلّی جا کر دم لیا۔

یہ رحمت رسول خالص دلی کی پیداوار ہے پر ہے بڑا مسخرہ۔ بالکل انگریز لگتا ہے، اور یار لوگ دوسروں کو بیوقوف بنانے کے لیے اسے لیے لیے پھرتے ہیں۔ انگریز کہہ کر تعارف کراتے ہیں اور اس کا نام رالف رسل بتاتے ہیں''۔

ان صاحب نے، جنھوں نے ذکر شروع کیا تھا، کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولا۔ لیکن محفل پر ہنسی کا ایک ایسا دورہ پڑ چکا تھا کہ اس نقار خانے میں ان کی آواز طوطی کی آواز بن کر رہ گئی.........اور بات آئی گئی ہو گئی۔

کچھ دن بعد پھر اسی محفل میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہ صاحب جنھوں نے رالف رسل کو رحمت رسول بنا کر اور اس کا شجرۂ نسب کشمیر کی وادی سے دریافت کر کے دلّی سے جوڑا تھا، ذرا سنجیدگی کے موڈ میں تھے اور باتیں رالف رسل ہی کی ہو رہی تھیں۔ وہ کہہ رہے تھے:

''یارا جب میں یہ سنتا ہوں کہ ایک انگریز رالف رسل اردو بولتا ہے اور صحیح بولتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔ لیکن جب لوگ اس کی اس طرح تعریف کرتے ہیں جیسے کوئی معجزہ ظہور میں آ گیا ہو، تو جی چاہتا ہے اپنا سر پیٹ لوں یا کہنے والے کا سر پھوڑ دوں۔ میں بھی رالف رسل کی عظمت کا معترف ہوں لیکن میں اس سے محض اس لیے متاثر نہیں ہوتا کہ وہ اردو صحیح بولتا ہے۔ آخر ہم میں سے بہت سے اس کی مادری زبان انگریزی بولتے ہیں اور اکثر صحیح بولتے ہیں۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی ....ہاں، میں اس انگریز کا معترف ہوں تو اس لیے کہ اس نے اس اردو کو اپنایا ہے جسے اپنے گھر میں بھی عزت اور احترام نہیں ملتا جو اس کا حق ہے۔ ہمارے لئے اردو سے زیادہ انگریزی ''محترم'' ہے۔ ہم انگریزی زبان میں قابلیت بڑھانے کو ترقی کی معراج سمجھتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو، جو اردو کے متوالے ہیں، کمتر قسم کی مخلوق سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ اردو کروڑوں عوام کی زبان ضرور ہے لیکن ہمارے خواص اس سے بدکتے ہیں۔ وہ لوگ جو اردو میں ادب تخلیق کرتے ہیں اور شعر و شاعری کو اپنا شعار بناتے ہیں، انھیں بھی ہمارے خواص کم ہی برداشت کرتے ہیں۔ کچھ اپنی وسیع القلبی کا مظاہرہ کرنے کے لیے اور بعض اوقات محض تفریح طبع اور دل بہلاوے کی خاطر......''

میرا دوست کہتا ہے کہ رالف رسل کے علاوہ اور بھی بہت سے انگریزوں نے اردو کو قابل توجہ سمجھا۔ بلکہ بعض نے تو اردو میں شاعری تک کی اور حقہ پی پی کر شعر کہے۔ لیکن یہ عام طور پر اُس زمانے کی باتیں ہیں جب انگریز اور اُس کی انگریزی نے ابھی ہمیں اپنے دام میں گرفتار نہیں کیا تھا۔ ہمارا اپنا تشخص برقرار تھا اور ہمیں اس پر ناز بھی تھا۔ انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں تازہ وارد ہوئی تھی اور ایک نئے ملک کو لوگوں کو سمجھنے اور ان میں مقبول ہونے کے لیے انگریز اس طرح کا ہر اقدام کر رہا تھا جو اس کو اپنے مطلب معلوم ہوتا تھا۔ ملک کا مکمل طور پر حاکم بن جانے کے بعد محبتوں کا یہ زمانہ بہت حد تک ختم ہو گیا۔ اب ہماری باری تھی اور ہم پر لازم ہونے لگا تھا کہ انگریزی کو اپنائیں۔

تاہم اب بھی حکمران طبقہ کے کچھ لوگ اردو میں دلچسپی لینے پر مجبور تھے۔

ان میں عام طور پر وہ پادری تھے جو ''نیٹوز'' میں مذہب کا پرچار کرنے کے لیے اردو سیکھتے تھے۔ انھیں زبان کے لطیف پہلوؤں سے کوئی غرض نہ تھی۔ اور ایک ''کام چلاؤ'' قسم کی اردو سے مطمئن تھے۔ پادریوں کے علاوہ جو ایک اور قابل ذکر طبقہ اردو سیکھتا تھا اور اسے ''ہندوستانی'' کہتا تھا، وہ برطانوی افسران اور ان کی میم صاحبائیں تھیں جو اپنے نوکروں، خانساموں اور مالیوں وغیرہ پر حکم چلانے کے لیے یہ ''ڈرد ہر'' سول لیتی تھیں۔ ان کا مبلغ علم عام طور اس طرح کے جملوں تک محدود ہوتا تھا کہ...... ''کتنا بجا ہے'' اور ''آل دی سب چیز ٹھیک ہے......'' زبان کے صحیح تلفظ، لب و لہجہ اور اس کے دوسرے لوازمات کی طرف توجہ دینے کی نہ ان میں سے کسی کی ضرورت تھی اور نہ اس

کے لئے محنت کے لئے تیار تھے۔ بہر حال کچھ انگریز ایسے بھی تھے اور اب بھی ہیں جنھوں نے اردو کے ساتھ اپنا تعلق قائم کیا تو اسے ایک اہم زبان سمجھ کر، اور نہایت خلوص کے ساتھ۔ انھوں نے رالف رسل کی طرح اردو کے قواعد و ضوابط بھی سیکھے۔ اس کا مزاج بھی اپنایا اور اس سے تہذیبی رشتے بھی جوڑے۔ لیکن ان کی تعداد کم بہت کم تھی اور انھیں ہاتھ..... صرف ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔

اب البتہ ان کی تعداد بڑھ رہی ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ اس کی ایک خاصی بڑی وجہ رالف رسل ہیں۔ انگریزوں کی اردو دان برادری، جو رالف رسل کے بعد پیدا ہوئی ہے اور ہو رہی ہے وہ کسی نہ کسی طرح رسل ہی کا پرتو ہے۔ اس ایک سے چراغ کئی جلے ہیں اور اس سلسلہ میں زندہ و تابندہ رالف رسل اور اس کی ''گل فشانئ گفتار'' کا بہت بڑا دخل ہے

۔

رالف رسل صاحب سے میری پہلی ملاقات ان دنوں ہوئی جب میں برطانیہ میں نو وارد تھا اور یہاں کی دوسری ''قابلِ دید'' چیزوں کے ساتھ ساتھ ان سے ملنا اور انھیں دیکھنا ضروری کاموں میں سے ایک تھا۔ چنانچہ میں نے یہ ضروری کام کیا اور اس رالف رسل کو دیکھا جو برطانیہ کی اس انگریز دنیا میں اردو کا چراغ جلائے بیٹھا ہے۔ اس کے بعد چلتے چلاتے کی دو چار اور ملاقاتیں بھی ہوئیں جن میں سے ایک مجھے خاص طور پر یاد ہے۔

ہم دونوں کو اوپر کی ایک منزل سے نیچے اترنا تھا اور ہم جلدی میں تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بٹن دبانے کے بعد کچھ دیر لفٹ کا انتظار کرنا پڑتا ہے لیکن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ جونہی ہم نے بٹن دبایا، لفٹ سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس پر رالف رسل صاحب نے ایک نعرہ لگایا

''زندہ باد''

میں نے چونک کر انھیں دیکھا اور دل میں سوچا ''یہ شخص صرف اردو بولتا ہی نہیں ،اردو کے ساتھ رہنا بھی جانتا ہے''۔

لیکن ان کے اصل جوہر مجھ پر پچھلے چار پانچ سال میں کھلے، جب مجھے انھیں ذرا زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ صرف اردو بولتے ہی نہیں اور خود اردو پڑھا کر لندن یونیورسٹی کے سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز میں صرف اردو پڑھانے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ انہوں نے یہ بیڑا بھی اٹھا رکھا ہے کہ سارے برطانیہ کو اردو دان بنا کر دم لیں گے۔ اس سلسلہ میں لندن سے لے کر گلاسگو تک کا قریب قریب ہر شہر ان کی زد میں ہے۔ اس شہر میں ایشیائی بچوں کو اردو پڑھانے جا رہے ہیں تو اس شہر میں انگریز بالغوں کے لئے اردو پڑھانے کا کورس جاری کر رکھا ہے آج ایک شہر میں وہاں کے کسی سکول کے ہیڈ ٹیچر کو اس بات پر آمادہ کر رہے ہیں کہ وہ اپنے سکول میں اردو کا باقاعدہ نصاب میں شامل کرلے تو کل کسی اور شہر میں وہاں کے ایجوکیشن آفیسر، انسپکٹر یا ایڈوائزر کو برطانوی سکولوں میں اردو پڑھانے کی اہمیت کا قائل کر رہے ہیں...... اور یہ رالف رسل صاحب کی بھاگ دوڑ ہی کا نتیجہ تھا کہ لندن میں اردو کانفرنس ہوئی اور پھر دوسرے سال بڑے دھڑلے سے ایک اور ہوئی۔ دونوں کانفرنسوں میں ملک کے اربابِ اقتدار اور محکمۂ تعلیم کے با اثر نمائندوں کو خاص طور پر شریک کیا گیا تاکہ برطانوی ذہنوں پر اردو کے بارے میں کم علمی کے جو غلاف چڑھے ہیں وہ اتر جائیں۔ اور وہ بھی اپنے ہاں کے سکولوں میں اردو کو ایک باقاعدہ مضمون کی حیثیت دینے کے بارے میں سوچیں اور عملی قدم اٹھائیں۔

ایک صاحب سے، جو سکولوں میں پنجابی زبان کو نصاب میں شامل کرنے کے بارے میں بڑے مستعد ہیں، ایک کانفرنس میں ملاقات ہوئی تو کہنے لگے:

''برطانیہ کے ایشیائیوں میں سب سے زیادہ پنجابی بولنے والے ہیں۔ اس لحاظ سے یہاں کے سکولوں میں پنجابی کو اردو سے پہلے اس کا جائز مقام ملنا چاہیے، لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تم لوگ بڑے خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایک رالف رسل مل گیا ہے ورنہ تم اردو والے تو ''انشاءاللہ، ماشاءاللہ'' والے ہو۔ ہر کام اللہ کے سپرد کر کے خود کچھ نہیں کرتے۔ اگر یہ رالف رسل نہ ہوتا تو تم بس مشاعرے ہی کرتے رہتے اور ہم تمہارے بچوں کو بھی گورمکھی رسم الخط میں پنجابی پڑھا دیتے''

مانچسٹر میں ایک انجمن ہے جس کا نام ہے ''نیشنل ورکنگ پارٹی اون میٹیریلز فار اردو ٹیچنگ'' اس کے معتمد وہاں کے کرس لیوکی صاحب ہیں لیکن روحِ رواں ہمارے رالف رسل ہی ہیں۔ یہ انجمن اس لئے قائم کی گئی ہے کہ برطانوی سکولوں میں اردو پڑھنے والے طلباء کے لئے مناسب اور موزوں کتابوں کی جو کمی محسوس ہوتی ہے اس پر سوچ بچار کرے اور اس کی کو دور کرنے کے لئے عملی اقدامات کرے۔ مانچسٹر میں اردو کے استادوں کے گروپ نے اپنے ہاں کے سکولوں کے لئے کچھ ابتدائی کتابیں تیار کی ہیں۔ اور اس سلسلہ میں خاصا مفید کام ہو رہا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا، انجمن کی ایک میٹنگ میں طے پایا کہ ایک ''اردو نیوز لیٹر'' چھپنا چاہیے تاکہ اردو پڑھنے پڑھانے کے سلسلہ میں جو کام ہو رہا ہے اس کا دوسروں کو بھی پتا چلتا رہے۔ اب مسئلہ درمیان میں یہ آن پڑا کہ یہ ''نیوز لیٹر'' کون تیار کرے گا اور اسے متعلقہ افراد اور انجمنوں تک پہنچانے کی ذمہ داری کس کی ہو؟.......... ہم میں سے جو سگریٹ پیتے تھے انہوں نے سگریٹ اور پائپ والوں نے اپنے پائپ سلگا لئے اور ہر شخص ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ آخر کار وہ شخص جو نہ سگریٹ پیتا ہے نہ پائپ، اور جو اس طرح کے کاموں کے لئے کسی گہری سوچ اور ''اندیشہ ہائے دور دراز'' کا قائل

نہیں اور جس کا نام رالف رسل ہے آڑے آیا، اور بولا:

''یہ کام میں کروں گا''۔

ہم سب نے عافیت کی سانس لی۔

اس انجمن کو بھی (جس کی افادیت اس کے نام ہی سے ظاہر ہے)متحرک رکھنے میں رالف رسل کا بڑا حصہ ہے۔ورنہ مجھ ایسے شاید محض ''شُغندو گفتندو برخاستند'' پر ہی مطمئن رہتے۔ رالف رسل جو خود ''جاوداں، پیہم رواں اور ہردم جواں'' رہتے ہیں ، دوسروں کو محض ''تصورِ جاناں کیے ہوئے'' بیٹھے نہیں دیکھ سکتے۔ ایک مرتبہ میری جو شامت آئی تو میں نے ان سے کہہ دیا کہ:

''میں اُردو کا ایک قاعدہ لکھ رہا ہوں۔''

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قاعدہ واقعی لکھا گیا۔ رالف رسل نے اس میں کچھ اس طرح دلچسپی لی کہ مجھے خیر یت اسی میں نظر آئی کہ یہ قاعدہ مکمل ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔ ورنہ رالف رسل صاحب سے جو تھوڑی بہت صاحب سلامت ہے وہ جاتی رہے گی۔

شروع شروع میں تو میں ان سے کہتا رہا کہ لکھ رہا ہوں، اب یہ کر رہا ہوں، اب وہ کر رہا ہوں۔ پھر ایک دن کہنے کو کچھ اور نہ سوجھا تو کہا:

''بس اب مکمل ہی سمجھئے، کسی دن آپ کو فرصت ہو تو دکھاؤں گا تاکہ آپ کی رائے معلوم ہو سکے۔''

چند ہی دن بعد ان کا ٹیلی فون آیا کہ:

''میرے پاس فلاں دن خالی ہے آپ اپنا قاعدہ لے کر یہاں آجایئے یا میں آپ کے ہاں آتا ہوں۔''

اور پھر مقررہ دن مقررہ وقت پر رالف رسل صاحب کاغذ، پنسل اور کاربن پیپر سے لیس لندن سے ستر میل کا سفر کر کے غریب خانہ پر پہنچ گئے۔ میں نے پوچھا:

''کاغذ اور پنسل کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ کاربن پیپر کس لیے؟''

بولے: ''یہ اس لیے کہ اگر کسی بات پر ہم میں اختلاف رائے ہو تو بحث وتمحیص کے بعد ہم جس نتیجہ پر پہنچیں اسے لکھ لیں اور اس کی ایک کاربن کاپی بنالیں تاکہ ہم دونوں کے پاس تحریر کی نقل رہے۔ اس بعد میں چیک کرنے میں آسانی ہو گی۔''

پھر انہوں نے میرے لکھنے کی میز کا جائزہ لیا۔ جس کے ساتھ ایک کرسی تھی۔ کہنے لگے: ''اس کے ساتھ ایک اور کرسی لگا لیجئے۔''

میں نے کہا: ''یہ کس لیے؟''

''یہ اس لیے کہ ہم دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر مسودہ پڑھیں گے، میز پر یہ کام بہتر ہو گا۔''

چنانچہ یہ کام ہوا، بہتر ہوا اور بخیر وخوبی تمام ہوا۔ جس جذبہ اور لگن سے انہوں نے کام کیا، اور ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ کی جس طرح چھان پھٹک کی وہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ اس دوران ایک مرتبہ انہوں نے حروف تہجی کی بناوٹ اور لفظوں میں ان کی بدلی ہوئی صورتوں پر کچھ اس طرح باتیں کیں کہ میں نے دفعتاً سوچا ''اس شخص کی زبان کے بنیادی قواعد اور ان کی باریکیوں پر کتنی گہری نظر ہے۔ نجانے اپنی اردو پڑھائی کا آغاز اس نے کس قاعدے سے کیا ہو گا۔

(ظاہر ہے وہ میرا قاعدہ تو ہو نہیں سکتا!)''

میں رالف رسل سے پوچھا ''آپ نے اردو کا کونسا قاعدہ پڑھا ہے؟''

وہ مسکرائے اور بولے: ''میں نے کوئی قاعدہ واعدہ نہیں پڑھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، آپ کا یہ قاعدہ بے حد ضروری ہے۔''

''یہ قاعدہ بے حد ضروری ہے اور اردو نصاب کے لیے وہ کتاب لکھنا وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے''

چنانچہ رالف رسل اس مقصد کے لیے کاغذ، پنسل اور کاربن پیپر سنبھالے ستر میل سے بھی زیادہ لمبے لمبے سفر کرتے ہیں، خود لکھتے ہیں، دوسروں سے لکھواتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ برطانیہ میں اردو کا یہ ''گنج گراں مایہ'' یونیورسٹی میں اپنے تدریسی فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے لئے کہیں زیادہ مصروفیات پیدا کر لے گا اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک کہ برطانیہ میں بسنے والے تمام مرد، عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے نہ لگیں۔

میری دعا ہے خدا انہیں کم از کم اتنی عمر ضرور دے کہ وہ یہ کام اپنی زندگی میں مکمل کر سکیں!

☆

عبدالعزیز خالد

کی

تنقیدی کتاب

۔ تجدد و مزید ۔

قرآن اور حدیث کے استعمال کے حوالے سے اردو اور فارسی شاعری کا محاکمہ۔

صفحات: ۲۸۰ قیمت: ۲۰۰ روپے

ناشر: سرمد اکیڈمی' ۲۶۴ محمد نگر مرزا روڈ' اٹک کینٹ

جوئندہ یابندہ

ڈاکٹر ارجمند آرا (دہلی)

۸/جون ۲۰۰۴ کی صبح کوئی ساڑھے نو بجے لندن کے جنوب مغربی علاقے تھیکر اسٹریٹ میں ڈرائیور نے ٹیکسی روکی اور میں نے ۳۳ نمبر کی تلاش میں مکانوں پر نظر ڈالنی شروع ہی کی تھی کہ رالف رسل سڑک پار کر کے خود ہی ٹیکسی تک چلے آئے۔ روئی جیسے سفید گھنگرالے بالوں کے ساتھ سرخ وسپید مسکراتا ہوا چہرہ، آنکھوں پر چشمہ، پیروں میں سینڈل اور بغیر استری کی پینٹ؛ لیکن شرٹ کے نام پر جسم پر کچھ نہیں۔ ایک لمحے کے لیے مجھے جھٹکا سا لگا کہ کسی خاتون مہمان سے ملنے کا یہ کوئی معقول طریقہ نہیں ہے۔ کلچر کے تصور سے متعلق انگریزوں کے جو قصے سنے تھے، رالف کا رویہ ان سے تو قطعی مطابقت نہیں رکھتا تھا لیکن اگلے ہی لمحے خیال آیا کہ رالف سے کسی قسم کے تکلف اور چونچلوں کی توقع کرنا بڑی انگریزی بات ہوگی۔ ان کے بارے میں کافی کچھ تو میں ان کی خود نوشت Findings Keepings (جوئندہ یابندہ) کا ترجمہ کرتے ہوئے ہی جان گئی تھی۔ ہم نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور رالف نے میری 'سفر پری' کی (بعد میں ہر روز صبح اٹھ کر وہ میری 'خواب پری' کرتے تھے، یعنی پوچھتے تھے کہ کیا تمھیں نیند اچھی طرح سے آئی؟)۔ اس دوران ڈرائیور نے میرا سوٹ کیس مکان کے دروازے پر رکھ دیا، اور اس کو کرایہ ادا کر کے ہم گھر میں داخل ہو گئے۔ اس مکان میں مجھے اگلے ایک ماہ تک قیام کرنا تھا۔ میں رالف کی دعوت پر گرمیوں کی چھٹیوں میں لندن آئی تھی تا کہ ان کی خود نوشت کے ترجمے کو آخری شکل دی جا سکے جو میں نے دہلی یونی ورسٹی کی گذشتہ برس کی سرما کی تعطیلات میں مکمل کیا تھا اور اس دوران خالی وقت میں گاہے بگاہے اس پر نظر ثانی کر کے ایک بار پروف ریڈنگ کا کام بھی پورا کر چکی تھی۔ رالف کی تجویز تھی کہ کتاب کو اشاعت کے لیے دینے سے پہلے ہم دونوں مل کر اسے پڑھیں اور اس کا مطالعہ کر ڈالیں تا کہ اردو کے قارئین کی ضروریات کے مطابق ضروری وضاحتیں شامل کتاب کی جا سکیں اور جہاں جہاں انگریزی متن کو سمجھنے میں یا اس کا صحیح اردو ترجمہ کرنے میں دشواری یا غلطی ہوئی ہو وہاں متن کو واضح اور درست کیا جا سکے۔

درمیانی سائز کے رالف کے فلیٹ کا صدر دروازہ انگریزی حرف P کی شکل والی بیٹھک کی دم کی طرف واقع ہے۔ دروازے سے داخل ہو کر آپ دو تین قدم کی مختصر راہداری قطع کر کے بیٹھک میں پہنچ جاتے ہیں جو مطالعے کا کمرہ بھی ہے۔ داخل ہوتے ہی داہنے ہاتھ پر ڈائننگ ٹیبل ہے جو مطالعے کی میز کا بھی کام دیتی ہے۔ یہ بیٹھک کی چوڑائی تک تمام جگہ گھیرے ہوئے ہے۔ اسی سرے پر باورچی خانے کا دروازہ ہے اور اس کے ساتھ لگا ہوا نیلے رنگ کا مخملی صوفہ جو کمرے کی لمبائی میں دیوار کے سہارے سجایا گیا ہے۔ صوفے کے سامنے میز کے دوسری جانب رالف کی جھولنے والی کرسی پڑی رہتی ہے اور اس کے قریب ہی لکڑی کے ایک میز نما چھوٹے سے اسٹینڈ پر ٹیلی فون رکھا رہتا ہے۔ P کے سر کی جانب بائیں ہاتھ کا سرا ایک گہرے کھانچے کی صورت میں ہے جو چوڑائی میں بیٹھک کے تقریباً ایک تہائی حصے کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس طرح بیٹھک مستطیل نہ ہو کر چھے گوشوں والی ہے۔ دیوار کے صوفے والے حصے کو چھوڑ کر پوری بیٹھک میں دیوار دوز شیلف چھت تک لگے ہوئے ہیں جن میں رالف کی کتابیں موضوعاتی ترتیب سے لگی ہوئی ہیں۔ مثلاً آپ دیکھیں گے کہ دوسری جنگ عظیم سے متعلق سیاسی اور تاریخی کتابیں ایک ہی جگہ ترتیب سے رکھی ہیں۔ یہیں ہٹلر، فاشزم، فرانس اور جنگ عظیم وغیرہ سے متعلق کتابیں، اسٹالن کے دور کے یو ایس ایس آر، کمیونزم، کمیونسٹ نظریات کے مختلف دبستانوں اور تاریخ کی اہم کتابیں، اور اسی دور کے مختلف نظریات اور مباحث کی کتابیں ترتیب سے لگی ہوئی ہیں۔ ایک جانب روسی ادب کے انگریزی تراجم ہیں۔ اس کے علاوہ اطالوی اور لاطینی زبان کی کتابیں بھی ہیں۔ برصغیر کی تہذیب وثقافت اور تاریخ پر، خصوصاً ہندستان اور پاکستان کے مسلمانوں پر بہت سی کتابیں رالف کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہیں۔ پھر انگریزی کے کلاسیکی ادب اور معاصر ادب کا شیلف ہے۔ انگریزی میں لکھنے والے ہندستانی پاکستانی تخلیق کاروں کی بہت سی کتابیں بھی سلیقے سے سجی ہوئی ہیں۔ انگریزی، اردو، ہندی وغیرہ کے بہت سے لغات، انسائیکلوپیڈیا اور تھیسارس؛ سیاحت سے متعلق کتابیں اور لاتعداد نقشے؛ موسیقی اور آرٹ پر کتابیں، لوک گیتوں اور مہمل تک بندیوں کی کتابیں — غرض کتابوں کی ایک متنوع دنیا اس بیٹھک میں آباد ہے۔ بیٹھک کی لمبائی میں آخری سرے پر ایک دروازہ ہے جو ایک چھوٹی سی راہداری میں کھلتا ہے۔ اس میں بالکل سامنے ایک چھوٹا سا کمرہ ہے، داہنے ہاتھ پر خوابگاہ اور دوسری جانب یعنی بائیں جانب غسل خانہ ہے۔

سامنے کے چھوٹے کمرے میں کمپیوٹر اور تین دیواروں پر کتابوں کے ویسے ہی شیلف ہیں جیسے بیٹھک میں ہیں، یعنی ان کی اونچائی بھی چھت تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے ایک شیلف میں اردو ادب کی کتابیں ہیں۔ خوابگاہ اور راہداری میں بھی یہی اہتمام ہے۔ البتہ خوابگاہ کے اور چھوٹے کمرے کے دو شیلفوں میں لوگوں سے خط وکتابت کی فائلیں اور باکس ترتیب سے لگے ہیں۔ خوابگاہ میں بیڈ کے نیچے بھی فائل سائز کے پلاسٹک کے چوڑے بکسوں میں فائلیں سجی ہوئی ہیں۔ رالف کے پاس آڈیو کیسٹس کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ اس ذخیرے میں وہ تمام مواد ریکارڈ ہے جس کی مدد سے وہ سواس (School

of Oriental and African Studies) میں اپنے طالب علموں کو اردو سننے، سمجھنے اور بولنے کی مشق کراتے تھے۔ زبان دانی کے مختلف سطح کے کورسوں کے لیے الگ الگ ٹیپ ہیں جن کا ایک باقاعدہ کیٹلاگ ہے۔ اس قدریسی مواد میں فیض احمد فیض، ظ انصاری اور عبادت بریلوی وغیرہ کے وہ انٹرویوز بھی شامل ہیں جو رالف نے سواس کی لینگویج لیب میں خود ریکارڈ کیے تھے۔ اس کے علاوہ غالب، میر، سودا وغیرہ کا کلام تحت اللفظ اور ترنم میں ریکارڈ کیا ہوا ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ مثنویاں بھی شامل ہیں؛ افسانوں اور ناولوں کے اقتباسات کے ریکارڈ ہیں؛ ہندوستان پاکستان کے دیہات، قصبوں، شہروں کے طرز معاشرت پر، فرقہ وارانہ فسادات، مذاہب و عقاید، موسیقی اور دیگر بہت سے موضوعات پر گفتگو اور انٹرویوز شامل ہیں۔ آڈیو کیسٹس کی یہ اہم لائبریری رالف کی زندگی بھر کی لگن، محنت اور ایک فرض شناس استاد کے غور و فکر کے ساتھ مسلسل کام کرنے کی عادت اور تعلیمی معیار کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوششوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

میں تقریباً ایک مہینہ رالف کے گھر میں مقیم رہی۔ میرا یہ قیام ایک خوشگوار اور یادگار تجربہ اس لیے ہے کہ اس عرصے میں مجھے رالف کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ رالف ۸۶ برس کے ہیں، صحت بہت عمدہ ہے اور ایک ہی نشست میں جوانوں سے زیادہ دیر تک کام کر سکتے ہیں۔ گھر کی صفائی ستھرائی، برتن دھونا، کپڑے مشین میں لوڈ کرنا، سوکھنے کے بعد انھیں تہہ کر کے رکھنا، بازار سے ہر روز ضرورت کی اشیا اور کھانا خرید کر لانا وغیرہ سب کچھ وقت پر اور پھرتی کے ساتھ کرتے ہیں۔ رالف نے بتایا کہ جب سے ان کے پیس میکر (pacemaker) لگا ہے وہ بغیر تھکے ہوئے بہت دیر تک کام کر سکتے ہیں۔ ساتھ میں ہمیشہ کسی نہ کسی گیت کی دھن ان کے لبوں پر رہتی ہے یا پھر کوئی لطیفہ، کوئی برجستہ جملہ اور پھر قہقہہ۔ رالف بہت زندہ دل شخص ہیں اور صاف دل بھی۔ وہ لوگوں کے بارے میں اپنی بے لاگ رائے رکھتے ہیں اور مناسب موقعوں پر اس کا اظہار بھی کرتے ہیں — نہ خوبیوں کے بیان میں کنجوس ہیں اور نہ خرابیوں کے ذکر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت کرتے ہیں۔ ان کے دوست اور ان کے بچے، سب انھیں رالف کہہ کر ہی مخاطب کرتے ہیں، اور مجھ سے بھی انھوں نے یہی توقع کی کہ ان کے پہلے نام سے انھیں پکارا کروں۔ دوستوں سے بے حد محبت کرنے والے دوست ہیں اور دوستی میں کسی قسم کے تکلف اور رازداری کو مناسب نہیں سمجھتے۔ ان کے دوست جن میں ہر عمر کے مرد اور عورتیں شامل ہیں، ان سے ہر قسم کے نجی مسائل پر گفتگو کر لیتے ہیں۔ اپنے تینوں بچوں، ای آن، سیرہ اور ایلن کے بھی وہ ایسے ہی بے تکلف دوست ہیں۔

رالف کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ جس شخص سے بھی ملتے ہیں اسے شخصی طور پر سمجھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور اس کے پس منظر کو بھی۔ انھوں نے مجھ سے بھی میرے حالات معلوم کیے، میرے وطن سکندرآباد کے بارے میں پوچھا، دہلی سے کتنی دور ہے، کس سمت میں، کتنی آبادی ہے، مسلمان اور ہندو آبادی کا تناسب کیا ہے، دونوں فرقوں کے آپسی رشتے کیسے ہیں، معاشی اور تعلیمی صورت حال کیا ہے، میرے خاندان میں کون کون لوگ ہیں، ان کا ذریعۂ معاش کیا ہے، لڑکی ہو کر ایک چھوٹے سے قصبے میں کیوں کر اپنی تعلیم جاری رکھ سکی، وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان کے سب سوالوں کا جواب (جو غالباً تسلی بخش ہی ہوگا) دیا۔ اس میں سے انھوں نے بہت سی باتیں اپنے روزنامچے میں درج کر لیں۔

روزنامچہ لکھنے کا ان کا طریقہ یہ ہے کہ کاغذ کی چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر (جو بازار میں غالباً یادداشتیں درج کرنے کی غرض ہی سے ملتی ہیں) وہ ہر روز کے اہم واقعات کے اشارے تاریخ کے ساتھ درج کر لیتے ہیں، اور پھر غالباً ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ ان واقعات کی تفصیل درج کرتے ہیں۔ بول کر لکھانے کے عادی ہیں اور اس کام کے لیے وہ کسی ٹائپسٹ کی خدمات لیتے ہیں۔ روزنامچے میں وہ اپنے گھریلو معاملات و محسوسات سے لے کر ایسے اہم سیاسی واقعات تک کا ذکر کرتے ہیں جن پر وہ اپنی ایک رائے رکھتے ہیں اور اپنے قارئین تک اسے پہنچانا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس روزنامچے کی جس میں ہر طرح کی تفصیلات درج ہوتی ہیں، وہ کئی نقلیں (غالباً سات) تیار کرتے ہیں اور ڈاک سے اپنے بیٹے ای ان کو، دو بیٹیوں سیرہ اور ایلن کو، اپنے بڑے بھائی ریکس کو، اپنے پرانے دوست کرس فری مَین کو اور اپنی ایک اور دوست اور شاگرد میرین مولٹینو اور ان کی بیٹیوں سے اور شیرون کو بھیجتے ہیں۔ اپنے اکادمک کام کی سال بھر کی روداد بھی وہ تیار کرتے ہیں اور اس کی کاپیاں اپنے تمام ملنے والوں اور دوستوں کو بھیجتے ہیں۔ یہ ان کا برسوں پرانا معمول ہے۔

لندن آنے سے قبل میں ان سے دہلی میں صرف ایک بار ملی تھی، غالباً ۱۹۹۸ء میں جب وہ جامعہ میں اپنے دوست سجاد صاحب کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں جے این یو میں پی ایچ ڈی کی طالبہ تھی اور ہم نے جے این یو کے لٹریری کلب کی طرف سے ان کو مدعو کیا تھا۔ ان کو تقریر کے لیے راضی کرنے کی ذمے داری اطہر فاروقی کے سپرد کی گئی تھی کیونکہ وہ ان کو ذاتی طور پر جانتے تھے، ان سے کئی بار مل چکے تھے اور رالف کا ایک طویل انٹرویو بھی انھوں نے لیا تھا جو اردو اور انگریزی میں کئی جگہ شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد رالف سے کبھی کبھار خط و کتابت ہوتی رہی۔ مستقل رابطہ جولائی ۲۰۰۲ میں شروع ہوا جب انھوں نے اپنی خودنوشت کی ایک کاپی بھیجی اور اس کے کچھ حصے پڑھ کر مجھے لگا کہ یہ ایک الگ ہی نوعیت کی سوانح ہے۔ اردو میں اس قسم کی تحریریں تقریباً نایاب ہیں اور اگر اس کا اردو میں ترجمہ کیا جائے تو یہ ایک دلچسپ کام ہوگا۔ میں نے پہلے باب کا ترجمہ

کر کے رالف کو بھیجا۔ پڑھ کر وہ اس کے معیار و مزاج سے بہت متاثر ہوئے اور تجویز رکھی کہ میں لندن میں ان کے ہاں قیام کروں اور اس کام کو مکمل کر ڈالوں۔ جواباً میں نے انھیں لکھا کہ میرا لندن جانا بے سود ہوگا کیونکہ یہ کام میں دہلی میں رہ کر بھی کر سکتی ہوں، البتہ اس کو آخری شکل دینے کے لیے میں لندن آ سکتی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ اس سے میرے دوسرے کاموں کا بھی حرج نہیں ہوگا۔ رالف کو یہ تجویز پسند آئی اور اس طرح میں نے کام شروع کر دیا لیکن ان دنوں میں بہت مصروف تھی، نوکری کرتی تھی اور اردو کے سرکاری ماہنامے 'اردو دنیا' کی ادارت کی تقریباً تمام ذمے داریاں مجھے چین کی سانس نہ لینے دیتی تھیں۔ اتفاق سے دہلی یونی ورسٹی میں لیکچرر کی پوسٹ کے لیے انٹرویو ہوئے اور نومبر ۲۰۰۲ میں میرا تقرر ہو گیا۔ نئے ماحول اور نئی ذمے داریوں کو دیکھنے سمجھنے اور ان سے مانوس ہونے میں کچھ وقت اور گزر گیا مگر ای میل کے ذریعے رالف سے رابطہ مسلسل رہا۔ بہرکیف، جب گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو میں نے سوانح کے ترجمے کا کام سنبھال لیا۔ ۲ مئی ۲۰۰۳ سے دوسرے باب پر کام کرنا شروع کیا اور ۱۷ جولائی کو ۳۳۴ صفحے کی اس سوانح کا آخری باب ختم کر ڈالا۔ دہلی یونی ورسٹی کا تعلیمی سیشن ۱۶ جولائی سے شروع ہوتا ہے اس لیے سوانح کے ترجمے کو رالف کی مدد سے آخری شکل دینے کے لیے ایک سال کا انتظار ناگزیر ہو گیا۔

میں ۸ جون ۲۰۰۴ کو لندن پہنچی اور اگلے دن سے ہم نے کام شروع کر دیا جو ۲۹ جون کو اکیس دن کی مدت میں ختم ہو گیا۔ ہمارا معمول یہ تھا کہ اپنے کاموں اور ناشتے سے فارغ ہو کر ہم دونوں صبح نو بجے تک میز پر جا پہنچتے تھے۔ میں ترجمے کی دو کاپیاں لے کر گئی تھی۔ میں سناتی جاتی اور رالف دوسری کاپی میں ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے۔ جہاں اردو عبارت واضح نہ ہوتی یا لفظوں کا تلازمہ ترجمے کی صحت پر شبہ کا محرک ہوتا ہم لوگ انگریزی متن سے رجوع کرتے اور جملے کو پھر سے ترتیب دیتے۔ اس ڈھب سے دوپہر تک کام جاری رہتا۔ پھر ہم لوگ اٹھ کر کھانا گرم کرنے رکھتے، یا اگر کھانا گھر میں نہ ہوتا تو Marks and Spencer یا سپر مارکیٹ ASDA سے کھانا خرید کر لاتے۔ جتنی دیر میں کھانا گرم ہوتا ہم لوگ بیٹھ کر باتیں کرتے جو کھانے کے دوران بھی جاری رہتیں۔ گفتگو کا موضوع عام طور پر رالف کے حالاتِ زندگی، ہندستان میں ان کے تجربات وغیرہ ہوتے۔ اردو کے معروف لوگ جو ان کے رابطے میں رہے رالف ان کے بارے میں بتاتے، ان میں سے اکثر باتیں بڑی دل چسپ ہوتیں۔ کبھی کبھی ہندستان کی سیاسی صورتِ حال، کمیونسٹ پارٹی اور جے این یو میں طلبہ کی سیاسی سرگرمیاں، سیاست سے میری وابستگی وغیرہ پر بھی بات ہوتی۔ کھانے کے بعد ہم لوگ عموماً چھوٹا سا بریک لیتے تھے اور جلدی دوبارہ کام کرنے بیٹھ جاتے۔ بعض دفعہ جب کام کو جی نہ چاہتا تو رالف کہتے، 'میں اب قیلولہ فرماؤں گا' ایسا وہ طنزاً کہتے تھے کیونکہ 'فرمانا' جیسے لفظوں کے استعمال کو وہ معیوب سمجھتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے چھوٹے موٹے لیکن ضروری کام کرنا چاہتے تو کہتے تھے، 'Now I'll do my *little fat* works.' (چھوٹے موٹے کاموں کا لفظی ترجمہ رالف نے یہی کر رکھا تھا)۔ رالف کو ایک ساتھ دو کپ چائے پینے کی عادت ہے — دن میں ایک ہی بار، سہ پہر کو۔ صبح کو وہ کافی پیتے ہیں۔

رالف رسل کی خودنوشت تین جلدوں کو محیط ہوگی۔ پہلی جلد شائع ہو چکی ہے جس کے ترجمے کا کام میں مکمل کر چکی ہوں۔ وہ دوسری جلد لکھ چکے ہیں اور تیسری لکھ رہے ہیں۔ پہلی جلد ۱۹۴۶ تک کے واقعات کو محیط ہے — یعنی اس وقت تک جب وہ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد ہندستان سے لندن واپس لوٹے اور فوجی زندگی سے سبکدوش ہو کر اردو میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے انھوں نے سواس میں داخلہ لیا۔ یہ خودنوشت سوانح اس اعتبار سے بہت دل چسپ ہے کہ اس میں رالف کے بچپن کے واقعات، والدین، بھائیوں، رشتے داروں، دوستوں اور دیہات کے لوگوں کے ذکر؛ پھر اسکول، اساتذہ، وہاں کے ماحول، تربیت وغیرہ کے ذکر میں اس قدر والہانہ وابستگی اور جوش و جذبہ ہے کہ قاری بھی اپنے آپ کو اسی ماحول کا ایک حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ اسکول کے بعد کیمبرج کی زندگی (خصوصاً وہاں کی وہ حماقتیں جو ایک مخصوص احساسِ برتری کی غماز ہیں)، کمیونسٹ تحریک سے وابستگی، جنگ کے خلاف سرگرمیاں، جنگ کے زمانے کی وہ تاریخ جسے یوروپ و برطانیہ کے اربابِ اقتدار نے مسخ کر کے پیش کیا ہے، برطانوی حکومت کی نااہلی، ہٹلر کو راضی رکھنے کے لیے انگلینڈ اور فرانس کی پالیسیوں پر کھلی نکتہ چینی اور جنگ کے تئیں عوام کے موڈ کی تفصیلات آنکھیں کھول دیتی ہیں۔ اپنے کمیونسٹ بننے کے اسباب، کمیونسٹ ساتھیوں کے رویوں کا تجزیہ، کمیونسٹ تحریک کی خوبیاں خرابیاں جو رالف نے محسوس کیں، اور ان سب واقعات کے تسلسل میں ان کی اپنی شخصیت کا ارتقا کچھ اس طرح سامنے آتا ہے کہ قاری کے دل میں ان کے واضح خیالات اور دوٹوک ایماندارانہ لہجے کی قدر مسلسل بڑھتی جاتی ہے۔ وہ قاری کو اعتماد میں لیتے ہوئے مکمل وابستگی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اپنی ذاتی زندگی (جس میں جنسی زندگی بھی شامل ہے) کا ذکر بھی انھوں نے اسی کھلے پن سے کیا ہے جو ہو سکتا ہے اردو معاشرے میں بہت سے لوگوں کو پسند نہ آئے، حالانکہ معاصر ہندستان میں، خصوصاً بڑے شہروں میں اور انگریزی نظامِ تعلیم میں اب جنسیات کی تعلیم اور اس کے مسائل پر گفتگو خاصی عام ہو چکی ہے اور اس کھلے پن کو اب شہری تعلیم یافتہ متوسط طبقے میں قابلِ اعتراض نہیں سمجھا جاتا۔

ایک دن مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ ان کی سوانح کے اس حصے کا ترجمہ دیکھ رہے تھے جس میں اس دور کا ذکر ہے جب فرانس پر جرمنی کے قبضے کے بعد

برطانیہ کے بمبار طیارے ہر روز اڑان بھرتے تھے اور فرانس پر بم برسا کر لوٹتے تھے۔ ان میں سے تقریباً ہر روز ہی ایک آدھ طیارہ گرا لیا جاتا تھا۔ رالف کا چھوٹا بھائی فریڈ جو ہوائی فوج میں navigator تھا، یعنی نقشوں کی مدد سے سمت اور حملے کے لیے نشانے وغیرہ کے تعین میں مدد کرتا تھا، ایسی ہی ایک اڑان کے دوران فرانس کے اوپر مارا گیا۔ اس حصے پر پہنچ کر رالف نے مجھے پڑھنے سے روک دیا اور تفصیل سے بتانے لگے کہ ہوائی فوج کے سپاہیوں کو کس قدر شدید خطرات درپیش تھے۔ ان میں سے ہر فوجی محسوس کرتا تھا کہ اس کی باری آج ہی آ سکتی ہے۔ ان کی نفسیاتی کیفیت اور خدشات کا ذکر کرتے کرتے رالف کی آنکھیں بھیگ گئیں اور ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ میں نے بھی جنگ کی شدید ہولناکیوں کو پہلی بار اتنی شدت سے محسوس کیا۔ میں نے بے ساختہ ان کا ہاتھ تھپتھپایا اور پریشان ہو کر شاید تسلی کے چند مہمل سے جملے بھی بولے۔ رالف نے میری طرف دیکھا اور بڑی اداسی کے ساتھ مسکرا کر کہنے لگے، 'مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم میرے ذہن اور جذبات کو اچھی طرح سمجھتی ہو۔' ایک اور موقعے پر انھوں نے بڑے جوش کے ساتھ خوش ہو کر کہا کہ اگر ہم دونوں اسی طرح ہر روز کام کرتے رہیں تو میں جتنا خوش ہوں اس سے توقع کر سکتا ہوں کہ میں ڈیڑھ سو سال تک کام کر سکتا ہوں۔

فوجی افسر کے طور پر رالف رسل جس یونٹ کے انچارج تھے وہ جنوبی ہند کے سپاہیوں پر مشتمل تھا اور اس کو آسام کے سرحدی علاقے دیماپور میں تعینات کیا گیا تھا۔ اپنے یونٹ کے سپاہیوں میں سیاسی بیداری لانے اور طبقاتی شعور پیدا کرنے کے لیے انھوں نے مسلسل کام کیا۔ یہ کام انھیں اپنے انگریز افسروں کے شک کے دائرے میں آئے بغیر کرنا تھا۔ یہ کام نہایت ہی خطرناک تھا کیونکہ ان کی سرگرمیوں کا راز کھل جانے پر ان پر غداری کا الزام لگ سکتا تھا۔ دوسری طرف ہندستانی سپاہیوں کا اعتماد حاصل کرنا بھی بڑا صبر طلب کام تھا کیونکہ اس سوال کا جواب آسان نہ تھا کہ ایک انگریز افسر محکوم ہندستانیوں کا خیرخواہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟ لیکن رالف پر تو اپنے مقاصد کے حصول کی دھن سوار تھی۔ ان کے کمیونسٹ نظریات کا تقاضا تھا کہ وہ جہاں بھی رہیں عوام کی بہبود کے لیے کام کریں، ہندستان کو جب بھی آزادی ملے اقتدار عوام کے ہاتھ میں ہی جائے، عوام کو اس کا احساس دلانا ضروری تھا۔ عوام میں بیداری لانے کے لیے کام کرنا بھی ضروری تھا۔ اپنے یونٹ کے سپاہیوں کے سوا عوامی رابطے کی کوئی سبیل رالف کے پاس نہ تھی۔ فوج میں بھرتی ہونے والے تمام ہندستانی سپاہی غریب کسان اور مزدوری ہوتے تھے جن میں سے زیادہ تر پیٹ سے مجبور ہو کر فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔ ان سپاہیوں کے درمیان سیاسی بیداری کا کام بھی دراصل عوامی بیداری ہی کا کام تھا۔ یوں رالف نے ثابت قدمی کے ساتھ کام شروع کر دیا اور آخرش اپنے یونٹ میں کمیونسٹ پارٹی کے ہمدردوں اور حامیوں کا ایک گروپ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے تمل، تیلگو، کنڑ اور ملیالم زبانوں کا کمیونسٹ لٹریچر بھی اپنے سپاہیوں کو فراہم کرنا شروع کر دیا اور پارٹی کا دائرہ بڑھانے کے امکانات پر غور کرتے رہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کمیونسٹ لیڈروں پی سی جوشی اور اندرجیت گپتا وغیرہ سے رابطہ رکھا اور ان کو رپورٹیں بھیجتے رہے۔ اندرجیت گپتا کی خواہش پر انھوں نے اس پر بھی ایک تفصیلی نوٹ تیار کیا کہ فوجوں میں کمیونسٹ تحریک کو فروغ دینا کس لیے ضروری ہے اور یہ کس طرح ہونا چاہیے۔ ان تجاویز کا ہندستان کی کمیونسٹ پارٹی نے انھیں کوئی جواب نہیں دیا۔ رالف کو افسوس ہے کہ ہندستان کے کمیونسٹ لیڈر بھی عوام کی بات تو کرتے ہیں لیکن عوام کے ساتھ رابطہ قائم کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ لیڈروں نے ان کی بات کو توجہ سے سنا تو لیکن اس کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا اور اس طرح ان کی تجاویز ٹھنڈے بستے میں چلی گئیں۔ مگر اس سے رالف ہمت بار نہیں ہوئے اور وقتاً فوقتاً اپنی تجاویز کی یاددہانی کراتے رہے۔

۲۳ اگست ۱۹۴۵ء کو رالف رسل لندن واپس لوٹ گئے۔ جلد کی کوئی بیماری انھیں ہوئی تھی جس کی تشخیص نہ ہو سکی اور انھیں چند مہینوں کی چھٹی دے کر علاج کے لیے لندن کے دو اسپتالوں میں بھیجا گیا۔ پھر جنگ بند ہو گئی اور اس طرح چھٹیوں کے دوران ہی ان کی فوجی ملازمت ختم کر دی گئی، جبکہ وہ ہندستان واپس لوٹ کر کچھ برس کمیونسٹ تحریک کے لیے کام کرنا چاہتے تھے۔ ملازمت کے خاتمے کے ساتھ ہی ان کی زندگی ایک نئے دور میں داخل ہو گئی۔ وہ لندن یونی ورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں اردو کے طالب علم ہو گئے اور تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہیں اردو کے لیکچرر کے طور پر ان کا تقرر ہو گیا۔ اور اس طرح ان کی اکادمک زندگی کی شروعات ہو گئی۔

رالف کے اندر معاملات کی تمام پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کی تہہ تک پہنچنے کا جو تجسس ہے ان کا صحیح تجزیہ کر کے درست نتائج تک پہنچنے کی جو بے چینی ہے سماجی نظام کو بدلنے اور انسان دوستی کے نصب العین کو عام کرنے کی جو لگن ہے اس نے انھیں کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ چنانچہ سواس کے حکام کے ساتھ ان کا کبھی نباہ نہ ہو سکا۔ اپنے ہم خیال رفقاء کے ساتھ وہ حکام کے رویوں کے خلاف اکثر محاذ آرا رہے۔ انھیں کریر میں نقصان پہنچانے کی دھمکیاں بھی ملیں اور ان کو عملی جامہ بھی پہنایا گیا، یعنی ان کو پروفیسر نہیں بنایا گیا اور وہ ریڈر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ رالف سے ناراضگی کے باوجود انھیں نوکری سے اسی لیے نہیں نکالا گیا کہ وہ بہت اچھے استاد تھے۔

رالف اب تنہا رہتے ہیں۔ عرصہ ہوا جب انھوں نے اور ان کی بیوی مولی نے علاحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا، اور دونوں ہی اپنے اس فیصلے سے خوش ہیں۔ تینوں بچے اپنی ماں سے بھی ملنے جاتے ہیں لیکن رالف کے ساتھ ان کے تعلقات

زیادہ خوش گوار ہیں۔ اپنی زندگی میں آنے والے ہر شخص، زندگی کے ہر موڑ، ہر اہم واقعے، اور اس پر اپنے ردعمل وغیرہ کے بارے میں رالف کے خیالات بالکل واضح ہیں؛ ہر شے کے بارے میں ان کی رائے بے لاگ ہے، اتنی بے لاگ کہ رشک آ جائے— کبھی تو ہر عمر کے ان کے دوست اپنے مسائل پر بات کرنے ان کے پاس آتے ہیں اور مطمئن ہو کر واپس لوٹتے ہیں۔ رالف کی شخصیت کی اس خوبی کا اندازہ ان کی سوانح کی ہر سطر سے ہوتا ہے۔ تعریف و تحسین کے جملے ان کو بہکا بھٹکا نہیں سکتے۔ انھوں نے اکثر مجھ سے ان دنوں کا ذکر کیا ہے جب وہ سوانسی سے تعلیمی رخصت لے کر علی گڑھ پڑھنے کے لیے آئے تھے۔ تعلیمی رخصت کے دوران انھوں نے دوسرے شہروں اور گاؤں کا سفر کیا اور کوشش کی عام لوگوں کے ساتھ گفتگو کے انھیں زیادہ سے زیادہ مواقع ملیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا زیادہ واسطہ ان لوگوں سے پڑتا تھا جو اردو شعبوں سے وابستہ ہیں۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ایک معمولی لیکچرر ہونے کے باوجود جس طرح ان کی پذیرائی ہوتی تھی اس کا سبب ان کی علمیت نہیں تھی بلکہ انگریز ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ تعظیمانہ رویہ اختیار کیا جاتا تھا۔ اس وقت بھی رالف کو اس بات کا افسوس تھا اور اب بھی ہے کہ ہندستان میں ابھی تک لوگوں میں غلامانہ ذہنیت کارفرما ہے۔

ہر بدھ کی شام آٹھ بجے رالف کے پاس کچھ طالب علم اردو سیکھنے آتے ہیں اور ہر دوسری جمعرات کی شام کو ہندی سیکھنے۔ یہ لوگ ویسے تو رسم خط لکھنا پڑھنا سیکھ چکے ہیں لیکن انھیں بولنے کی مشق نہیں ہے۔ ان میں سے کچھ طالب علم تو انگریز ہیں اور کچھ کا تعلق یوروپی ممالک مثلاً جرمنی وغیرہ سے ہے۔ بولنے کی مشق کی یہ کلاسیں بھی خاصی دل چسپ ہوتی ہیں اور ان سے مجھے یہ بھی پتا چلا کہ یوروپی لوگوں کو دقت ش ق کی درست ادائگی میں نہیں بلکہ 'ب' اور 'بھ'، 'ک' اور 'کھ' جیسی آوازوں کے درمیان تفریق میں اور ان کو واضح طور پر ادا کرنے میں ہوتی ہے۔

رالف نہایت شستہ اردو بولتے ہیں لیکن اردو بولنے کی مشق کے زیادہ مواقع نہ ملنے کے سبب اب رالف کو بھی ان دقتوں کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔ مثلاً ایک دن وہ اپنی دوست میرین سولیٹو کی عیادت کر کے لوٹے (جن کے پتے کا آپریشن ہوا تھا) تو مجھے بتانے لگے کہ اسپتال میں میرین کے برابر والے بستر پر جو عورت لیٹی تھی اس نے میرین کو بتایا کہ آپریشن کے بعد اس کے جسم میں ایسے درد ہو رہا ہے گویا کسی گورے نے زور سے لات ماری ہو۔ یہ واقعہ سنا کر رالف خود ہی دیر تک ہنستے رہے اور مجھے بھی اس عورت کی گفتگو کے اس عجیب و غریب انداز پر حیرت بھی ہوئی اور ہنسی بھی آئی۔ مجھے لگا کہ سابق کالونیوں کے کچھ لوگ شاید اب بھی انگریزوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ شام کو جب اردو کی مشق والی کلاس شروع ہوئی تو رالف نے اپنے ایک شاگرد ڈیوڈ ہیچ کو (جو بی بی سی ورلڈ سروس کے انچارج رہ چکے ہیں، اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد اردو بولنے کی مشق کر رہے ہیں) یہی واقعہ اردو میں ایک مرتبہ پھر سنایا۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا اور میں پوچھ بیٹھی، ''رالف! کیا وہ عورت افریقی نسل کی کالی عورت تھی؟'' اب حیرت زدہ ہونے کی باری رالف کی تھی، ''کیا مطلب؟'' انھوں نے پوچھا۔ میں نے وضاحت کی، ''اگر وہ کالوں کی کسی نسل سے تعلق نہیں رکھتی تھی تو پھر گوروں کا ذکر اتنی نفرت سے کیوں کر رہی تھی!'' اب جا کر رالف کی سمجھ میں میری بات آئی اور انھوں نے پوری احتیاط سے لفظوں کو ادا کرتے ہوئے کہا، ''اچھا تو میں نے 'گورا' کہا ہے! لیکن میری مراد تو 'گھوڑے' سے تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب مجھے درست تلفظ کی مشق نہیں رہی۔'' اس واقعے پر وہ خاصے محظوظ ہوئے اور کئی دوستوں سے اس کا ذکر کیا۔

ظاہر ہے کہ رالف کو اب اردو بولنے کے بہت ہی کم مواقع میسر ہیں۔ اردو پر اچھی دسترس رکھنے کے باوجود استعمال میں نہ ہونے کے سبب بہت سے الفاظ اور پیرایہ ہائے اظہار پر سے ان کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے۔ اس کا انھیں افسوس تو ہے لیکن زیادہ نہیں کیونکہ ایسا ہونا فطری عمل ہے جس کے تدارک کے لیے وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ سوانح کے اردو متن کو سنتے ہوئے وہ مجھے اکثر روک دیتے تھے اور بتاتے تھے کہ فلاں لفظ کو میں بھول چکا تھا، اب بہت دن کے بعد سن رہا ہوں۔ ایسے بھی بہت سے لفظوں پر انھوں نے مجھے روکا جو ان کے لیے بالکل نئے تھے۔ ان کے معنی سمجھنے کے بعد وہ بچوں کی طرح سچی خوشی کا اظہار کرتے تھے۔

خیر، جب ترجمے کے متن کی تصحیح کے لیے ہم لوگ نہ بیٹھتے تو میں رالف کے کمپیوٹر پر پڑھتے ہوئے ابواب کی غلطیاں بناتی۔ متن کی سوفٹ کاپی میں اپنے ساتھ لے گئی تھی اور اردو سوفٹ ویئر رالف کے کمپیوٹر پر پہلے ہی ڈلوا چکی تھی۔ اس طرح تصحیح کا کام بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا، اور ہر ایک باب کے فائنل ہونے کے بعد میں اس کی ایک ایک کاپی ای میل کے ذریعے اجمل کمال کو کراچی بھیجتی رہی۔ وہ بھی ترجمے کا متن ہم لوگوں کے ساتھ ساتھ پڑھتے رہے اور ایڈیٹنگ کے نقطۂ نظر سے اس میں تبدیلیوں کے مشورے دیتے رہے۔ مجھے بے حد خوشی ہے اور میں اس کو اپنی خوش بختی پر محمول کرتی ہوں کہ اس ترجمے کی اشاعت 'آج' جیسے قابل قدر معیاری مجلّے میں ہو رہی ہے، اور اس کے لیے میں اجمل کمال کی ذاتی طور پر بہت ممنون ہوں۔ اجمل کے بہترین انسانی اقدار میں یقین اور ان کی ترویج کے لیے ادبی محاذ پر سنجیدہ اور مستقل کوششوں کی میں تہ دل سے قدر کرتی ہوں، اور اسی مشترکہ مقصد میں یقین رکھنے کے سبب ان کی دوستی کو بے حد عزیز تصور کرتی ہوں۔

شادم از زندگیٔ خویش

رالف رسل

(لندن)

۱۱ اکتوبر ۱۹۸۱ کو میں نے SOAS سے ریٹائرمنٹ لے لیا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ریٹائرمنٹ لے کر ہی آپ کو اپنی آپ بیتی یا اپنے reminiscences لکھنے چاہئیں۔ میں اس کا قائل نہیں۔ میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں کہ آپ ریٹائرمنٹ کے بعد ہی اپنے تجربوں کے بارے میں ٹھنڈے دل سے سوچ سکتے ہیں اور صحیح نتیجے نکال سکتے ہیں۔ لیکن بہرحال ریٹائرمنٹ سے پہلے میں اس قسم کی چیز لکھنے کے لیے وقت نہیں نکال سکا، ورنہ اب پچاس سال ہونے کو آئے ہیں کہ مجھے اردو میں لکھنے کا خیال آیا تھا، بلکہ اردو میں لکھنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا۔

SOAS میں لکچرر مقرر ہونے کے فوراً بعد میں تعلیمی رخصت (study leave) لے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچا۔ وہاں میری ملاقات اختر انصاری سے ہوئی جو اُس زمانے میں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر تھے۔ رشید احمد صدیقی اس زمانے میں صدرِ شعبہ تھے۔ انھوں نے اختر انصاری سے میری مدد کرنے کو کہا۔ قدرتی طور پر میں اُن کی بعض تصانیف سے روشناس ہو گیا۔ ان میں سے ایک کتاب تھی "ایک ادبی ڈائری" جو لاہور سے ۱۹۳۳ میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے مختلف مصنفوں کے بارے میں اور مختلف واقعات کے بارے میں جن کی کوئی نہ کوئی ادبی اہمیت ہوتی تھی اپنے وہ خیالات قلمبند کیے تھے جو وقتاً فوقتاً ان کے ذہن میں آئے تھے۔ اس وقت سے آج تک میں سوچتا رہا کہ میں بھی اس قسم کی کتاب لکھ سکتا ہوں جو شاید اردو والوں کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہو۔ سالہا سال دوسری مصروفیتیں حائل ہوتی رہیں، لیکن آج لکھنا شروع کر رہا ہوں۔

یہ کتاب اصل میں ایک طرح سے ایک ضمیمہ ہے۔ میری اور میری شاگرد اور دوست Marion Molteno کی بعض انگریزی تحریروں کا ضمیمہ۔ میرین کے دو مضامین شائع ہوئے، ایک امریکی رسالے Annual of Urdu Studies (No.6) میں اور دوسرا Urdu and Muslim South Asia کی اُس festschrift میں جو میرے اعزاز میں مرتب ہوئی اور ۱۹۸۹ میں شائع ہوئی۔ پہلے مضمون کا عنوان تھا "Ralph Russal: Teacher, Scholar, Lover of Urdu" اور دوسرے کا "This New Work': Ralph Russal and Urdu in Britain"۔ اس کے بعد میرا اپنا مضمون "Urdu and I" (No, 11) Annual of Urdu Studies میں چھپا۔ مگر پھر بھی یہ کتاب جو آپ کے سامنے ہے ضمیمہ ہی سہی مگر ان تحریروں سے ذرا مختلف ہے جس کا آپ اسے ضمیمہ کہہ سکتے ہیں۔ اس میں میں نے اختر انصاری کی کتاب کے نمونے پر وہ خیالات قلمبند کیے ہیں جو وقتاً فوقتاً میں ذہن میرے آئے ہیں اور جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح اردو زبان اور ادب سے ہے۔

لیکن آگے بڑھنے سے پہلے میں اس کتاب کی زبان کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ اردو میری مادری زبان نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں اردو میں کچھ لکھ رہا ہوں اور کوشش کر رہا ہوں کہ زبان سلیس بھی ہو اور بامحاورہ بھی۔ میں اپنے بہت پرانے اور بہت اچھے دوست خالد حسن قادری کا نہایت ممنون ہوں کہ انھوں نے میری اردو کی نوک پلک درست کرنے کی زحمت اٹھائی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوا کہ اب اس کتاب کی اردو وہ عمدہ اردو ہے جو قادری صاحب خود لکھتے ہیں اور ظاہر ہے میں نہیں لکھ سکتا۔ زبان میری ہی ہے اور قادری صاحب نے میرے کہنے پر صرف اتنا کیا ہے کہ اس سے گرامر (صرف و نحو) اور تجنیس وغیرہ کی غلطیاں دور کی ہیں۔

جو زبان میں لکھتا ہوں اس کے متعلق چند اور باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ میری زبان کی کچھ خصوصیتیں ہیں۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ آپ اس میں کوئی تکلف نہیں پائیں گے۔ تحریر اردو میں ہو یا انگریزی میں، جہاں تک ممکن ہو وہی زبان لکھنا پسند کرتا ہوں جو میں بولتا ہوں۔ اور میں کبھی پُرتکلف قسم کی زبان بولنا پسند نہیں کرتا۔

مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جب میں اردو بولتا ہوں تو بعض لوگ سنتے ہیں اور دل میں کہتے ہیں کہ "اس شخص کو بس معمولی سی اردو آتی ہے" اس کی بڑی وجہ وہی ہے جو میں نے ابھی بیان کی ہے، کہ میں کبھی پُرتکلف قسم کی زبان نہیں بولتا۔ مثال کے طور پر میری زبان میں لوگ "فرماتے" نہیں، "کہتے" ہیں۔ اور میں "عرض" نہیں کرتا، میں بھی "کہتا" ہوں۔ اسی طرح لوگ "تشریف" نہیں لاتے، "آتے" ہیں، اور میں بھی "آتا" ہی ہوں، "حاضر" نہیں ہوتا۔ اس میں معاذ اللہ کسی قسم کی بے ادبی مقصود نہیں۔ (اگر میں کسی سے "تشریف لائیے" نہ کہوں، "آیئے" کہوں تو اس میں کوئی بے ادبی نہیں۔) اور یہ بھی بات نہیں ہے کہ میں ان الفاظ سے اور ان کے مصرف سے واقف نہیں ہوں۔ واقف تو ہوں لیکن میرا جی نہیں چاہتا کہ میں انھیں استعمال کروں۔ مجھے یاد ہے کہ کچھ سال پہلے میں اسلام آباد میں تھا۔ جمیل الدین عالی نے ناشتے پر نظیر صدیقی کو بلایا تھا اور مجھ سے بھی آنے کو کہا۔ باتوں باتوں میں ایک صاحب کی

تصنیف کا ذکر آیا اور عالی صاحب نے میری رائے پوچھی۔ میں نے تعریف تو کی تھی، لیکن اس پُر تکلف طریقے سے نہیں جس کی توقع عالی صاحب کر رہے تھے۔ اس پر وہ بولے، "واقعی آپ کو اردو نہیں آتی!" (عالی صاحب ہمیشہ سے میرا مذاق اڑاتے ہیں اور یہ بات مجھے بہت پسند آتی۔) میں نے کہا، "نہیں بھائی، یہ مسئلہ زبان دانی کا نہیں، یہ ذاتی مزاج کا مسئلہ ہے۔" اور یہ واقعہ بھی ہے۔

حال ہی میں ایک نوجوان اخبار نویس اطہر فاروقی مجھ سے ملنے آئے۔ خواہش کی کہ میرا انٹرویو لیں۔ میں راضی ہوا تو ٹیپ ریکارڈر نکال کے اس پر انٹرویو کی ریکارڈنگ کی۔ اس کے بعد کہا کہ "چھپوانے سے پہلے میں اس کا ٹائپ اسکرپٹ تیار کر کے آپ کے پاس لاؤں گا۔ آپ کو پڑھ کے سناؤں گا۔ جہاں آپ کوئی ترمیم کرنا چاہیں کر دیجیے۔" دو تین دن کے بعد وہ پھر آئے۔ سنانا شروع کیا تو "دیگر حضرات" کے الفاظ آئے۔ میں نے فوراً روکا اور کہا کہ "مجھے کامل یقین ہے کہ میں نے 'دیگر حضرات' نہیں کہا۔ 'دوسرے لوگ' کہا ہوگا۔" کہنے لگے "مانا کہ آپ نے وہ الفاظ نہیں کہے ہوں گے، لیکن جب آپ لکھتے ہیں تو آپ بالکل وہ زبان تو نہیں لکھتے جو آپ بولتے ہیں۔" میں نے کہا، "یہ صحیح ہے کہ تقریری کی زبان اور تحریری کی زبان میں فرق ہے لیکن اسلوب بیان میں زیادہ فرق نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے ان لوگوں کی زبان سے بڑی کوفت ہوتی ہے جو 'اس کے علاوہ' نہیں لکھیں گے، 'علاوہ ازایں' لکھیں گے۔ اسی طرح 'راقم الحروف' لکھنے کی مطلق کوئی ضرورت نہیں۔ 'راقم الحروف' کے معنی ہیں 'میں'۔ اور 'میں' ہی لکھنا چاہیے۔ خیر اس وقت آپ سناتے جایئے۔ فی الحال میں صرف یہی کہوں گا کہ میرا مطلب آپ نے صحیح لکھا کہ نہیں لیکن آپ ضروری ترمیم کرنے کے بعد مجھے مسودہ بھیجئے۔ میں 'دیگر حضرات' وغیرہ کو بدل کر آپ کو واپس کر دوں گا۔"

ایک دفعہ مجھے شبہ سا ہونے لگا کہ شاید 'فرملا'' وغیرہ جیسے الفاظ نہ بولنا بدتمیزی ہو۔ میں نے خورشید الاسلام سے پوچھا کہ کیسی زبان بولنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ کہا، "نہیں۔ آدمیوں کی زبان بولنی چاہیے۔" خیر یہ تو میں نہیں کہوں گا کہ تکلف کی زبان 'آدمیوں کی زبان' نہیں ہے مگر پھر بھی یہ زبان مجھے پسند نہیں اور اس کتاب میں میں 'آدمیوں کی زبان' ہی لکھوں گا۔

اور اب اپنی کہانی شروع کرتا ہوں۔ یہاں بہت زیادہ تفصیل میں جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے ایک مختصر بیان پر اکتفا کرتا ہوں۔ (اگر آپ کو مزید تفصیل چاہیے تو آپ کو ان انگریزی مضامین میں ملے گی جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔)

اکثر لوگوں کی زندگی میں بہت سے واقعات "اتفاقاتِ زمانہ" کی ذیل میں آتے ہیں۔ میری زندگی میں بھی اردو سے میرا رشتہ "اتفاقاتِ زمانہ" ہی میں سے ہے۔

میری جوانی کا زمانہ وہ زمانہ تھا جس میں دوسری عالمی جنگ کے بادل آسمان پر چھا رہے تھے۔ جب میری عمر پندرہ سال تھی، جرمنی میں وہ زبردست سیاسی انقلاب ہوا جس کی بنا پر ہٹلر کی حکومت قائم ہوئی۔ اُس وقت تو میرا سیاسی شعور نہ ہونے کے برابر تھا، لیکن حالات کے دباؤ نے جلد ہی وہ شعور پیدا کیا اور ۱۹۳۴ میں میں (اپنے بہت سے ہمعصروں کی طرح) کمیونسٹ ہو گیا۔ ہم کمیونسٹوں کا عقیدہ تھا کہ ہندوستانی جو مکمل آزادی چاہتے ہیں، وہ حق بجانب ہیں اور انگریز کمیونسٹوں کا فرض ہے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی ہر ممکن حمایت کریں۔

ویسے یہ دنیا بھر کے کمیونسٹوں کا فرض تھا، لیکن انگریز کمیونسٹ چونکہ اُس قوم کے فرد تھے جس نے ہندوستان کو محکوم بنا رکھا تھا اس لیے ان پر ایک خاص ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ پھر بھی مجھے ہندوستان کے حالات کا کوئی قابل ذکر علم نہیں تھا۔ میرا علم اور میری دلچسپی اس وقت بڑھنے لگی جب میں کیمبرج یونیورسٹی گیا۔ وہاں بعض ہندوستانی کمیونسٹوں سے ملاقات ہوئی۔ ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ لیکن اس وقت میرے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ مجھے کبھی ہندوستان جانے کا اتفاق ہوگا۔

میں ۱۹۴۰ تک کیمبرج میں طالب علم رہا۔ تین سال کا کورس تھا۔ آخری سال کے شروع ہونے سے ایک مہینہ پہلے دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ جنگ میں کتنے سال لگیں گے اور جیت کس کی ہوگی۔ مستقبل کے لیے کوئی ٹھوس منصوبہ بنانا ناممکن تھا۔ میری عمر کے ہر انگریز کی طرح مجھے جبری بھرتی کے قانون کے مطابق فوج میں جانا پڑا۔ (اس سے مستثنیٰ صرف وہی لوگ تھے جو ایسے کام کر رہے تھے جو جنگ کے لیے بالکل ضروری تھے۔) اسی فوجی نوکری کے سلسلے میں مجھے ہندوستان بھیجا گیا۔ میں مارچ ۱۹۴۲ میں ہندوستان پہنچا اور ساڑھے تین سال کے بعد اگست ۱۹۴۵ میں برطانیہ واپس جانے کے لیے روانہ ہوا۔

جب میں ہندوستان پہنچا میری عمر چوبیس سال تھی۔ میں سولہ سال کی عمر میں کمیونسٹ ہو گیا تھا۔ مجھے ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ رہنا تھا، انڈین آرمی میں۔ انڈین آرمی کی زبان اردو تھی۔ اگر میں اپنے سپاہیوں سے باتیں کرنا چاہتا تھا تو ظاہر تھا کہ مجھے اردو سیکھنے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا میں نے سیکھی اور جب تک میں ہندوستان میں رہا اردو میں آزادی (اور کمیونزم) کا درس دیتا رہا۔

برطانیہ واپس آنے کے بعد مجھے ایک سال اور فوج میں رہنا پڑا۔ انہیں دنوں مجھے ایک اشتہار دکھایا گیا جس میں لکھا تھا کہ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز، یونیورسٹی آف لندن، اردو ادبیات کے مطالعہ کے لیے ایک اسٹوڈنٹ شپ (وظیفہ) دے رہا ہے۔ امیدواروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ

برٹش یونیورسٹی کے گریجویٹ ہوں اور اردو میں بی۔اے آنرز کی ڈگری کے تین سال پڑھنے کے لیے تیار ہوں۔ اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ انھیں اردو میں لیکچر شپ کی پیشکش کی جائے۔ میں نے اس کے لیے درخواست دی اور انتخاب کر لیا گیا۔

جون 1946 پورے چھ سال کے بعد فوجی نوکری سے چھٹکارا ملا۔ اکتوبر 1946 میں SOAS میں داخل ہوا۔ تین سال میں نے بڑی محنت سے اردو پڑھی (اور اس کے ساتھ ضمنی مضمون کے حیثیت سے ''سنسکرت)۔ امتحان میں مجھے فرسٹ کلاس ملا۔ اور اس کے فوراً بعد لیکچرر مقرر ہوا۔ بعد میں مجھے ریڈر بنایا گیا۔ ۱۹۸۱ میں ریٹائرمنٹ لے لیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی میں اردو کی خدمت کرنے کی کوشش کرتا رہا اور عمر بھر یہ کوشش جاری رہےگی۔

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ 1936 میں میں کیمونسٹ ہو گیا تھا اور یہ بھی کہ میرے کیمونسٹ عقیدوں کا تقاضہ تھا کہ میں اردو سیکھوں تاکہ میں اپنے سپاہیوں سے بات چیت کر سکوں اور ہندوستان کی آزادی کا اور کیمونزم کا پرچار کر سکوں۔ آج بھی میں اپنے آپ کو کیمونسٹ سمجھتا ہوں اور آج بھی اپنی کیمونسٹ سرگرمیوں میں مصروف ہوں۔ اگرچہ میرے کیمونسٹ عقیدے اور کیمونسٹ سرگرمیاں اس کتاب کا موضوع نہیں ہیں پھر بھی میں ان کا اجمالی ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اب اگر کوئی آدمی اپنے آپ کو کیمونسٹ کہے تو دوسروں کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

جب میں کیمونسٹ پارٹی کا ممبر ہوا تھا تو اکثر سنجیدہ لوگ کم و بیش یہ سمجھتے تھے کہ کیمونزم کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس کے حامی ہوں یا مخالف، ان کا کیمونزم کا تصور تقریباً واضح بھی تھا اور بڑی حد تک صحیح بھی تھا۔ اب بہت عرصے سے یہ صورت حال نہیں رہی۔ ایک کیمونزم (مرحوم) سوویت یونین کا تھا، تو ایک چین کا کیمونزم' اور ایک اٹلی کا کیمونزم۔ ہندوستان میں سی۔پی۔آئی کا کیمونزم ہے اور سی۔پی۔ایم کا کیمونزم' اور نکسلائٹ کا کیمونزم بھی ہے۔ ان سارے گروہوں کے افراد اپنے آپ کو کیمونسٹ کہتے تھے یا کہتے ہیں۔ اور میں؟ میں ان میں سے کسی بھی دبستان خیال کا کیمونسٹ نہیں ہوں۔ جب لوگ پوچھتے کہ آپ کس قسم کے کیمونسٹ ہیں تو میں کہتا ہوں کہ میں نہ روسی کیمونسٹ ہوں نہ چینی' نہ اطالوی۔ میں محض کیمونسٹ کیمونسٹ ہوں۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ میرا بنیادی نقطہ نظر انسان دوستی ہے' جس میں انسانی حقوق کا تحفظ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ میری یہ کوشش رہتی ہے کہ میں دوسروں کے ساتھ وہی برتاؤ کروں جس کی میں اُن سے توقع کرتا ہوں۔ (اصل میں توقع نہیں، امید کہنا چاہیے۔ میرا اصول ہے کہ آپ ہر بات کی امید کر سکتے ہیں، کسی بات کی توقع نہیں کر سکتے)۔ ظاہر ہے کہ روزمرہ کے معاملات میں اس تصور پر عمل کرنا کوئی بہت مشکل کام نہیں ہے۔ روزمرہ کے معاملات میں زیادہ تر فرد سے فرد کے رابطے کا عمل رہتا ہے اور یہ رابطہ عام طور پر کوئی خاص مسئلہ پیدا نہیں کرتا۔ مگر نہیں۔ یہ الفاظ لکھتے ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ اگر ان میں سچائی ہے تو وہ کتنی محدود ہے۔ لکھتے وقت میرے ذہن میں وہ بیسیوں آدمی تھے جن سے روزمرہ کی زندگی میں آپ کا واسطہ سرسری، اتفاقی، وقتی۔ پڑتا ہے۔ ان کی حد تک تو ٹھیک ہے، اور ایسی صورتوں میں ''فرد سے فرد کا رابطہ'' واقعی کوئی خاص مسئلہ پیدا نہیں کرتا لیکن ''فرد سے فرد کے رابطے'' کے دائرے میں اور بہت سے رابطے آتے ہیں۔ بیوی سے میاں کا رابطہ، معشوق (یا معشوقہ) سے عاشق (یا عاشقہ) کا رابطہ، ماں باپ سے بچے کا رابطہ، اور بہت سے دوسرے رابطے سب ہی ''فرد سے فرد کے رابطے'' ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان رابطوں کو نبھانے میں بہت سے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں اور عام طور پر پیدا ہوتے بھی ہیں۔ بہر حال ان مسائل کو فی الحال جانے دیجیے اور ایک دوسرے مسئلے پر غور کیجیے۔ افراد کے علاوہ افراد کے گروہ بھی ہوتے ہیں۔ قومیں ہیں، سماجی طبقے ہیں، سیاسی پارٹیاں ہیں وغیرہ وغیرہ، اور انسان دوست آدمی کے سامنے یہ مسئلہ آتا ہے کہ ان مختلف گروہوں کی طرف سے اس کا رویہ کس طرح ہونا چاہیے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں سیاسی شعور بھی ہو۔ اس سیاسی شعور کی بنیاد بھی انسان دوستی پر ہی رکھنی بالکل ضروری ہے لیکن انسان دوستی کا محض تصور ہی آدمی کے کام نہیں آئے گا۔ اور یہاں میں یہ بتا دوں کہ میرے نزدیک انسان دوستی کے اصول پر آپ باقاعدہ اور ہر وقت سوچ سمجھ کر چلنے کی کوشش کریں تو آپ لازمی طور پر اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ کسی انسان کو کسی انسان کا، اور کسی سماجی طبقے کو کسی سماجی طبقے کے استحصال کا حق نہیں پہنچتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں کیمونسٹ ہوں۔ میں جاگیرداری اور سرمایہ داری کو ختم کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں لازمی طور پر انسان دوستی کی نفی کرتی ہیں۔ میں کیمونزم کو انسان دوستی کی ترقی یافتہ شکل سمجھتا ہوں اور کیمونسٹ انسان کو انسان دوست انسان کی ترقی یافتہ شکل۔ اور یہ سب کچھ کہنے کے بعد غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہی کہ میں صرف اس کیمونزم کو صحیح معنوں میں کیمونزم سمجھتا ہوں جس میں انسانی حقوق کو نظر انداز کرنا کسی بھی طرح اور کسی بھی صورت میں ممکن نہیں ہوتا۔

اس تمہید کے بعد آپ سمجھیں گے کہ میرے لیے کیمونزم ایک ہمہ گیر نظریہ ہے جس کا اطلاق زندگی کے ہر شعبے پر ہوتا ہے اور میرے نزدیک کیمونسٹ انسان عام انسان سے کافی مختلف ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسا آدمی ہوتا ہے جس کو غالب کے الفاظ میں میسّر ہوا انسان ہونا، ایسا انسان جو افراد اور قوموں اور سماجی طبقوں اور سیاسی پارٹیوں سے متعلق صحیح رویہ جانتا بھی ہے اور برتتا بھی ہے ایسا انسان جس کی زندگی کا کوئی بھی ایسا شعبہ نہیں جس میں اس کا کیمونسٹ عقیدہ کارفرما نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ بے شمار آدمی جو خود کو کیمونسٹ کہتے ہیں میری نظر میں کیمونسٹ ہیں ہی نہیں۔ اس نتیجے پر پہنچنے کا عمل میرے لیے بہت ہی تلخ تجربہ تھا۔

تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے لیکن اس کا مختصر بیان مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جب میں کمیونسٹ ہو گیا تو میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ عالمگیر کمیونسٹ تحریک ایک بین الاقوامی انقلابی فوج ہے جس کے سپاہی ایسے بہادر ہیں جو کمیونزم کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ جن کے لیڈر کمیونزم کے ایسے ہی عاشق ہیں جیسے منصور بن حلاج اللہ کا حقیقی عاشق تھا' اور جن کا کمیونزم کا تصور وہی تھا جو میرا تھا (اور ہے)۔ لیکن ۱۹۴۶ میں پارٹی ممبر بننے کے تقریباً بارہ سال بعد کچھ ایسے واقعات ہوئے جن کی بنا پر مجھے اس نتیجے پر پہنچنا پڑا کہ میرا یہ تصور حقیقت سے کوسوں دور تھا۔ اور حقیقت یہ تھی کہ اگرچہ ایسے کمیونسٹ ''سپاہی'' کافی تعداد میں موجود تھے جو میرے تصور کے مطابق تھے لیکن بیشتر تعداد ان کی تھی جو ایسے نہیں تھے اور رہے لیڈر تو ان میں سے اکثر ایسے تھے جو صحیح معنوں میں کمیونسٹ کہلانے کے بھی مستحق نہیں تھے۔ اب بہت عرصے سے میرا یہ پکا خیال ہو گیا ہے کہ ہر ملک کی ہر سیاسی پارٹی کا ہر لیڈر جھوٹا، بے ایمان اور ظالم ہوتا ہے۔ (اور جو خود زیادہ ظلم نہیں کرتے وہ ظالموں کی حمایت کرتے ہیں اور ان کا ظلم چھپاتے ہیں۔) اس کلیے سے کمیونسٹ لیڈر کسی طرح بھی مستثنیٰ نہیں۔

اس ۱۹۳۶ کے تجربے کا مجھے بہت بڑا صدمہ ہوا، لیکن ایسا نہیں کہ میں سنبھل نہ سکوں۔ اس کے بعد سے مجھے احساس رہتا ہے کہ حقیقت کی دریافت کتنی ہی تلخ اور مایوس کن کیوں نہ ہو اس سے ہرگز منہ موڑنا نہیں چاہیے۔

اب مجھ پر ظاہر ہو گیا تھا کہ میرا کمیونزم کا تصور میری بہت بڑی سادہ لوحی پر مبنی تھا اور سچی بات یہ ہے کہ اس کے بعد بھی زندگی میں کتنی بار مجھے یہ محسوس کرنا پڑا ہے کہ میں بنیادی طور پر کافی سادہ لوح آدمی ہوں۔ آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ اس سادہ لوحی کو دور کرنے میں (جہاں تک میں اسے دور کر سکا ہوں) کتنے تجربوں سے مجھے گزرنا پڑا ہے۔

لیکن اب اس بحث کو چھوڑیے اور اس کتاب کے اصل موضوع پر آیئے۔ 1949 میں میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ میری عمر اب اٹھتیس سال تھی اور زندگی میں پہلی بار مجھے سوچنا پڑا کہ روزی کیسے کماؤں اور زندگی کیسے بسر کروں۔ میں خوش قسمت تھا۔ میں SOAS میں اردو کا لیکچرر مقرر ہو گیا۔ یعنی مجھے ایسی ملازمت ملی جس سے میں خوش بھی رہ سکتا تھا اور جس میں (اپنے زعم میں) خدمتِ خلق بھی کر سکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ SOAS کے اربابِ حل و عقد اس معاملے میں بڑی حد تک میرے ہم خیال ہوں گے، یعنی جن خطوط پر میں کام کرنا چاہتا تھا یہ وہی ہوں گے جن پر وہ خود چاہتے ہوں گے کہ میں کام کروں۔ بہت جلد مجھے معلوم ہوا کہ یہ میری خوش فہمی تھی۔

یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ جب دوسری عالمی جنگ ختم ہونے والی تھی تو انگریزی حکومت کو یہ احساس ہوا کہ اب دنیا کے سیاسی حالات میں جو بنیادی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ان کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمیں سوویت یونین، مشرقی یورپ، ایشیا اور افریقا کی زبانوں کی طرف بہت زیادہ توجہ دینی ہوگی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ SOAS کو ایک کافی بڑی رقم دی گئی تاکہ وہ اس کام کا ایک حصہ سنبھالے، اور اسی سلسلے میں میرا تقرر ہو گیا۔

یہ بالکل ظاہر تھا کہ اردو کے مطالعے کے امکانات میں اگر وسعت پیدا کرنی تھی تو پہلا قدم یہ تھا کہ عام انگریزوں میں اردو میں دلچسپی پیدا کرنی ہوگی۔ اور یہ کام آسان نہیں ہوگا۔ اول تو خاصے پڑھے لکھے انگریزوں میں بھی بہت کم لوگ تھے جو اتنا بھی جانتے تھے کہ اردو ہے کیا۔ خود میرے ذاتی تجربے نے یہ بات بتائی۔ جب میں نے اردو باقاعدہ پڑھنی شروع کی، میرے اکثر دوست مجھ سے پوچھتے تھے کہ ''آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟'' میں کہتا تھا ''اردو'' اور وہ پوچھتے تھے کہ ''اردو کیا ہے؟'' اس صورت میں میں سمجھا کہ انگریزوں کو یہ سمجھانا بہت ضروری ہے کہ اردو ایک اہم زبان ہے جسے کروڑوں انسان بولتے ہیں اور یہ کہ اس میں بہت اعلیٰ درجے کا ادب موجود ہے جو ہر طرح سے مطالعہ کرنے کے لائق ہے۔ اصل میں یہ دوسرا کام مقدم تھا اور اسے کرنے کا سب سے موزوں طریقہ یہ تھا کہ اردو کی اچھی چیزوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تاکہ انگریز دیکھ سکیں کہ اردو میں کیا ہے۔ اگر اس کے نتیجے میں اردو پڑھنے کا شوق پیدا ہو تو زبان پڑھانے کا معقول انتظام کرنا ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ اردو کو اس کا صحیح مقام دلانے کے لیے۔ وہ مقام جو کہ خود برٹش گورنمنٹ صحیح سمجھتی تھی۔ زبان پڑھانے کا کورس تیار کرنا اور اردو ادب کی اچھی چیزوں کا ترجمہ کرنا وہ کام تھے جنھیں ہمیں مقدم سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے یہی کام سنبھالنا چاہا، اور سمجھا کہ موجودہ حالات میں ''خدمتِ خلق'' کی ایک صورت یہ ہے۔

لیکن مجھے یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ SOAS کے اربابِ حل وعقد کے خیالات کچھ اور ہی تھے۔ ان کو ان مقاصد سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ SOAS کو ایک بڑی رقم ملی تھی جس کی بدولت اس کو اپنے لیکچررز کی تعداد میں خاصا اضافہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ اور بس' ختم معاملہ۔ رہے یہ نئے لیکچررز' ان کو اس قسم کی خدمتِ خلق سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ان کو دلچسپی خدمتِ خلق سے زیادہ خدمتِ خود سے تھی۔ اور SOAS کے حکام؟ وہ اس ''خدمتِ خود'' کے رویے کو نہ صرف قدرتی اور جائز سمجھتے تھے، ان کی نظر میں یہ خیال مستحسن بھی تھا۔ مجھ سے ان کو یہ توقع تھی کہ میں بھی وہ کام مقدم رکھوں گا جن سے جلد از جلد میری ترقی ہو سکے۔

۱۹۵۰ میں جب ایک سال کی تعلیمی رخصت (study leave) سے لوٹ کے SOAS پہنچا اور A.H. Harley سے (جن کا میں جانشین ہونے والا تھا) اپنے کام کے پروگرام کے بارے میں مشورہ کیا تو ان کا پہلا سوال یہ تھا کہ ''آپ اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے کونسا موضوع انتخاب

کریں گے؟'' مجھے ان کے سوال پر حیرت ہوئی۔ میری دلچسپی اردو ادب سے تھی۔ چار سال پہلے میں نے اردو ادب کی ایک کتاب بھی نہیں پڑھی تھی اور میں (بالکل بجا طور پر) سمجھتا تھا کہ میں ہرگز اس لائق نہیں ہوں کہ میں اردو ادب پر ''تحقیق'' کروں۔ اس لیے میں نے کہا کہ 'میرا پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کا ارادہ ہے نہیں'' اگر مجھے ان کے سوال سے حیرت ہوئی تھی تو ان کو میرے جواب سے اس سے کہیں زیادہ حیرت ہوئی، اور صاف ظاہر تھا کہ ان کو کافی بڑا صدمہ ہوا۔ ان کو میرے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے انکار سے اتنی پریشانی ہوئی کہ مجھے فوراً صدرِ شعبہ کے پاس لے گئے تاکہ وہ مجھے سمجھائیں اور راہِ راست پر لائیں۔ جب وہ بھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکے تو وہ فوراً Harley سمیت، مجھے ڈائریکٹر کے پاس لے گئے۔ لیکن وہ بھی مجھے سمجھا نہیں سکے۔ یہاں اس واقعے کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ (آپ کو زیادہ تفصیل چاہیے تو میرا مضمون "Urdu and I" دیکھیے۔)

خلاصہ یہ کہ وہ لوگ مجھے سمجھا تو سکتے تھے، مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا اور فیصلہ کیا کہ ان خطوط پر کام کرنا شروع کروں گا جو میں صحیح سمجھتا تھا۔ اور آج بھی انھیں خطوط پر کام کر رہا ہوں۔

میرے اس فیصلے کے کافی دوررس نتیجے نکلے۔ ایک نتیجہ یہ تھا کہ میرا اردو ادب کا مطالعہ کافی محدود رہا۔ اور اردو زبان پڑھانے کا معقول کورس تیار کرنے میں کافی سال لگے، اور اس دوران ادب کا وسیع مطالعہ کرنا ناممکن تھا۔ زیادہ تر میں وہ کتابیں پڑھتا رہا جن کو مجھے طالب علمی کے زمانے میں پڑھنا پڑا تھا اور اب مجھے دوسروں کو پڑھانا تھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ میں ان کتابوں سے بہت اچھی طرح واقف ہو گیا اور اردو شاعری اور نثر کے شاہکاروں کو بڑے غور سے پڑھنے کی عادت پڑ گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ نصاب کا دائرہ بھی کافی وسیع تھا۔ شاعری میں میر، غالب، مومن، ذوق، اور دوسرے شعرا کی غزلوں کا انتخاب تھا۔ پھر مثنوی میر حسن (''سحر البیان'')، میر انیس کا مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' حالی کا مسدس اور اکبر الٰہ آبادی کے کلام کا انتخاب۔ نثر میں میر امن کی 'باغ و بہار' غالب کے خطوط کا انتخاب، محمد حسین آزاد کے ''آبِ حیات'' کا ایک حصہ، حالی کا 'مقدمہ شعر و شاعری' اور نذیر احمد کی 'توبۃ النصوح' یہ اس وقت کا نصاب تھا جب میں نے اردو میں بی۔ اے میں آنرز کا کورس شروع کیا تھا (اور یہ فہرست مکمل نہیں ہے) آگے چل کر میں نے نصاب کا دائرہ اور بھی وسیع کر دیا۔ مثال کے طور پر شاعری میں میر کی مثنوی 'معاملاتِ عشق' سودا کا ایک قصیدہ اور ایک مخمس، شوق کی مثنوی ''زہرِ عشق''، نظیر اکبر آبادی کی کچھ نظمیں اور اقبال اور فیض کی کئی مشہور نظمیں (اقبال کی زیادہ، فیض کی کم)۔ ان سب کا اضافہ کیا۔ نثر میں رسوا کا ناول 'امراؤ جان ادا'' اور پریم چند اور ترقی پسندوں کے کچھ افسانے نصاب میں شامل کیے اور فرحت اللہ بیگ کی ''ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی'' (یہ بھی مکمل فہرست نہیں ہے۔) لیکن اس سے بہت زیادہ پڑھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ ہاں، جب مجھے سال بھر کی تعلیمی رخصت (study leave) ملی تھی تو زیادہ پڑھنے کا موقع ملتا تھا۔ ۱۹۵۰۔۱۹۴۹ میں میں نے خلیل الرحمٰن اعظمی سے پریم چند کا ''گئودان'' پڑھا اور اپنے مارکسسٹ ساتھی ممتاز حسین کے بعض تنقیدی مضامین جن کے مضوعات تو ٹھوس تھے لیکن جن کی اردو حیرت انگیز حد تک پیچیدہ اور اکھڑی ہوئی تھی۔ ۱۹۵۸ میں میں نے بیگم صالحہ عابد حسین سے میر انیس کے مراثی کا وہ انتخاب پڑھا جو 'رزم نامۂ انیس' کے عنوان سے مسعود حسن رضوی نے مرتب کیا تھا، اور خورشید الاسلام کی بیگم مسعودہ سے غالب کے بہت سے خطوط (یعنی محی الدین قادری زور کا انتخاب ''روحِ غالب'') اور نذیر احمد کا ناول ''ابن الوقت'' پڑھا۔ پھر وقتاً فوقتاً چونکہ مجھے نذیر احمد سے خاص دلچسپی تھی میں نے ''مرآت العروس'' ''بنات النعش'' ''رویائے صادقہ'' ''فسانۂ مبتلا'' اور ''موعظۂ حسنہ'' کے کافی حصے پڑھے، لیکن اس سے بہت زیادہ پڑھنے کا موقع کم ہی مل سکا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ میں نے ایسی بعض چیزیں پڑھیں جو میرے طالب علم ابتدائی کورس ختم کرنے کے بعد آسانی سے پڑھ سکتے تھے۔ ابتدائی کورس کے بعد اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ اپنے عام الفاظ کے ذخیرے میں جلد از جلد اضافہ کریں۔ میں ایسی تحریروں کی تلاش میں تھا جو بالغوں کی دلچسپی کی ہوں لیکن جن کی اردو مشکل نہ ہو۔ بعضوں کو یہ پڑھ کے تعجب ہوگا کہ ایسی تحریریں مجھے سب سے زیادہ خواجہ حسن نظامی کی ان کتابوں میں ملیں جو انھوں نے اپنی بیوی کے لیے لکھی تھیں۔ موضوعات دلچسپ' زبان نہایت سلیس' اور خالص دہلوی محاورے۔ ان میں بعض ایسے موضوعات تھے جن کے ذریعے سے انگریز طالب علموں کو یہ دیکھنے کا موقع ملتا تھا کہ انگریز اور ان کا طرزِ زندگی دوسروں کی نظر میں کیسا دکھائی دیتا تھا۔ مثال کے طور پر انگریزوں کی شادیاں' اور انگریزوں کے بادشاہ کے اختیارات اور مجبوریاں۔ آج بھی خواجہ حسن نظامی کا مقام میری نظر میں اردو نثر نگاروں کی پہلی صف میں ہے۔

دوسری طرف انگریزوں کو اردو ادب سے روشناس کرنے کا کام میرے سامنے تھا۔ اور اس کام کی وجہ سے بھی مجھے اپنے اردو ادب کے مطالعے کو محدود رکھنا پڑا۔ بہت عرصے تک ضروری تھا کہ میں صرف وہ چیزیں پڑھوں جو اس کام سے متعلق تھیں۔ 1969 سے کچھ پہلے میں نے خورشید الاسلام کے تعاون سے Three Mughal Poets اور Ghalib, Life and Letters لکھیں۔ Three Mughal Poets میں میرؔ سودا اور میر حسن کا ذکر ہے لیکن یہاں بھی میرا مطالعہ خورشید صاحب کے انتخاب تک محدود تھا۔ انھوں نے میر کے پورے کلام کا مطالعہ کیا' اور کئی بار کیا، اور پھر ان مثنویوں اور غزلوں کے اشعار منتخب کیے جو ہمارے مطلب کے تھے۔

سودا کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ سودا کی ہجویہ شاعری پر اکتفا کریں گے۔ خورشید صاحب نے سب پڑھی اور انتخاب کیا۔ میں نے صرف وہ انتخاب پڑھا۔ غالب کی جب باری آئی تو تقسیم کار اس سے مختلف تھی۔ غلام رسول مہر کے "خطوطِ غالب" اور آفاق حسین آفاق کا مرتب کیا ہوا مجموعہ "نادراتِ غالب" میں نے شروع سے آخر تک پڑھے اور خود انتخاب کیا۔ اسی طرح حالی کی "یادگارِ غالب" اور شیخ محمد اکرام کی "حیاتِ غالب" میں نے پڑھیں اور انتخاب کیا۔ خورشید صاحب کے حصے میں "مکاتیبِ غالب" فارسی خطوط اور "دستنبو" آئے۔ کافی عرصے کے بعد ہم نے اکبر الہ آبادی والا مضمون لکھا تو ہم نے کام کا وہی طریقہ اختیار کیا جو میر کے سلسلے میں کیا تھا، اور غالب کی شاعری کا انتخاب اور ترجمہ بھی اسی طرح کیا۔ اس بیان سے آپ کو پتہ چلے گا کہ میں نے کتنا پڑھا اور (اس سے زیادہ) کتنا نہیں پڑھا۔

کاش میں اس سے زیادہ پڑھ سکتا، لیکن دوسرے کاموں میں برابر مصروف رہنے کی وجہ سے مجھے اس کا موقع نہیں مل سکا۔ اس لیے جب لوگ میرے بارے میں کہتے ہیں یا لکھتے ہیں کہ میں نے "اردو کے تمام ادب کو گہرائی سے پڑھا" (یہ الفاظ میں نے بھوپال کے ایک اخبار "ندیم" مورخہ ۸ مارچ ۱۹۹۸ سے نقل کیے ہیں) تو مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے۔ مجھے بننے سے سخت نفرت ہے۔ من آنم کہ من دانم اور میں چاہتا ہوں کہ میری تعریف میں (جس سے ظاہر ہے مجھے خوشی ہوتی ہے!) صرف وہ باتیں لکھی جائیں جو بالکل صحیح ہوں۔

اسی طرح یہ بات مجھے پسند نہیں کہ لوگ خواہ مخواہ مجھے "ڈاکٹر" یا "پروفیسر" بنائیں۔ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی نہیں کی، اور کیوں نہیں کی۔ رہا پروفیسر کا خطاب، جو کام میں نے شروع ہی سے سنبھالنے کا فیصلہ کیا وہ (جیسے مجھے معلوم تھا کہ ہوگا) ایسا تھا کہ اس کے ساتھ میں وہ کام نہیں کر سکتا تھا جس کی بنا پر آپ پروفیسر شپ کے عہدے پر پہنچ سکتے ہیں۔ (یہ اور بات ہے کہ ہندوپاک میں۔ اور غالباً امریکا میں۔ ہر وہ شخص پروفیسر کہلاتا ہے جو کسی کالج میں پڑھاتا ہے اور میں لوگوں کو مجھے پروفیسر کہنے سے منع کرنے کی کوشش کبھی کی چھوڑ چکا ہوں۔)

چند سال پہلے میں نے ایک کافی طویل مضمون شائع کیا تھا جس میں ہندوستان میں آزادی کے بعد سے اردو کی صورتِ حال پر تبصرہ کیا تھا۔ یہ مضمون ہندوستان کے مختلف رسالوں میں چھپا اور اس کا اردو ترجمہ بھی بعض رسالوں میں چھپا۔ جب میں یہ مضمون لکھ رہا تھا تو خیال آیا کہ ہندوستان میں اردو کی صورتِ حال کا مقابلہ پاکستان میں اردو کی صورتِ حال سے کیا جائے۔ پھر میں نے سوچا کہ میں ہندوستانیوں کے لیے لکھ رہا ہوں اور مجھے یہ تاثر نہیں دینا چاہیے کہ میں ہندوستانیوں کی مذمت اور پاکستانیوں کی تعریف کر رہا ہوں۔ میرا یہ مضمون پاکستان میں بھی چھپا اور مجھے اس خیال سے تھوڑی سی پریشانی ہوئی کہ جس مضمون میں ہندوستانیوں پر تنقید کی گئی ہے شاید پاکستانی اسے پڑھ کر بہت خوش ہوں گے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہندوستانی پاکستان کی کچھ تعریف سن کر ناراض ہوں، اور نہ یہ چاہتا تھا کہ پاکستانی ہندوستانیوں کی مذمت پڑھ کر خوش ہوں۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے میں نے سوچا کہ مجھے محتاط طریقے سے لکھنا چاہیے۔

خیر، اب میں پاکستان میں اردو کی صورتِ حال کے بارے میں لکھتا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ اردو پاکستان کی قومی زبان قرار دی گئی ہے جیسے کہ ہندوستان میں ہندی راشٹر بھاشا قرار دی گئی ہے۔ لیکن اردو حقیقتاً پاکستان کی قومی زبان ہے جبکہ ہندوستان میں ہندی کی یہ حیثیت نہیں ہے۔ پاکستان میں اردو صرف ان خاندانوں کی مادری زبان ہے جو تقسیم کے بعد ہندوستان سے یہاں آئے تھے، لیکن پھر بھی پاکستان کے ہر صوبے میں عام لوگ اردو بولتے ہیں حالانکہ ان کی مادری زبانیں مختلف ہیں۔ ان کو اپنی مادری زبانوں کے لیے اردو سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا اور اردو کے قومی زبان ہونے میں انہیں کوئی مضائقہ نہیں محسوس ہوتا۔ اس کے برخلاف، ہندوستان کی بعض ریاستوں کے لوگ ہندی کو قومی زبان (راشٹر بھاشا) ماننے میں اعتراض کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ ان کی اپنی زبانیں ہر طرح سے مکمل ہیں اور صدیوں سے ادبی زبانیں بن چکی ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے ایک اور بات نوٹ کی ہے وہ یہ کہ ہندوستان میں جو لوگ انگریزی اخبار پڑھتے ہیں وہ کسی اور ہندوستانی زبان کے اخبار نہیں پڑھتے۔ دوسری طرف پاکستان میں جو لوگ انگریزی اخبار پڑھتے ہیں وہ اردو اخبار بھی پڑھتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ بھی اس بات کی علامت ہے کہ اردو واقعی پاکستان کی قومی زبان ہے۔

اب میں پاکستانی حکومت کا اردو کے بارے میں جو طرزِ عمل رہا ہے اس کے بارے میں اپنے خیالات پیش کرتا ہوں۔ میرے خیال میں پاکستان کا حکمران طبقہ انگریزی کو اولیت دینا چاہتا ہے اور انگریزی کی جو حیثیت آزادی سے پہلے تھی اس کو قائم رکھنا چاہتا ہے لیکن چونکہ اردو پاکستان کی قومی زبان قرار دی گئی ہے اس لیے دکھانے کے لیے اردو کی سرپرستی کرتا ہے جس کی ایک مثال "مقتدرہ قومی زبان" کا قیام ہے۔ ("مقتدرہ" مجھے ہمیشہ سے بڑا عجیب و غریب لفظ معلوم ہوا ہے اور یہ لفظ بجائے خود اس بات کی مثال ہے کہ جو زبان "مقتدرہ" رائج کرنا چاہتا ہے وہ صحیح معنوں میں اردو ہے نہیں۔)

دوسری طرف خود "مقتدرہ" اسی بے دلی سے اور دکھانے کے لیے اردو کا کام کر رہا ہے جو خود اس کو قائم کرنے والی حکومت کا شعار رہا ہے۔ مثال کے طور پر اگر "مقتدرہ" چاہتا تو فی الواقع اردو کو وسعت دیتے اور اسے فی الواقع ملک کی قومی زبان بنانے کے سلسلے میں اہم کام کر سکتا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں اس نے جو پالیسی اختیار کی ہے اس سے اردو کا کچھ بھلا نہیں ہونے والا۔ مثال کے

طور پر انگریزی زبان کے جو لفظ اب اردو میں مستقلاً رائج ہو چکے ہیں (سوشیالوجی، اینتھرپالوجی، وغیرہ) ان کے بجائے بالکل نامانوس لفظ جیسے ''عمرانیات'' کو رائج کرنے کی کوشش مضحکہ خیز ہی نہیں بلکہ سخت نقصان دہ بھی ہے۔ میں نے ابھی ''قومی انگریزی اردو لغت'' میں دیکھا، جسے ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایڈٹ کیا اور ''مقتدرہ'' نے شائع کیا ہے، کہ ''سوشیالوجی'' کا اردو ترجمہ ''عمرانیات'' دیا گیا ہے اور ''اینتھروپالوجی'' کا ''بشریات'' حالانکہ ''سوشیالوجی'' کا صحیح اردو ترجمہ ''سوشیالوجی'' ہے اور ''اینتھرپالوجی'' کا ''اینتھرپالوجی''۔ یہ بری روایت اصل میں عثمانیہ یونیورسٹی کے ''دارالترجمہ'' نے قریب قریب ایک صدی پہلے قائم کی تھی، جس کا نظریہ یہ تھا کہ عربی اور فارسی کے سوا اردو کو کسی ''غیر ملکی'' یا ''غیر اسلامی'' زبان کا کوئی لفظ اپنانا نہیں چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ زبان بھی اس کے ترجمے آسانی سے نہیں پڑھ سکے۔ لوگ اکثر مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ (مثال کے طور پر) عثمانیہ والے ''نیدر لینڈز'' کا ترجمہ ''زیرستان'' کرتے ہیں۔

پاکستان میں ایسے ادارے ہیں جنھوں نے کسی خاص سرکاری امداد کے بغیر اردو کی کافی خدمت کی ہے۔ ان میں سرفہرست ''مجلس ترقی ادب'' ہے جس کے پہلے سربراہ امتیاز علی تاج تھے اور غالباً یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ''مجلس'' نے اردو کے سارے کلاسیکی ادب کے مستند ایڈیشن شائع کیے۔ اس کا مقابلہ آپ ہندوستان سے کیجیے۔ حال ہی میں میں اپنی ۱۹۵۸ کی ڈائری پڑھ رہا تھا جب میں دوسری بار سال بھر کے لیے سٹڈی لیو پر ہندوستان گیا تھا۔ اس میں لکھا ہے کہ میں نے علیحدہ علیحدہ خواجہ احمد فاروقی، عبدالعلیم، عابد حسین، اور سجاد ظہیر سے، جو اس زمانے میں ''انجمن ترقی اردو ہند'' کے ''بڑے آدمی'' تھے، بات کی اور اس پر اصرار کیا کہ ''انجمن'' کا مقدم کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ اردو کے کلاسیکی ادب کے مستند متن (text) شائع کرے۔ سب نے ہاں میں ہاں ملائی لیکن آج تک ''انجمن'' نے یہ کام نہیں سنبھالا۔ اس سلسلے میں مجھے یاد ہے کہ جب غالب کی صد سالہ برسی منائی گئی تو ''مجلس'' نے غالب کی ساری تصانیف (فارسی کی بھی اور اردو کی بھی) کئی جلدوں میں شائع کیں۔ انھیں دنوں میں پنجاب یونیورسٹی نے بھی یہی کیا۔ پھر کراچی میں ایک بالکل غیر سرکاری ادارہ جس کا نام ''ادارۂ یادگارِ غالب'' تھا اور جسے مرزا ظفر الحسن اور فیض احمد فیض نے قائم کیا تھا' تو اس نے بھی انھیں دنوں میں غالب کے بارے میں کتابچوں کا ایک سلسلہ شائع کیا جس میں غالب کے حالات پاکستان کی مختلف زبانوں میں بیان کیے گئے۔ پاکستانی حکمران غالب کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ سارا زور اقبال پر دیا جاتا ہے۔ اس صورت حال کا مقابلہ آپ ہندوستان سے کیجیے۔ غالب کی صد سالہ برسی حکومتِ ہند کی سرپرستی میں مالی امداد سے بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ حکومتِ ہند مختلف اردو اداروں کو کافی مالی امداد دیتی ہے مثلاً ''انجمن ترقی اردو'' کو اس زمانے میں آلِ احمد سرور مرحوم ''انجمن'' کے کرتا دھرتا تھے۔ ۱۹۶۵ میں جب میں علی گڑھ میں تھا، میں نے سرور صاحب سے کہا کہ غالب کی صد سالہ برسی آنے والی ہے ''انجمن'' کو اس کے لیے ابھی سے تیاریاں کرنی چاہئیں۔ اور سب سے اہم کام یہ ہوگا کہ وہ غالب کی ساری تصانیف عمدہ طریقے سے شائع کریں۔ انھوں نے مجھ سے اتفاق کیا، لیکن ''انجمن'' نے اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کیا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں کافی بڑے پیمانے پر سرکاری امداد کے باوجود اردو والے کوئی ٹھوس کام نہیں کرتے جبکہ پاکستان میں بڑی حد تک سرکاری امداد کے بغیر اردو کی بڑی خدمت کی جا رہی ہے۔

جیسا آپ کو معلوم ہے میں یہ کتاب قسطوں پر لکھ رہا ہوں۔ ہر قسط لکھنے کے بعد میں اسے خالد حسن قادری صاحب کو تصحیح کے لیے بھیجتا ہوں۔ پچھلی قسط جب واپس آئی تو میں نے دیکھا کہ ایک جگہ حاشیے میں قادری صاحب نے کچھ لکھا ہے جہاں میں نے لکھا تھا، ''ریڈر پروفیسر کا خطاب، جو کام میں نے شروع ہی سے سنبھالنے کا فیصلہ کیا وہ۔۔۔ ایسا تھا کہ اس کے ساتھ وہ کام نہیں کر سکتا تھا جن کی بنا پر آپ پروفیسر شپ کے عہدے پر پہنچ سکتے ہیں۔'' مجھے ان کی اس بات سے پورا اتفاق ہے لیکن یہ SOAS کے ماحول کی تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ پہلے اس خوشامد کے بارے میں مجھے یہ کہنا چاہیے کہ آپ کا کام زبانی خوشامد سے زیادہ علمی خوشامد سے چلتا تھا۔ مطلب یہ کہ اگر آپ ترقی کرنا چاہتے تھے تو آپ صرف وہ کام کرتے تھے جو آپ کا صدر شعبہ اور دوسرے اربابِ حل و عقد سمجھتے تھے کہ آپ کو کرنا چاہیے، اور آپ وہی تعصبات اپنے اندر پیدا کرتے تھے جو ان کے تھے۔ ان میں سب سے اہم یہ تھے: مقدم کام تحقیق ہے اور وہ بھی ایسی تحقیق جو کسی عملی کام کے لیے کسی طرح مفید نہ ہو۔ ان کے نزدیک بہترین تحقیقی مضمون وہ تھا جسے آپ کے علاوہ مشکل سے تین یا چار آدمی سمجھ سکیں۔ آپ کو پڑھائی کی کوئی خاص پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اگر آپ کسی جدید زبان کے لیکچرر ہوں تو اس زبان پر اپنا عبور محدود رکھیے۔ پڑھنے کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن زبان روانی سے بولنا اور اپنے طالب علموں سے یہ توقع کرنا کہ وہ بھی روانی سے بولنا سیکھیں، یہ شرافت سے بعید ہے۔ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ آزاد ملک ہے جمہوری ملک ہے ہر شخص کا حق ہے کہ وہ اپنی بات سوچے اور اس کا اظہار بھی کرے۔ جہاں تک SOAS کا معاملہ ہے' اس میں آپ آزاد تو تھے، لیکن آپ کو اپنی آزادی کی قیمت بھی ادا کرنی ہوتی تھی۔ بلکہ اگر میں کہوں کہ اس کی سزا بھگتنی پڑتی تھی تو بے جا نہیں ہوگا۔ لیکچرروں کی بڑی اکثریت یہ سزا بھگتنے کے لیے تیار نہیں تھی اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ خاموشی بہتر ہے۔ رہی جمہوریت، ملک میں جمہوریت ہو نہ ہو، SOAS میں اگر تھی تو نہایت محدود۔ ڈائریکٹر، سیکرٹری اور صدر شعبہ۔ ہر ایک اپنے میدان میں مختارِ کل تھا اور اپنے اقتدار کو

قائم رکھنے کی خاطر بعض اوقات وہ بے ایمانیاں کرتا اور وہ جھوٹ بولتا کہ خدا کی پناہ اس کی تفصیل میں نے ایک کتابچے ORIENTAL DESPOTISM میں (جو تقریباً ۹۰۰۰ الفاظ پر مشتمل تھا) بیان کی ہے۔ اس کے شائع ہونے کے کچھ ہی دن بعد ایک امریکی خاتون Wendy O'Flaherty جو اس زمانے میں سنسکرت پڑھاتی تھیں مجھے برآمدے میں ملیں۔ مسکرا کے مجھ سے پوچھا، "Ralph, don't you want to be a professor?" (''رالف، کیا آپ پروفیسر بننا نہیں چاہتے؟'') میں نے کہا کہ مجھے اس کی کوئی خاص پرواہ نہیں تو ہنس کے کہا، "That figures" (''اب بات سمجھ میں آتی ہے!'')۔

لیکن اب SOAS کے بارے میں اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جتنا اب تک میں نے لکھا ہے آپ اس کو کتاب کی تمہید سمجھئے جو اس لیے لکھی گئی کہ آپ سمجھ سکیں کہ میں نے کس ماحول میں اردو کی خدمت کرنے کی کوشش کی ہے۔

جب میں نے SOAS میں اردو پڑھنی شروع کی تو میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔ ہندوستان میں میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ اور اپنے دو ساتھی ہندوستانی افسروں کے ساتھ (محمد نواز خان، جو پٹھان تھے، اور گوپال سنگھ، جو سکھ تھے) برابر اردو بولتا رہا تھا اور سمجھتا تھا کہ مجھے اردو اچھی خاصی آتی ہے۔ ایک حد تک یہ ٹھیک بھی تھا، لیکن میں اردو ادب سے بالکل ناواقف تھا۔ البتہ ایک خاص قسم کی ادبی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت تھی۔ وہ اس طرح کہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے ۱۹۴۲ کے بعد مارکس اور اسٹالن کی بعض تصانیف کے اردو ترجمے شائع کرنے شروع کیے تھے اور میں نے ان میں سے بعضوں کو ڈکشنری کی مدد سے پڑھا بھی تھا۔ پھر بھی جب اردو ادب کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے کافی صدمہ پہنچا، اور فوراً احساس ہوا کہ مارکسزم کی زبان اور اردو ادب کی زبان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اتفاق سے سب سے پہلے مجھے نذیر احمد کی ''توبۃ النصوح'' پڑھنی پڑی جس کے پہلے باب کی زبان بہت سے اردو والوں کے لیے بھی کافی مشکل ہے۔ چند جملے پڑھتے ہی میں نے محسوس کیا کہ ''ہنوز دلی دور است'' اور یہ کہ تین سال پڑھنے کے بعد اردو میں فرسٹ کلاس آنرز لانا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔ خیر میں کافی محنت کرتا رہا اور مجھے فرسٹ کلاس مل ہی گیا۔

اس قسم کی خوش فہمی سنسکرت کے بارے میں بھی تھی جسے میں نے اپنے ضمنی مضمون کے طور پر اختیار کیا تھا۔ کیمبرج میں میں نے لاطینی اور قدیم یونانی پڑھی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ دونوں زبانیں گویا سنسکرت کی بہنیں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اس کا مطالعہ بھی میرے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ لیکن یہ اندازہ بھی غلط نکلا۔ لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دوں کہ ان دنوں میرا خیال تھا کہ اردو اور سنسکرت پڑھنے کے بعد شمالی ہند کی دوسری زبانیں سیکھنے میں کوئی خاص مشکل نہیں ہوگی۔ جب میں نے ان ساری خوش فہمیوں کو دور کیا اور صحیح صورتِ حال سے واقف ہو گیا تو میں نے پوری تندہی کے ساتھ اپنی مشکلات کا سامنا کیا اور تین سال کی مستقل محنت کے بعد (جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے) فرسٹ کلاس میں بی۔اے۔ آنرز کا امتحان پاس کر لیا۔

یہاں میں اردو کے اس نصاب کے بارے میں کچھ اور بتانا چاہتا ہوں جو اس زمانے میں رائج تھا۔ شاعری میں ایک ہی کتاب مقرر تھی۔ اس کا عنوان تھا ''نظم منتخب'' اور یہ کتاب آزادی سے پہلے کی انڈین آرمی کے ان انگریز افسروں کے لیے مرتب کی گئی تھی جو اردو پڑھنا اور انڈین آرمی کے اردو امتحانات دینا چاہتے تھے۔ کتاب ویسے بری نہیں تھی۔ اس میں ولی کے زمانے سے لے کر اکبر الٰہ آبادی کے زمانے تک کے بڑے بڑے شعرا کے کلام کا انتخاب تھا۔ بعض لمبی نظمیں پوری کی پوری اس میں شامل تھیں۔ مثال کے طور پر میر انیس کا مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' اور حالی کا مسدس۔ اکبر کے بعد کے کسی شاعر کا انتخاب اس میں نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ کتاب ۱۹۰۹ میں مرتب کی گئی تھی۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت تھی جس پر مجھے ہنسی آتی۔ وہ یہ کہ اس میں کوئی ایسا شعر نہیں تھا جس میں انگریزوں پر تنقید کی گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ اکبر کے سب سے زیادہ جاندار اشعار اس میں ناپید تھے۔ مجھے یہ جان کر بڑا تعجب ہوا کہ SOAS کے نصاب میں اقبال کی بھی کوئی نظم نہیں تھی۔ اس زمانے میں یہ عام اصول تھا کہ کسی انتخاب میں ایسے شاعر یا ادیب کی تصنیف نہیں ہونی چاہیے جو اس وقت زندہ ہو۔

لیکن اقبال کی وفات نو سال پہلے ہو چکی تھی۔ جب میں نے اپنے ہندوستانی دوستوں کو یہ بتایا تو ان کو بجا طور پر حیرت ہوئی۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے۔ میرے استاد A.H.Harley تھے اور انھوں نے نصاب میں صرف وہی کتابیں رکھی تھیں جو انھوں نے خود ایک پرانے استاد سے پڑھی تھیں جسے وہ ہمیشہ "My old munshi" کے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ میں ہارلی صاحب کے پہلو میں بیٹھا ''نظم منتخب'' پڑھتا تھا۔ اس کے حاشیے بہت چوڑے تھے اور وہ تمام ان نوٹس سے بھرے ہوئے تھے جو "My old munshi" نے لکھائے ہوں گے۔ میں اس بات کو ثابت تو نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی مجھے یقین ہے کہ ہارلی صاحب کوئی کتاب، کوئی نظم، یا کوئی شعر نہیں پڑھا سکتے تھے جسے "My old munshi" نے ان کو نہ پڑھایا ہو۔ اس بات کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ جب میں نے ہارلی صاحب کو بتایا کہ میں نصاب میں اور چیزیں شامل کرنا چاہتا ہوں تو انھوں نے فوراً کہا، ''مگر ان نئی چیزوں کو آپ کیسے پڑھائیں گے؟'' میں نے کہا کہ جب کوئی بات میری سمجھ میں نہ آئے گی تو میں بنگرای سے اس کی تشریح کرنے کو کہوں گا۔ میرے اس جواب

سے ان کو تعجب ہوا لیکن وہ خاموش رہے۔ (بلگرامی کا ذکر آگے چل کے آئے گا۔)

نثر کی کتابوں کی ایک نامکمل فہرست میں پہلے دے چکا ہوں۔ ان کے علاوہ رتن ناتھ سرشار کے "فسانۂ آزاد" کا ایک چھوٹا سا انتخاب تھا جس کا عنوان "آزاد کے کارنامے" رکھا گیا تھا۔ اسی طرح کا ایک دوسرا انتخاب "خوجی کے کارنامے" تھا، لیکن وہ ہمارے نصاب میں نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ "آزاد" اور "خوجی" کی یہ علیحدگی طالب علموں کے لیے مفید نہیں تھی، بہر حال۔

ہارلی کے علاوہ دو استاد تھے جنھوں نے مجھے پڑھایا۔ Captain A.R. Judd اور حامد حسن بلگرامی۔ جڈ صاحب ایک علیحدہ مضمون کے مستحق ہیں۔ ("Urdu and I" میں ان کا ذکر زیادہ تفصیل سے ہے اور شان الحق حقی نے بھی ان کے بارے کچھ لکھا ہے) یہاں صرف ایک واقعہ بتانا چاہتا ہوں جس سے ان کی ایک خصوصیت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ مجھے "فسانۂ آزاد" کا وہ انتخاب پڑھا رہے تھے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔ اس کی زبان سے وہ بے حد محظوظ ہوتے تھے اور بار بار پوچھتے "یہ بہت ہی اچھی کتاب ہے۔ کس نے لکھی؟" میں بتاتا رہا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ سرشار کا نام ان کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ اگر اردو ادب سے دلچسپی ہوتی تو ظاہر ہے انھیں معلوم ہوتا کہ سرشار کون تھا۔ مگر واقعہ یہ تھا کہ ان کو صرف زبان سے دلچسپی تھی، اور خود کہتے تھے کہ "مجھے اردو کے محاوروں اور ضرب الامثال سے دلچسپی ہے" لیکن زبان پر وہ عبور تھا جو میں نے کبھی کسی اور انگریز میں نہیں دیکھا۔

حامد حسن بلگرامی ایک عہدے پر مقرر تھے جسے SOAS کی اصطلاح میں Overseas Lecturership کہتے تھے۔ خدا جانے ان کا تقرر کیسے ہوا تھا۔ انھوں نے کبھی کسی یونی ورسٹی میں نہیں پڑھایا تھا۔ SOAS آنے سے پہلے وہ ڈون اسکول دہرہ دون میں پڑھاتے تھے اور ان کی واحد تصنیف ایک چھوٹی سی کتاب "خلاصہ نگاری" تھی جو انھوں نے اسکول کے طالب علموں کے لیے مرتب کی تھی۔ ادب کا مطالعہ کافی محدود تھا۔ فیض کو وہ ہمیشہ "فیض محمد فیض" کہتے تھے اور اقبال کے متعلق ایک دفعہ کہا (انگریزی میں) "Some mature minds consider that it is too soon to write about him. I myself have not written about him." ہارلی کا رویہ ان دونوں استادوں کے ساتھ بالکل انگریزی راج کے پرانے انگریزوں کا تھا۔ سمجھتے تھے کہ چونکہ ان کا عہدہ ان دونوں سے برتر ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہر معاملے میں اپنی برتری کا اظہار کریں۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے کہا "جب کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئے گی تو میں بلگرامی سے پوچھوں گا" تو ان کو تعجب ہوا۔ سمجھے ہوں گے کہ کسی ہندوستانی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرنا کسی انگریز کے شایانِ شان نہیں۔ رہے جڈ، تو ہارلی کی نظر میں ان کی کوئی خاص حیثیت نہیں تھی۔ وہ ایک معمولی گورے سپاہی بن کر ہندوستان گئے تھے اور صرف دوسری عالمی جنگ کے غیر معمولی حالات کی بنا پر کپتان بنا دیے گئے تھے۔ انھوں نے کبھی اعلیٰ تعلیم نہیں پائی تھی۔ بی۔بی۔سی والی انگریزی نہیں بول سکتے تھے اور ان کا لب و لہجہ خاص Norfolk کا تھا جہاں وہ پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے۔ ہارلی کی نظر میں قابلِ قدر صرف ان کا اردو پر حیرت انگیز عبور تھا اور بس۔ اس میں ہارلی کا اور ان کا کوئی مقابلہ نہیں تھا، لیکن ہارلی کے لیے اس بات کا اعتراف ممکن ہی نہیں تھا۔ ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ جڈ مجھے پڑھا رہے تھے کہ ہارلی کمرے میں داخل ہوئے۔ دسمبر کی چھٹیاں شروع ہونے والی تھیں اور ہارلی نے مجھ سے پوچھا "آپ چھٹیوں میں پڑھتے رہیں گے؟" میں نے کہا "جی ہاں، میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں مسلسل کام کرتا رہوں گا تو کافی ترقی کر سکتا ہوں۔" ہارلی نے کہا 'مسلسل' نہیں 'سلسلے وار'۔" ان کے جانے کے بعد جڈ نے کہا کہ "ان سے نہ کہیے گا، مگر 'مسلسل' ہی ٹھیک تھا۔"

خیر، یہ تھیں میرے استادوں کی کوتاہیاں۔ لیکن ان کوتاہیوں کے مقابلے میں تینوں کی خوبیاں کہیں زیادہ تھیں۔ ہارلی بیچارے بوڑھے ہو گئے تھے اور لندن سے کافی دور رہتے تھے لیکن اپنے آرام کی فکر بالکل نہیں کرتے تھے۔ یونیورسٹی کی تعطیلوں میں بھی وہ نہ صرف خود SOAS پڑھانے آنے کے لیے تیار تھے بلکہ یہ بھی چاہتے تھے کہ میں بھی وہاں آؤں اور ان سے پڑھوں۔ اور عام طور پر میں آتا تھا۔ جڈ نے مجھے اتنی اردو سکھائی کہ کوئی دوسرا انگریز نہیں سکھا سکتا تھا۔ بلگرامی نے بھی پڑھانے میں بڑی محنت کی اور جیسے انگریزی میں کہتے ہیں out of the way جا کے میری مدد کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ جب میں ۱۹۴۹ میں لیکچرر مقرر ہوا اور ہندوستان اور پاکستان جانے کی تیاریاں کر رہا تھا تو انھوں نے مجھے ذاکر حسین، احتشام حسین، مولوی عبدالحق اور بعض دوسرے "بڑے آدمیوں" کے نام تعارفی خط لکھ کر دیے، جس سے مجھے بڑی سہولت ہوئی۔

یونیورسٹی کے استادوں کے علاوہ میرے بعض ہندوستانی دوستوں نے میری بہت مدد کی۔ ہمیشہ سے میرا خیال ہے کہ جب تک آپ اردو روانی سے اور اچھی خاصی صحت کے ساتھ نہ بول سکیں یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آپ کو اردو آتی ہے۔ اس لیے میں نے اردو میں گفتگو کرنے کی مشق کرنی چاہی۔ دو اردو داں، بلکہ 'اہلِ زبان' دوستوں نے باقاعدہ ملاقاتیں کر کے اس میں میری مدد کی۔ ایک حیدرآباد دکن کی خاتون سردار مجوب اور ایک یو۔پی کے صاحب مقبول احمد جو بعد میں علی گڑھ میں پروفیسر ہو گئے۔۔۔

اس کے بعد اردو سیکھنے کے عمل کی (محدود معنوں میں) تکمیل

۱۹۵۰ء-۱۹۴۹ میں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ''تکمیل'' کی منزل کبھی نہیں آتی، لیکن اس تعلیمی رخصت کے ایک سال میں میر اروانی سے اردو بولنا جاری رہا اور میرے اردو الفاظ کے ذخیرے میں بھی خاصا بڑا اضافہ ہوا۔

اب میں تاریخ کی ترتیب کو چھوڑ کر علیحدہ علیحدہ موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہوں گا جو وقتاً فوقتاً ذہن میں آتے رہتے ہیں۔

ان قریب قریب ساٹھ سال کے دوران جن میں مجھے زیادہ سے زیادہ اردو سمجھنے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کا تجربہ رہا ہے میں نے محسوس کیا ہے کہ اردو زبان اور اردو تحریر کے اسلوب میں بعض باتیں ہیں جن کو میں نے کسی دوسری زبان میں نہیں دیکھا۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

(۱) مبالغہ۔ اردو والوں کے مزاج میں ایک قسم کی انتہا پسندی ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ میرے انگریزی مضامین کے مترجموں نے اکثر میرے محتاط بیانات کا ترجمہ ایسے جملوں میں کیا ہے جن میں میری احتیاط کی بو تک نہیں آتی۔ ایسے ترجموں کو غلط کہنا غالباً زیادہ صحیح نہیں ہوگا کیوں کہ اردو کا محاورہ یہی ہے (حالانکہ میں ان جملوں میں ترمیم کرنا ضروری سمجھتا ہوں!)۔

(۲) اردو لکھنے میں لکھنے والا عام طور پر ایسی تکلف کی زبان لکھنا پسند کرتا ہے جو میرے نزدیک نہ ضروری ہے نہ مناسب۔ بہت سے لکھنے والے فارسی کے استعمال سے اپنی تحریر میں ایک خاص شان پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اکثر پڑھنے والے غالباً سمجھتے ہیں کہ اس سے واقعی ایک خاص شان پیدا ہوتی ہے۔ ان کو یہ بات پسند ہے اور مجھے بالکل پسند نہیں! جب آپ ''اس کے علاوہ'' لکھ سکتے ہیں تو خواہ مخواہ ''علاوہ ازایں'' کیوں لکھتے ہیں؟

حال ہی میں ایک صاحب نے مجھے خط میں لکھا ہے ''آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا'' اگر اس کے بجائے وہ لکھتے ''آپ کا خط ملا'' تو اس میں کیا برائی ہوتی؟ (اسی بات کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔) اس کے علاوہ (''علاوہ ازایں'') ایک اور بات ہے۔ بعض لوگوں کو اپنی فارسی دانی کی نمائش کرنے کا بڑا شوق ہے اور یہ جانتے ہوئے کہ اب کم لوگ ہیں جنہیں فارسی آتی ہے جان بوجھ کے فارسی کے اشعار نقل کریں گے۔ خیر! اگر آپ کو کسی موقعے پر کسی فارسی شعر کو نقل کرنا موزوں معلوم ہوتا ہے تو ضرور نقل کیجیے، مگر اس کے ساتھ اردو ترجمہ بھی دیجیے تاکہ لوگ آپ کا مطلب سمجھ سکیں۔ جو ترجمہ نہیں دیتے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں یہ مکالمہ ہو رہا ہے:

سوال: کیا آپ اس کا ترجمہ کر سکتے ہیں؟

جواب: (جھوٹے تعجب کے ساتھ) اچھا؟ آپ کو فارسی نہیں آتی؟ معاف کیجیے، میں سمجھتا تھا کہ ہر پڑھا لکھا آدمی فارسی جانتا ہے۔

(ویسے اردو والوں پر کچھ موقوف نہیں۔ بہت سے انگریز مصنف اب بھی، اگرچہ پہلے کے مقابلے میں کم، اپنی تحریروں میں فرانسیسی اور لاطینی کے اشعار یا عبارتیں نقل کرتے ہیں حالانکہ خوب جانتے ہیں کہ وہ زمانہ کبھی کا گزر گیا جب تعلیم یافتہ انگریز یہ زبانیں جانتے تھے۔)

(۳) cliches کا استعمال۔ (پتہ نہیں کہ cliches کا اردو ترجمہ کیا ہوگا۔) cliches انگریزی میں ایسے لفظ کو کہتے ہیں جو سیدھے سادے الفاظ کے بجائے ذرا زیادہ اثر پیدا کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے اور جو ایک زمانے میں واقعی یہ اثر پیدا کرتے بھی تھے مگر اب بار بار استعمال ہونے کی وجہ سے اتنے پٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کو کوفت ہوتی ہے۔ ویسے یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انگریزی پڑھنے والے کو کوفت ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اردو پڑھنے والے یہ محسوس ہی نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر یہ لکھنے کے بجائے کہ کتاب ''چھپی ہے'' لوگ لکھیں گے کہ وہ ''زیور طبع سے آراستہ ہوئی''۔ یہ مجھے مضحکہ خیز الفاظ معلوم ہوتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اردو پڑھنے والوں کا یہ رد عمل بالکل نہیں ہوتا۔

(۴) اسی سے متعلق ایک اور بات ہے جسے میں نے اکثر دیکھا ہے۔ آپ کسی خاص موضوع پر مضمون یا کتاب لکھ رہے ہیں۔ اصل موضوع پر آنے سے پہلے آپ تمہید کے طور پر ایک ایسی بات بتانا ضروری سمجھتے ہیں جس سے آپ کا ہر قاری پہلے سے بہت ہی اچھی طرح واقف ہے۔ احتشام حسین کی ایک کتاب اردو زبان کے بارے میں ہے۔ کتاب اس وقت میرے پاس نہیں، لیکن اگر مجھے صحیح یاد آتا ہے تو اس کا پہلا جملہ ہے ''ہر بچہ کوئی نہ کوئی زبان بولتا ہے''۔ بھلا بتایئے، یہ کون نہیں جانتا کہ ''ہر بچہ کوئی نہ کوئی زبان بولتا ہے''؟ حال میں میں نے انڈیا کے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے رسالے ''اردو دنیا'' کے ایک شمارے میں ایک ڈکشنری پر تبصرہ پڑھا۔ اس کے پہلے پیراگراف میں قاری کو بتایا گیا ہے کہ ڈکشنری کس چیز کو کہتے ہیں اور اس کا مصرف کیا ہے۔ تبصرہ نگار سے یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ایسے مضمون کا پڑھنے والا نہیں جانتا کہ ڈکشنری کیا ہے اور اس کا مصرف کیا ہے؟

(۵) اردو میں اپنے قصور کا صاف صاف اعتراف کرنا محاورے کے خلاف ہے۔ اگر کسی صاحب کے خط کا جواب دینے میں بہت دیر ہو گئی ہو تو میں لکھوں گا، ''مجھے افسوس ہے کہ آپ کے خط کا جواب میں اس سے پہلے نہیں لکھ / دے سکا'' حالانکہ میں لکھ سکتا تھا، اور ایمانداری کا تقاضا تھا، لیکن ''میں نہیں لکھ / دے سکا'' نہیں، ''میں نے نہیں لکھا / دیا'' لکھنا چاہیے۔ لیکن یہ اردو کا محاورہ نہیں۔

جب سے میں اردو کی دنیا میں کچھ مشہور ہو گیا ہوں اکثر یہ ہوتا رہا ہے کہ ہندوستانی مصنف اپنی تصانیف میرے پاس اس خواہش کے ساتھ بھیجتے رہے ہیں کہ میں اپنی ''قیمتی رائے'' سے ان کو ''سرفراز کروں''۔ عام طور پر یہ بہت

جلد معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ میری ''حقیقی رائے'' کی توقع نہیں کرتے بلکہ اپنی تعریف سننا چاہتے ہیں۔ بعض یہ کہ جب انھیں معلوم ہوتا ہے کہ میری رائے ان کے حق میں نہیں تو ان کی نظر میں میری رائے کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔ عام طور پر یہ ہوا ہے کہ جن لوگوں نے اردو شاعری کا ترجمہ انگریزی میں کیا وہ انھوں نے میرے پاس بھیجا۔ جب میں نے اس کی تعریف نہیں کی تو وہ کافی ناراض ہو گئے۔ آگے چل کر میں کچھ ایسے واقعات بیان کروں گا جن سے معلوم ہو جائے گا کہ میرا اندازہ صحیح ہے۔ لیکن اس سے پہلے میں کچھ ترجمے کے مسائل کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات یہ ہے کہ آپ یہ عام قاعدہ مقرر کر سکتے ہیں کہ مترجم کی زبان وہ ہونی چاہیے جس میں وہ ترجمہ کر رہا ہے۔ میں نے ''عام قاعدہ'' اس لیے کہا کہ اس میں بعض مستثنیات ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر محمد عمر میمن کے انگریزی ترجمے اچھے ہیں حالانکہ میمن صاحب کی مادری زبان انگریزی نہیں ہے۔ (رسل صاحب کے حسنِ ظن کا شکریہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے کیے ہوئے تراجم پر کسی انگریزی داں سے ضرور نظر کروا لیتا ہوں۔ محمد عمر میمن) لیکن عام طور پر عمدہ ترجمہ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دو آدمی مل کر کام کریں۔ دونوں کو اردو اور انگریزی دونوں پر خاصہ عبور ہونا چاہیے اور ایک کی مادری زبان اردو ہونی چاہیے اور دوسرے کی انگریزی۔ بہت کم ہندوستانی مترجموں کو اس بات کا احساس ہے اور ان کے ترجمے عام طور پر انگریزی داں دنیا میں یعنی برطانیہ، امریکہ وغیرہ میں قابلِ قبول نہیں ہوتے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں ایسے ترجموں کو حقیر سمجھتا ہوں۔ ایسے ترجمے ہندوستان اور پاکستان میں پسند کیے جا سکتے ہیں کیونکہ ان ترجموں کی انگریزی اور ان کے قاریوں کی انگریزی یکساں ہے لیکن ہم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ترجمے انگریزی داں لوگوں میں نہیں چل سکتے۔ ان میں کچھ ایسی خامیاں ہوتی ہیں جن کا ذکر میں کرنا چاہتا ہوں۔

جن ترجموں کو میں نے دیکھا وہ عام طور پر غزلوں کے ترجمے ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں لیکن مترجموں کا عام خیال معلوم ہوتا ہے کہ ہر شعر کے ترجمے میں قافیہ ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ قافیے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں قافیہ اور ردیف وہی ہے جو مطلع میں ہے لیکن مطلع کو چھوڑ کے کسی شعر کے دونوں مصرعے آپس میں ہم قافیہ نہیں ہوتے اور عام طور پر جب لوگ کسی شعر کو نقل کرتے ہیں تو وہ شعر مطلع نہیں ہوتا۔ یہ قافیے کی تلاش عجیب و غریب نتیجے پیدا کرتی ہے۔ اول تو یہ کہ قافیے کی خاطر مترجم عام طور پر اپنے ترجمے میں کچھ الفاظ بڑھاتے ہیں جو اصل شعر میں کہیں نہیں ملتے۔ مثال کے طور پر داؤد رہبر کا ترجمہ دیکھیے۔ غالب کا شعر ہے:

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

اگر میری یادداشت دھوکہ نہیں دے رہی تو داؤد رہبر نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

How sweet your lips must be
I wish that I could taste that snack
My rival when you cursed him out
His tongue I saw him smack

دوسری اور چوتھی لائنیں صرف قافیے کی خاطر بڑھائی گئی ہیں ان کا مترادف اردو میں نہیں ہے اور چوتھی لائن میں اصل اردو مطلب بڑے مبالغے کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔ یہی ترجمہ ایک آدھ دوسری خامی کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ مترجم کو بالکل حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے ترجمے میں ایسی بات لکھے جو اصل اردو میں موجود نہیں ہے۔ اگر آپ سمجھیں کہ شعر کی تشریح کی ضرورت ہے تو آپ اس پر نوٹ لکھیے۔ ترجمے میں تشریح کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس شعر کی انگریزی انگریزی محاورے کے خلاف ہے۔ ''snack'' کا لفظ یہاں بالکل موزوں نہیں۔ اور انگریزی محاورے میں ''smack the tongue'' نہیں ''smack the lips'' کہتے ہیں۔

دوسری بڑی عام خامی یہ ہوتی ہے کہ مترجم سمجھتے ہیں کہ ترجمے میں ''poetic diction'' یعنی ''شاعرانہ اسلوب'' ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر آپ لکھیں کہ ''You have'' تو یہ شاعرانہ ترجمہ نہیں ہوگا۔ اس کے بجائے ''thou hast'' لکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ شعر کا اثر عام طور پر اس کے مفہوم سے پیدا ہوتا ہے، اس کے الفاظ سے نہیں۔ اور ''you have'' لکھنے سے اس کے اثر میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

تیسری بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ مترجموں کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ ترجمے میں صحیح ''رجسٹر'' (معلوم نہیں اردو میں اس کا کیا ترجمہ ہوگا) کا التزام ضروری ہے۔ یہ لفظ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ زبان کا اسلوب اس پر منحصر ہوتا ہے کہ آپ کس شخص سے گفتگو کر رہے ہیں۔ جو زبان دو بے تکلف دوست اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں وہ اس سے مختلف ہوتی ہے جو کوئی شخص کسی میٹنگ میں تقریر کرتے ہوئے استعمال کرتا ہے۔ یعنی ان دونوں زبانوں کے ''رجسٹرز'' مختلف ہوں گے۔ اکثر مترجموں میں ''رجسٹر'' کا صحیح احساس نہیں پایا جاتا۔ سنہ ۱۹٦۷ میں مجھے احمد علی کا ایک مسودہ بھیجا گیا جس میں انھوں نے اردو شاعری کا انتخاب اور انگریزی ترجمہ کیا تھا۔ اس میں دو ترجمے یہ ہیں:

The goods that you have loaded will
divided be

No daughter, son or even wife will care for
thee

اور

How long will you mourn the
brows arched gracefully?
Is not the head hung low a burden to thee?

لیکن پہلی لائن میں "You" لکھنا اور دوسری میں اس کے لیے "thee" لکھنا بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے کوئی انگریز ایسا ترجمہ قبول کر ہی نہیں سکتا۔ یہ دونوں نمونے اس بات کی مثال بھی پیش کرتے ہیں کہ ساری گڑبڑ قافیے کی تلاش نے پیدا کی ہے۔ دونوں میں "thee" صرف قافیے کی خاطر لایا گیا ہے۔

یہی خامی قرۃ العین حیدر کے ترجموں میں بہت نمایاں ہے۔ اُنھوں نے حسین شاہ کے ناول "نشتر" کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس میں جگہ جگہ ایسے انگریزی الفاظ لکھے ہیں جو بامحاورہ ضرور ہیں مگر ایسے موقعوں پر استعمال کیے گئے ہیں جہاں وہ بالکل موزوں نہیں۔ ایک نمونہ ہی کافی ہوگا۔ کسی نے ایک صاحب سے پوچھا کہ آپ نے کافی رقم ان لوگوں کو دی ہے؟ تو اس کے جواب میں ان صاحب نے کہا "They will get it tonight "knobs on" with knobs on" پڑھ کر ہنسی آئی۔ میں سوچتا ہوں کہ قرۃ العین حیدر دل میں کہتی ہوں گی کہ "دیکھیے مجھے کتنی بامحاورہ انگریزی آتی ہے" لیکن وہ یہ نہیں محسوس کرتیں کہ اس موقعے پر اس محاورے کی گنجائش بالکل نہیں۔ اس موقعے کے لیے یہ بالکل موزوں نہیں۔

کچھ سال پہلے مجھے ایک صاحب مشکور حسین یاد کا ایک خط ملا۔ میں انھیں نہیں جانتا تھا، نہ میں نے کبھی ان کا نام سنا تھا۔ خط میں لکھا تھا کہ اگرچہ ہماری ملاقات نہیں ہوئی، آپ سے ایک طرح کا رشتہ ہے کیونکہ عبادت بریلوی جو آپ کے پرانے دوست تھے، میرے استاد تھے۔ پھر انھوں نے لکھا کہ میں نے غالب کے اشعار کی شرح لکھی ہے اور اسکا عنوان رکھا ہے "غالب بوطیقا"۔ فوراً میرے ذہن میں خیال آیا کہ یہ صاحب اپنے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتے ہوں گے۔ مغربی ادبی تنقید میں ایک کلاسیکی کتاب ہے جسے انگریزی میں Aristotle's Poetics کہتے ہیں۔ اس کتاب کو عربی، اردو اور فارسی میں "بوطیقا" کہا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاید یاد صاحب اپنی شرح کو اس پائے کی کتاب سمجھتے ہیں۔

خط میں دو اور خاص باتیں لکھی تھیں۔ پہلی یہ کہ خلیفہ عبدالحکیم نے غالب کے ایک شعر کے بارے میں کہا ہے کہ اس شعر میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔ شعر یہ تھا:

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

یاد صاحب نے کہا کہ خلیفہ عبدالحکیم صاحب کو یہ شعر اس لیے اچھا نہیں لگا کہ اس میں عریانی کا ذکر ہے۔

دوسری بات یہ تھی کہ یاد صاحب نے بڑے فخر کے ساتھ اس بات کا اظہار کیا کہ انھوں نے تمام جدید انگریز نقادوں کی ہر کتاب کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے ان کے خط کا جواب دیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا خلیفہ عبدالحکیم نے یہ کہا ہے کہ انھیں عریانی کے ذکر پر اعتراض ہے اور اس لیے غالب کا یہ شعر انھیں پسند نہیں آیا۔ میں یہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے بھی اس شعر میں کوئی خاص خوبی نظر نہیں آتی، حالانکہ مجھے عریانی کے ذکر پر کوئی اعتراض نہیں۔

پھر میں نے لکھا کہ آپ نے بہت سارے نقادوں کے نام گنوائے ہیں لیکن میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کو ان سے اتفاق ہے اور اگر ہے تو کیوں۔ اسی طرح اگر آپ کو ان کی بعض باتوں سے اختلاف ہے تو کیوں۔

میرے اس خط کے جواب میں یاد صاحب نے سخت ناخوشی کا اظہار کیا۔ مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا کیونکہ ایک عرصے سے میرا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جب لوگ اپنی شاعری یا مضامین کے بارے میں میری "قیمتی رائے" پوچھتے ہیں تو وہ صرف اپنی تعریف سننا چاہتے ہیں۔ اگر میں تعریف نہ کروں تو میری رائے "قیمتی" نہیں رہتی۔ لہٰذا یاد صاحب کی ناخوشی پر مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ البتہ جس سختی سے انھوں نے لکھا اس پر تعجب ضرور ہوا اور ہنسی بھی آئی۔ انھوں نے میرے ایک سوال کا بھی جواب نہیں دیا، بلکہ لکھا کہ آپ کو اردو نہیں آتی اور میں دعا کروں گا کہ آپ کو اردو آجائے۔ میں نے جواب دیا کہ میں آپ کی دعا کیلیئے شکر گزار ہوں لیکن وہ دعا غالب کی اس دعا کی طرح ہوگی کہ "عمر خضر دراز"

اس کے بعد انھوں نے مجھے خط نہیں لکھا لیکن معین الدین شاہ صاحب مرحوم کے رسالے "اردو ادب" کو خط لکھا جس میں انھوں نے کہا کہ رالف رسل کو اتنی اردو آتی ہے کہ وہ مبتدیوں کو پڑھا سکیں، اور غالباً میں پہلا آدمی ہوں جس نے اس بات کا اعلان کیا۔ مزید یہ لکھا کہ میں "ریڈر ریسپانس تھیوری" ("reader response theory") کا قائل ہوں اور ہر نئے نقاد کی تصنیف جیسے ہی شائع ہوتی ہے پڑھ لیتا ہوں۔

("دی ریڈر ریسپانس تھیوری" اصل میں تھیوری کا نظریہ کہلانے کی مستحق نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ جب آدمی کوئی شعر پڑھتا ہے تو اس کا اس پر ایک خاص اثر پڑتا ہے جو دوسروں پر شاید نہ پڑتا ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ "ریڈر ریسپانس تھیوری" کے مطابق شعر کا مطلب صرف وہی ہے جو پڑھنے والا سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے یہ صحیح نہیں۔ پڑھنے والے کو یہ بھی چاہیے کہ سوچے شاعر کیا کہنا چاہتا تھا۔)

۔ مسلسل ۔

طلوعِ صُبح

محمودالحسن (راولپنڈی)

شعورِ زیست سے محروم سر بسر انساں
وہ دورِ سحر طرازاں وہ عہدِ تیرہ شباں

ہر ایک سمت تھے صحرا میں ریت کے ٹیلے
اور اُن پہ خانہ بدوشوں کے قافلوں کے نشاں

ہنر سے دُور تمدن سے بے خبر دُنیا
ہر ایک شخص تھا تہذیب سے تہی داماں

عجیب واقعہ دیکھا یہ ریگِ صحرا نے
کہ پھوٹ نکلا بیاباں سے چشمۂ حیواں

جو بے ہنر تھے معلّم بنا دیا اُن کو
پلا کے کوثر و تسنیم کی مئے عرفاں

پرو دیا انہیں اِک رشتۂ اخوت میں
کہ دشمنی تھی حقیقت میں جن کی رُوحِ رواں

وقار و دولت و عظمت سے سرفراز ہوئے
وہ لوگ جن کو حقارت سے دیکھتا تھا جہاں

حصارِ قیصر و کسریٰ کو توڑنے والے
یہی تھے خاک نشینانِ بے سرو ساماں

وہ لوگ مثلِ بہائم تھی زندگی جن کی
بنے خدا کے کرم سے خُدا نما انساں

درِ رسول پہ پہنچے تو اس طرح پہنچے
بصد خلوص ہتھیلی پہ رکھ کے ہدیۂ جہاں

سجا کے رکھا ہے کیوں طاق پہ مسلماں نے
وہ ایک بحرِ معانی جسے کہیں قرآں

غلافِ اطلس و کمخواب خوب ہے لیکن
اس ”الکتاب“ کے کس دن بنیں گے دل جزداں

نشانِ رحمتِ یزداں وہ دورِ مصطفوی
وہ ایک ملتِ واحد کراں سے تابہ کراں

بکھر گیا ہے یہ کیوں آج اُن کا شیرازہ
کہ اب بھی ہم میں ہیں موجود سنت و قرآں

وہ درسِ لطف و اخوت بھلا دیا ہم نے
نظر میں بھائی کی بھائی کا خوں ہُوا ارزاں

فقیہ و صُوفی و مُلّا کے پاس کچھ بھی نہیں
نہ سوزِ عشق و محبت نہ دولتِ عرفاں

بلند و بالا ہیں مینار مسجدوں کے مگر
بلالؓ کی بھی کہیں سے کبھی اذاں آئے

حروفِ زر سے بھی قرآں رقم کیا ہم نے
کبھی تو لوحِ دل و جاں بھی درمیاں آئیں

جو ایک نقطۂ مرکز پہ لائے ملت کو
خدا کرے کوئی ایسا بھی نکتہ داں آئیں

شکوہ و سطوتِ اسلام کو جلو میں لئے
دیارِ عشق سے پھر کوئی کارواں آئے

حصارِ دینِ محمد ﷺ بنے یہ کشورِ پاک
یہاں جو آئے فقط حق کا پاسباں آئے

مرے رسول ﷺ کا پیغام جانفزا لے کر
خُدا کرے کوئی بے تیغ و بے سناں آئیں

ہے محوِ تلخ نوائی خطیبِ شعلہ نوا
زباں میں اس کی بھی شیرینیِ بیاں آئے

فقیہِ شہر سے ممکن نہیں ہے نصرتِ دیں
الٰہی اب تری تقدیرِ کن فکاں آئے

خدا کرے چمنِ دینِ مصطفےٰ ﷺ کے لئے
ہوائے وادیِ بطحا کا ارمغاں آئے

جو آج نارِ جہنم میں جل رہا ہے جہاں
اُسے حجاز سے پھر مژدۂ جناں آئے

کریں نہ گریہ زمیں آسماں طوافِ حرم
کہیں سے اور زمیں اور آسماں آئے

وہ دو جہاں کا معلّم محمد ﷺ عربی
زبانِ خلق پہ پھر اس کی داستاں آئے

○

حاطٗ حاط

عبدالعزیز خالد (لاہور)

(زبور میں نامِ انور حضور ﷺ ہے حاط حاط ۔ خالد!)

(1)

سخنوری کے سفر میں یہ کیا مقام آیا
صریرِ خامہ سے آوازۂ سلام آیا
جو رزقِ دل تھا وہی سوزِ عشق کام آیا
"زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے!"

(2)

بیاضِ رخ پہ رقم الکتاب کی تفسیر
وہ بے نظیر ہے وہ ممتنع ہے جس کی نظیر
میں اس کے وصف کو لاؤں یہ حیطۂ تحریر
"مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے!"

(3)

خلا ملا کی اسی کے طفیل پیدائش
اسی کا صدقہ ہے نوعِ بشر کی افزائش
نزولِ نعمت و تسکینِ ذوقِ آسائش
"زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے!"

(4)

ہے بسکہ حرفِ زدن بازناں بنائے غزل
حریفِ نعتِ پیمبر نہیں نوائے غزل
کہ تنگ قدِ عبارت پہ ہے قبائے غزل
"بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے!"

(5)

میں تشنہ کام ہوں اس کا وہ میرا ساقی ہے
مرے بیانِ تمنا کی لے فراقی ہے
دیا جو میں نے سر انجام اتفاقی ہے
"ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے!"

○

نعت پاک

عشرت ظفر (کانپور، بھارت)

تقدیر جواں ہے مرے خاروخسِ جاں کی
آغوش ملی ہے جسے گرداب رواں کی

دیکھو تو نقوش قدم پاک کا اعجاز
قسمت ہوئی روشن مرے مٹی کے سکان کی

کیا آگ مرے سینے میں بھڑکائی گئی ہے
پگھلی ہی چلی جاتی ہے زنجیر زیاں کی

وہ علم وہنر قید میں جس کے فلک وارض
اک جنبش لب ہے مرے آقائے زماں کی

ہر بوند میں تنویر طرب گاہ عدم ہے
ہر ذرہ ہے تصویر خدوخال جہاں کی

لمحوں میں سمٹتے ہوئے صدیوں کے یہ پیاک
باب چمن خاک پہ دستک ہیں خزاں کی

منزل مری عشرت ہے گزرگاہ شہ دیں
کیوں فکر کسی کو ہو مرے نام ونشاں کی

○

نعتِ پاک

سعید رحمانی (کٹک۔ بھارت)

یہ تیرا نطق بلاغت کو شان دیتا ہے
ہر ایک لفظ کو شریں زبان دیتا ہے

لقب ہے امی مگر تو کلام سے اپنے
ہر ایک ذہن کو انمول گیان دیتا ہے

وہ ایک لمحۂ روشن تری ولادت کا
صدی صدی کو اجالوں کا دان دیتا ہے

تو اپنی جیت پہ کرتا نہیں غرور کبھی
عدو جو ہارے تو اس کو امان دیتا ہے

ستم کے دشت کی منحوس بے پناہی میں
تو عافیت کا انوکھا سکان دیتا ہے

سعید کرتا ہے کوشش جو نعت لکھنے کی
تو اس کی سوچ کر اونچی اڑان دیتا ہے

○

نعت رسول مقبول

ناصر عباس ناصر (مازی شہر)

دل میں چاہت نبی ﷺ کی ابھرنے لگی
تازگی میری روح میں اترنے لگی

میں نے جب سے لیا ہے محمد ﷺ کا نام
میرے ہونٹوں پہ خوشبو بکھرنے لگی

مجھ پہ ہونے لگا روشنی کا نزول
تیرگی جسم سے کوچ کرنے لگی

پھر فلک سے برسنے لگیں رحمتیں
خلق رحمت سے جھولی کو بھرنے لگی

تو نے ناصر لکھی نعت ہے جو ابھی
اس سے قسمت ہے تیری سنورنے لگی

○

بہ یادِ شہیدانِ کربلا

عتیق احمد جیلانی (حیدرآباد سندھ)

وہی تیغ ہے، وہی اسپ ہے، وہی جنگ ہے
مرے دھیان میں وہی روشنی، وہی رنگ ہے

یہی شب شکست چراغ ہے پسِ رہ بری
سرِ خیمہ گاہ کلاہ ہے، نہ خدنگ ہے

کفِ ارض پر یہ لہو کی نقش نگاریاں
جنھیں دیکھ کر دلِ آسمان بھی دنگ ہے

اُنھیں فکر ہی نہ تھی چرخ سے جو تباہ کی
سو مسافرانِ عدم پہ دہر بھی تنگ ہے

سرِ دشتِ دل، کفِ حرف میں، زرِ عجز ہے
پئے مدحتِ شہِ عاشقاں یہ اُمنگ ہے

○

آخری فیصلہ

نند کشور وکرم (دہلی بھارت)

آج جگل کشور جی کی آخری رسوم بھی ادا کر دی گئیں اور اُن کی زندگی کا آخری باب ختم ہو گیا۔ مگر اُن کی موت نے کئی سوال کھڑے کر دئے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں سوجھتا اور جواب سوچتے سوچتے دماغ جواب دے جاتا ہے۔

سورگیہ جگل کشور جی کبھی مندر آتے جاتے یا پوجا پاٹھ کرتے نہیں دیکھے گئے مگر وہ غریبوں اور مفلسوں کی سیوا کرنا اپنا دھرم سمجھتے تھے اور دان پُن کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ وہ ایک نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور کوئی پچاس پچپن برس پہلے پنجاب کے کسی گاؤں سے روزی روٹی کی تلاش میں دہلی آئے تھے۔ اور یہاں آ کر زندگی کے کئی نشیب و فراز سے ان کا واسطہ پڑا۔ انہیں طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے کئی جگہوں پر چھوٹے موٹے کام کئے اور آخر کار کسی فرم میں آٹو سپیئر پارٹس کی فرم میں ملازمت اختیار کر لی اور کئی برس تک جنوبی ہندوستان کے شہروں میں اُن کے نمائندے کی حیثیت سے جا کر اُن کے لئے لاکھوں کے آرڈر لاتے رہے اور پھر انہوں نے اُس فرم سے علیحدگی اختیار کر کے خود اپنی آٹو سپیئر پارٹس کی فرم قائم کر لی جہاں سے انہوں نے ترقی کرتے کرتے آٹو سپیئر پارٹس بنانے شروع کر دئے اور اس بزنس میں لاکھوں نہیں کروڑوں کمائے اور بڑا نام کمایا۔

مگر یہ بھی قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ ان کے دو دو بیٹے اور ایک بیٹی ہوتے ہوئے بھی انہیں آخری زندگی میں کوئی سکھ نصیب نہیں ہوا۔ حالانکہ انہوں نے اپنے بچوں کو اچھی تعلیم و تربیت کے لئے اچھے اسکولوں اور کالجوں میں بھیجا اور اعلےٰ تعلیم دلوانے کے بعد انہیں اپنے کام کاج میں شریک کر لیا۔ مگر آہستہ آہستہ بچوں نے بزنس پر اپنا قبضہ جمانا شروع کر دیا اور ایک دن انہیں بالکل ہی بے دخل کر کے دودھ میں گری مکھی کی طرح نکال باہر کیا۔ اب وہ اور اُن کی شریکِ حیات گھر کے ایک کونے میں پڑے رہتے۔ کوئی اُن کو پوچھنے والا نہیں تھی۔ شادی شدہ بیٹی تھی وہ ٹیلی فون پر اُن کا حال چال پوچھ لیتی یا کبھی کبھار اپنے شوہر کے ساتھ آ کر اُن کی مزاج پُرسی کر جاتی مگر بیٹوں کو بزنس سے فرصت نہ تھی اور بہوئیں کٹی پارٹیوں اور شاپنگ میں دن بھر مصروف رہتیں۔

اس ناگفتہ بہ حالت میں ایک دن اُن کی بیوی کو اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہ راہیِ ملکِ عدم ہوئی اور اب وہ بالکل تن تنہا رہ گئے۔ کوئی اُن کا پُرسان حال نہ تھا۔ وہ اپنی کوٹھی کے ایک الگ تھلگ چھوٹے سے کمرے پڑے رہتے۔ اور انہیں کچھ نہیں سوجھتا تھا کہ وہ اس تکلیف دہ زندگی سے کیسے نجات پائیں۔

تبھی ایک دن اُن کے ایک دیرینہ دوست روشن لال گپتا آ گئے جن کی نجف گڑھ علاقے میں ایک فیکٹری اور بہت بڑی کوٹھی تھی اور وہاں کے ایک جانے مانے بزنس مین تھے اور بہت ہی سمجھ دار اور زمانہ ساز آدمی تھے۔ اُن سے اُن کی یہ قابلِ رحم حالت دیکھی نہ گئی اور انہوں نے انہیں رائے دی کہ وہ اپنے بچوں کا موہ چھوڑ دیں اور انہیں خیر باد کہہ کر آرام و آسائش کی زندگی گزارنے کے لئے کوئی قدم اُٹھائیں۔ اس پر جگل کشور جی نے کہا۔ ”مگر میں کیا کروں۔ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ ایسے میں میں آسائش و آرام کی زندگی بھلا کیسے گزار سکتا ہوں؟“

گپتا جی کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر بولے۔ اس کا علاج میرے پاس ہے۔ اگر عمل کرو تو تمہارے سب دکھ دور ہو جائیں گے۔ اور تمہاری بقیہ زندگی بھی سکھ چین سے بھی گزرے گی۔“

”وہ کیسے؟ لالہ جگل کشور جی نے بڑے استفہامانہ لہجے میں پوچھا۔

”وہ ایسے کہ اگر کبھی تمہارا پریوار ایک آدھ ہفتے کے لئے باہر جائے تو اُن کی غیر موجودگی کا فائدہ اُٹھا کر اس مکان کو جو کہ کم از کم دو کروڑ کا ہے فروخت کر کے کسی ایسی جگہ چلے جاؤ جہاں وہ لوگ تمہیں تلاش بھی نہ کر پائیں۔“

جگل کشور جی کو کانپ اُٹھے انہیں گپتا جی کی یہ اسکیم پسند نہیں آئی تھی۔ بھلا بچوں کے ساتھ فریب۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ ایسا کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ لہذا انہوں نے اس اسکیم پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر گپتا جی نے سمجھایا۔

”دیکھو جگل کشور تمہارے بچوں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ تم نے بچوں پر اعتماد کر کے اُن کے نام اپنا کروڑوں کا بزنس کر دیا اور انہوں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا۔ تمہیں فیکٹری سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکال دیا اور تم کچھ بھی نہ کر سکے۔ اگر یہ مکان بھی اُن کے نام ہوتا تو شاید تمہیں سڑکوں پر بھکاریوں کی طرح زندگی گزارنی پڑتی۔ جب بچوں نے تمہارے ساتھ دغابازی اور فریب کیا ہے تو تم انہیں سبق سکھانے سے کیوں گھبراتے ہو۔ انہیں بھی ایک دھچکا دو تا کہ ماں باپ سے زیادتی کرنے والے کچھ بچوں کو نصیحت حاصل ہو۔

گپتا جی کے سمجھانے بجھانے پر جگل کشور جی اس اسکیم پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اتفاق سے اُن ہی دنوں کلکتہ میں اُن کے کسی قریبی رشتہ دار کی بیٹی کی شادی تھی اور وہ سبھی ایک ہفتے کے لئے وہاں چلے گئے۔ اُن کی غیر موجودگی میں گپتا جی نے اُس مکان کا پونے دو کروڑ میں سودا کرا دیا اور جگل کشور جی روپیہ لے کر گپتا جی کے کہنے کے مطابق کسی اور جگہ چلے گئے۔ جب ایک ہفتے بعد دونوں بیٹے لوٹے تو اندر سے گیٹ بند تھا اور اُن کے پتا جی کے

کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ انہوں نے جب بہت آوازیں دیں۔ تو ایک آدمی نے اُوپر سے بالکونی میں آکر پوچھا ''کیا بات ہے؟''

''جی ہمارے پتاجی کہاں ہیں؟''

''کون پتاجی؟

''جی جگل کشور جی۔''

''دیکھئے ایسا ہے کہ وہ اپنا مکان بیچ کر کہیں اور چلے گئے۔''

''مکان بیچ کر چلے گئے ہیں؟'' بیٹوں کے پاؤں کے نیچے سے زمین ہی کھسک گئی۔

''جی ہاں! اور آپ لوگوں کا سامان نیچے گیرج اور دو کمروں میں مقفل پڑا ہے۔ صبح آکر لے جائیے گا۔''

اور اس کے بعد وہ بچے کئی دن تک اپنے والد کو ڈھونڈتے رہے مگر اُن کا کہیں نام ونشان نہ ملا۔ بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے ایک چھوٹا سا ڈیڑھ سوگز کا بنا بنایا مکان خرید لیا ہے اور کچھ روپیہ انہوں نے اپنی بیٹی کو دے دیا کہ اُسے اُن کی جائیداد سے کچھ نہیں ملا تھا۔

اس کے بعد بچے اُن سے معافی مانگتے رہے اور انہیں واپس گھر چلنے کے لئے اصرار کرتے رہے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انہوں نے بچوں سے کہا بیٹا تم اپنی زندگی جیو اور میں اپنی۔ ہاں میں نے وصیت کر دی ہے تا کہ بعد ازاں کسی قسم کا جھگڑا نہ ہو۔ کیونکہ سارا جھگڑا زمین جائداد اور روپے پیسے کا ہی ہے۔

آخری عمر میں صحت کے ساتھ ساتھ اُن کی یادداشت بھی جواب دے گئی۔ جب حالت بہت خراب ہو گئی تو ان کی وصیت کے مطابق اُن کے دوست گپتاجی نے انہیں ایک اولڈ ایج ہوم قسم کے آشرم میں داخل کرا دیا جہاں گیارہ دن پہلے اُن کی مرتیو ہو گئی تھی اور آج اُن کے بیٹوں نے ان کی آخری رسم کریا کے لئے آپ اعزا اقارب کو اکٹھا کیا تھا حالانکہ جگل کشور جی نے اپنی وصیت میں لکھا تھا کہ اُن کی وفات کے بعد اُن کے کسی رشتہ دار کو نہ بلایا جائے اور اُن کے بیٹوں کے بجائے آشرم والے ہی اُن کی آخری رسوم کر دیں۔ مگر بیٹوں کی بھی تو ناک کٹتی تھی اور انہیں سماج میں اپنی شان قائم رکھنی ہے۔ لہٰذا وہ اُن کا سنسکار کرنے کے لئے فوراً پہنچ گئے اور ساری رسومات اپنی حیثیت کے مطابق کرنے کے علاوہ انہوں نے مندروں اور پنڈتوں کو ہزاروں روپے دان بھی دیا۔ زندگی میں تو وہ انہیں اپنے پاس نہ رکھ سکے، اُن کی سیوا نہ کر سکے مگر موت کے بعد سماج میں اپنی ناک بچانے اور اپنی شان دکھانے کے لئے انہوں نے ہزاروں روپے صرف کر ڈالے۔

جگل کشور جی نے زندگی کے آخری دن بہ عالمِ مجبوری ''آشرم'' میں گزارے تھے مگر اُن کا کہنا تھا کہ اولڈ ایج ہوم یا آشرم بوڑھوں کے مصائب کا حل نہیں۔ اور کوئی قانون اس مسئلے کو پوری طرح سے حل نہیں کر سکتا۔ اُن کا کہنا تھا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ اپنے بزرگ ماں باپ کو اپنے پاس رکھنا اور اُن کی سیوا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھیں۔ اور یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ کل انہیں بھی بوڑھا ہونا ہے۔ انہیں بھی اس صورتِ حال سے واسطہ پڑنا ہے۔ اگر وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کی سیوا نہیں کریں گے، انہیں آرام و آسائش کی زندگی مہیا نہیں کریں گے تو کل اُن کے بچے بھی جو دیکھیں گے وہی کریں گے۔

جگل کشور جی کے بچے بڑے مطمئن تھے کہ اُن کی موت کے بعد مکان اور پیسہ تو انہیں ہی ملنا ہے لیکن رسم کریا کے دوسرے دن انہوں نے وصیت سنی تو ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی کیونکہ وہ اُن سے اتنے نالاں تھے کہ انہوں نے انہیں ایک کوڑی تک نہیں دی تھی اور اپنا مکان اور کوئی ایک کروڑ روپے جو انہوں نے مکان بیچنے کے بعد اپنی بقیہ زندگی کے لئے محفوظ رکھے تھے، ان کے بجائے اپنی آخری پناہ گاہ ''سورگ آشرم'' کو دان دے دئے تھے تا کہ آشرم والے مزید کمرے بنوا سکیں اور آخری عمر میں بے آسرا بوڑھوں کو اپنی بقیہ زندگی گزارنے کے لئے ایک محفوظ اور آرام دہ ''پناہ گاہ'' فراہم کر سکیں۔

۔ بقیہ بلاؤز ۔

طرف لابی (lobby) میں گرما گرم چائے کا دور چل رہا تھا اور ساتھ ہی ایک دوسرے کے کپڑوں کی جھوٹی۔ سچی تعریف اُونچے اُونچے لہجوں میں ہو رہی تھی کچھ مستورات ٹرائی روم میں جا کر نئے نئے لباس پہن کر باہر آتی تھیں اور تعریف حاصل کرتی تھیں۔

اچانک لابی میں بے حد شور ہو گیا اور واہ۔ واہ۔ کمال ہو گیا۔ ونڈرفل جیسے تعریفی کلموں سے گھر گونج اُٹھا۔ کچھ خواتین اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے لیے تالیاں بھی بجا رہی تھیں۔

اِتنا شور وغل سننے کے بعد دونوں دوستوں کے دل میں آیا کہ دیکھیں تو سہی کس بات پر اتنی تعریف ہو رہی تھی۔ لہٰذا دونوں دوستوں نے چلمن ذرا ہٹا کر غور سے دیکھا تو دونوں کے حواس باختہ ہو گئے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ ریشمی بساط جس کی انہیں تلاش تھی ہندوستان کی ایک مشہور ماڈل کا خاص لباس بن چکی تھی اور اُس کے مرمریں جسم کے ایک جاذبِ نظر حصہ پر رونق فروز تھی۔ جہاں وہ دوشیزہ رسمی طور پر اُسے پہن کر دیدہ دانستہ جسم نمائی کے لیے کوشاں تھی۔ وہاں یہ چارگرہ پارچہ جس کو نوڈل سٹرنگس (Noodle strings) نے تین طرف سے نہایت بے رحمی سے کھینچ رکھا تھا۔ تختۂ دار پر چڑھ کر اور اپنی جسامت سے بڑھ کر اپنے فرائضِ جسم پوشی ادا کرنے میں تندہی سے کوشاں تھا۔

کیف اُس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں لکھا ہو دوشیزہ کی چولی ہونا۔

مریض

شمشاد احمد
(کراچی)

میں نے پورے تین سال شاہی قلعے میں گزارے ہیں۔
قلعے کی دنیا بھی کیا دنیا ہے باہر کی ہوا اندر آنے کو ترستی ہے اور اندر کی آوازیں پہاڑ دیواروں سے ٹکرا کر اندر ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ اس حبس میں بڑے سے بڑا اکھڑ مجھ جیسے بے بس ماحول میں ابرو کے اشارے پر ہیجڑوں کی طرح تالیاں بجانے لگتا ہے۔

میرے کندھے پر ایک اور چمکتے ستارے کا اضافہ ہوا میرا تبادلہ جیل میں کر دیا گیا۔ شیروں کا شکاری ڈربے کی مرغیوں کے پر کھدیڑنے پر آ لگا۔ بہر حال نوکری نوکری ہے۔ مجھ سے پہلے قلعہ جیل پہنچ چکا تھا۔
گاڑی فرلانگ بھر دور ہوتی ہے تو جیل کا آہنی گیٹ کھلنے لگتا ہے اور اکڑے ہوئے سلیوٹوں کے ساتھ لاتعداد ایڑیاں زخمی ہونے لگتی ہیں۔
ماتحت عملہ سدھر چکا تھا آج قیدیوں کا پہلا معائنہ تھا۔
میں کن بردار سخت چہروں والے محافظوں کے جلوس میں پورے طمطراق سے ٹھنڈے دفتر سے نکلا۔ جیلر میرے ساتھ بھوکے بچھڑے کی مانند اچھلتا کودتا چل رہا تھا۔
میدان میں سورج انتہائی تکبر سے ظلم ڈھا رہا تھا۔ قیدی صبح سے قطار در قطار کھڑے تھے۔ ہر برج میں سپاہی سیاہ نالیوں والی بندوقیں تانیں مستعد تھے۔ لطف آ گیا۔
پہلا قیدی ایک جھڑتا ہوا بوڑھا تھا۔ وہ بار بار کھلی آستین سے اپنا چہرہ پونچھے جا رہا تھا۔ اسکی گدلی سفید داڑھی بری طرح سے الجھی ہوئی تھی۔
جیلر نے لپک کر میرے کان میں پھونکا۔
''سر ذہنی مریض ہے''
اس نے ایک بار بھی آنکھیں اٹھا کر میری طرف نہ دیکھا۔ اسکے لیے دنیا میں اہم ترین چیز اسکا چہرہ تھا۔ وہ اسے مسلسل پونچھے جا رہا تھا۔
معائنے کی ابتدا تھی۔ قیدیوں کے لئے رویے کا تعین کرنا تھا۔ اگر وہ بوڑھا تھا اور ذہنی مریض تھا تو جیلر کو خیال کرنا چاہیے تھا۔ وہ پہلی قطار میں پہلا آدمی نہیں ہونا چاہیے تھا۔
میں نے چمکتی بید کی نوک اسکی ٹھوڑی تلے دیکر اسکا جھکا سر اٹھایا۔ اس نے بھی ایک جھپک میری طرف دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں برفانی خلا تھا اور اس خلا میں کہیں کسی جذبے کا ایک سوکھا مریل کانٹا تک نہ تھا۔
میں نے جھپ جھپ پانچ سات بید جڑ دیے۔ نہ کوئی رگوں میں خون اچھالنے والی چیخ۔ نہ رحم کی بھیک مانگتی گڑگڑاہٹ۔ سارا مزہ کرکرا کر کے رکھدیا۔ مار کھانے کے بعد بھی اسکی ڈھیلی آستین کار کے وائپرز (WIPERS) کی طرح متواتر اسکے چہرے پر پھر رہی تھی۔
زندگی سے بچھڑے چہرے، مٹی کے بھربھرے مجسمے۔ ان کا کیا معائنہ کرنا!
کم از کم پہلی قطار تو پوری ہو جائے۔ میں جلدی جلدی، اچٹتی نظر ڈالتا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میرا جلوس بھی میرے ساتھ رینگ رہا تھا۔ سب کو پسینے کی چیونٹیاں کاٹ رہی تھیں۔ خود میری وردی جگہ جگہ سے چپکنے لگی تھی۔
میں بھی واپس مڑنے کو تھا میرے پاؤں زمین سے چپک گئے۔
وہ پہلی قطار میں سب سے آخر میں کھڑا تھا۔ مجھ سے نکلتا قد۔ مجھ سے زیادہ مضبوط اور تنے ہوئے کندھے۔ جھاڑ جھنکار باغی مونچھوں کی الف نوکیں۔
میں نے حاکمیت کے بے رحم خنجر اسکی آنکھوں میں گاڑ دیے اور اسکے ردعمل کا انتظار کرنے لگا۔
اسکی پتلیوں پر جمی تمسخر اور حقارت کی تہیں پگھلنے کی بجائے اور گھنی ہو گئیں۔ مجھے ایسے ہی جی دار کی تلاش تھی۔
اور ملا کہاں؟ ڈربے کی مرغیوں کی ڈربے میں۔ ایسا شیر تو قلعے میں پایا جا سکتا ہے۔
لذت میری رگوں میں پھنکاریں مارنے لگی۔ اسکے خوشگوار ذائقے سے سارا بدن مہک اٹھا۔
طبل جنگ بج گیا تھا۔ میرے اندر قلعے کا پروردہ اندھا، پاگل جن میدان میں کود پڑا۔
جیلر کچھ کہنے سمجھانے آگے بڑھا۔ جن نے اسے دھکا دے کر ایک طرف دھکیل دیا۔
بید لچک لچک کر سنسناتی ہوا کو کاٹتا اسکے جسم پر برسنے لگا۔ وہ ہر نئی ضرب پر پیچھے ہٹنے کے بجائے پہلو بدل بدل کر جسم کا کوئی دوسرا حصہ سامنے کر دیتا۔ کبھی ایک کندھا، کبھی دوسرا، کبھی پیٹھ، کبھی سر۔ جیسے ٹھنڈے بدن عفو عفو تاپ رہا ہو۔
مجھے احساس ہوا کہ میں بیوقوف بن رہا ہوں۔ میرے ہاتھ ڈھیلے پڑنے لگے۔ پھر رک گئے۔
اسکے سرکش سر میں خم آ گیا تھا۔ اسکے ہونٹوں سے خون اور تھوک

میں لپٹی لذت بھری سسکاریاں پھولوں کی مانند جھڑ رہی تھیں۔وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر پھیر کر لذت کے آخری ذرے چاٹ رہا تھا۔

میں نے ہمت کر کے اسکی آنکھوں میں نقب لگائی۔

تمسخر اور حقارت کی دبیز تہیں پگھل کر بہہ گئی تھیں۔وہ مجھے بڑی اپنائیت اور پیار سے گھور رہا تھا۔

''بس۔ابھی تو نشے کا پہلا ریلا آیا تھا۔بڑی جلدی تھک گئے ہو۔''

میں دیوانہ وار ایک اور حملے کو لپکنے والا تھا۔جیلر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے انتہائی کرب اور دکھ سے اپنے جن کو واپس بوتل میں ڈالا۔ اور اس سے پہلے کہ میری بے بسی قیدیوں میں پھیل جائے میں پلٹا اور تقریباً بھاگتا ہوا دفتر کی طرف چل پڑا۔میرا روبوٹوں (ROBOTs) کا جلوس میرے پیچھے پیچھے تھا۔

میرا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر تھا۔ جھکے پھیکے چہروں اور خالی آنکھوں نے اتنا بھرپور قہقہ لگایا کہ میرے کاندھے پر جگمگاتے سارے ستارے ٹوٹ کر زمین پر گر گئے۔میں نے جلدی سے اپنے اجڑے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا۔

ٹھنڈے کمرے میں کنوئیں سے گہری کرسی کے اردگرد میری شکست بر ہنہ رقص کر رہی تھی۔

میں جیلر پر چیخا۔

''یہ کیا چیز پال رکھی ہے؟ مجھے پہلے سے باخبر کیوں نہیں کیا گیا؟''

''سر۔سر''

جیلر کے گلے میں غلامی کا پھندا تنگ ہو گیا۔مجھے نجانے کیوں اس پر رحم آ گیا حالانکہ یہ لفظ کبھی بھی میری ڈکشنری میں نہیں رہا۔

میرے ماتھے کی شکنیں دیکھ کر اسکی آواز بحال ہوئی۔

''سر۔یہ بھی ذہنی مریض ہے۔یہاں سبھی ذہنی مریض ہیں۔تشدد اسکی غذا ہے سر۔اذیت اسکا نشہ بن چکا ہے۔''

میں نے بید پوری بے دردی سے میز پر ماری۔میز پر بچھا شیشہ چھناکے سے چکنا چور ہو گیا۔

میں نے جلدی جلدی لمبی لمبی سانسیں لیں۔پھیپھڑوں کو خوب بھر لے گارڈ اور جیل کا دوسرا عملہ باہر کھڑا میرے کمرے کی ہوا سونگھ رہا تھا۔

میں نے گھنٹی پر انگوٹھا رکھ دیا۔

پلک جھپکنے میں گارڈ اندر داخل ہوا۔اسکی ایڑیاں بجیں۔میں نے جھک کر اپنے چمکتے جوتوں پر بلکے سے بید مارا۔

''چائے''۔۔۔۔گارڈ ویسے ہی بجتا بجاتا لوٹ گیا۔

''بیٹھ جائیے۔''

وارڈن کے مردہ جسم میں زندگی اتنی سرعت سے داخل ہوئی کہ وہ لڑکھڑا کر کرسی پر تقریباً گر گیا۔

میں نے اسکی طرف غیر ملکی سگریٹ کا پیکٹ بڑھایا۔آخر یہ بھی انسان ہے۔

وارڈن نے ایک سگریٹ تبرک کی طرح لے لیا۔

سگریٹ کے لمبے کش اور چائے کی بدتمیز سرکیوں نے اسے کافی حد تک ڈھیلا کر دیا۔

''سر میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔آپ نے چیختے ہوئے اسے غور سے دیکھا تھا؟ وہ اپنے جسم کی سینکائی کر رہا تھا۔''

میرے پٹھے پھر پھڑکنے لگے۔میں نے پھر خوب سارے لمبے لمبے سانس لیے۔

''ہمارے پاس ایک ہی ہتھیار ہے۔یہ اس پر کارگر نہیں۔ہم اسکا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔سارا ڈسپلن تباہ و برباد ہو جائیگا۔''مجھ پر مایوسی غالب آنے لگی۔

جیلر میری الجھی سوچوں سے بے نیاز چائے سگریٹ اور اس اعزاز میں ہلکورے لے رہا تھا۔میں نے سوال داغا تو وہ اچھے خاصے جھٹکے سے واپس لوٹا۔

''تم لوگ اس قیدی پر اکثر تشدد کرتے رہتے ہو؟''

نو سر۔لیس سر آجکل تو بالکل نہیں کر رہے تھے۔شروع شروع میں یہ قیدی بیچ میدان کھڑا ہو کر اچانک بھیانک آواز میں چیخنے چلانے لگتا تھا۔کوئی گارڈ دو چار تھپڑ' دو ایک ٹھوکریں لگاتا تھا۔ اور وہ چپ چاپ اپنی کوٹھری میں چلا جاتا تھا۔پھر سر آہستہ آہستہ اسکی ضرورت بڑھنے لگی' بڑھتی چلی گئی۔''

''پھر!''

میرے تجسس کو پنکھے لگ گئے

جیلر نے اپنی آنکھیں مجھ سے چھڑا لیں۔

''سر۔اسے دوسرے نشوں پر ڈالنے کی کوشش کی۔چرس' کوکین اور آخر میں ہیروئن۔سب کچھ آزمایا۔حرامی نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔بس تشدد مانگتا ہے سر' اذیت مانگتا ہے۔پھر بے بس ہو کر اسے اسکے حال پر چھوڑ دیا۔''

''بس سر۔پہلے تو خوب چیختا چلاتا ہے۔کوئی توجہ نہیں دیتا تو ہر گزرنے والے کو ننگی گالیاں دینے لگتا ہے۔پھر بھی کام نہ ہو تو کسی کا گریبان پکڑ کر چاک کر دیتا ہے۔آدمی کہاں تک برداشت کرے۔غصے اور نقصان میں

نا دانستہ طور پر اسکا کام ہوجاتا ہے۔ایک نمبر حرامی ہے سر۔نشہ پورا ہوجاتا ہے گڑ گڑا کر معافیاں مانگ مانگ کر مارنے والے کو شرمندہ کر دیتا ہے آج کل اس مکاری پر کام چلا رہا ہے۔"

''کبھی اسے قید تنہائی میں بھی رکھا ہے؟''

''یس سر۔دیواروں سے ٹکریں مار مار کر بھیجا پلپلا کر لیا۔اب اگر وہاں مرجاتا تو۔۔۔''

میں جیلر کی بات سمجھ رہا تھا۔اگر وہ اسطرح مر مرا جاتا تو الزام جیل والوں پر آتا اور پھر۔۔۔

میں نے اچانک فیصلہ کیا۔

''جیلر صاحب۔اسکے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے کھلے میدان میں ڈال دیا جائے۔ایک گارڈ مستقل اسکے سر پر کھڑا رہے کوئی بھی کسی بھی صورت اسکے قریب نہ آئے۔کوئی اس پر ہاتھ نہ اٹھائے۔ہم اسکے نشے کو بھوکا رکھ کر ماریں گے۔''

میرے کندھے پر جگمگاتے ستارے واپس لوٹ آئے تھے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔جیلر نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔

''جیلر صاحب۔کل اس مجرم کی فائل میری میز پر ہونی چاہیے۔''

میں رات بھر الجھا رہا۔ولایتی وسکی پانی ہو رہی تھی۔میں پئے جا رہا تھا۔

''کیا ایسا ممکن ہے؟ سانپ ڈسوا کر نشہ کرنے کا سن رکھا تھا لیکن تشدد۔۔۔''

دوسرے دن ایک سلسلے میں ہائی کورٹ میں پیش ہونا تھا۔اس جگہ سرکاری افسروں سے مجرموں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔فارغ ہوا تو ذہن پر اتنا بوجھ تھا کہ جیل جانے کو جی ہی نہ چاہا۔

کھانے کی میز پر اپنی بیوی اور چہکتے بچوں کی محبت میں باہر کی زندگی یکسر فراموش کر چکا تھا۔

اچانک فون کی گھنٹی چلانے لگی۔

خانسامے نے فون اٹھا کر سنا اور پھر میری طرف بڑھا دیا۔

''سر۔جیل سے ہے۔''

ہزاروں بڑے چھوٹے خدشات گولیوں کی طرح ذہن پر برس گئے۔قیدیوں کی بغاوت فرار اچانک کسی اعلیٰ افسر کا معائنہ۔۔۔

میں نے ہیلو کہا۔۔۔دوسری طرف جیلر رو رہا تھا۔

''سر۔سر فوراً آئیے۔اس قیدی کی حالت نازک ہے۔وہ مر رہا ہے سر۔یا پھر اجازت دیجئے۔''

راستے بھر خوف مجھے مختلف انداز میں مروڑتا رہا۔اگر وہ مر گیا تو۔ انکو امری، رشوتیں، سفارشیں۔وہ بھی دہکتی زمین پر تازہ بکرے کی طرح تڑپ رہا تھا۔بندھے ہاتھ پاؤں لڑھکنیاں کھا رہا تھا۔چیخ چیخ کر رو رو کر اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔

اس نے مجھے دیکھا اور تیزی سے لڑھکتا ہوا میرے قدموں پر آپڑا۔

''اتنا ظلم نہ کیجئے۔رحم۔رحم سرکار۔''

میں نے اسے ایک ٹھوکر لگائی۔۔۔اس کے تڑپتے ہاتھ پاؤں سنبھل سے گئے۔۔۔میں نے اس کے سر پر ایک بید لگائی۔۔۔وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

''نوالہ۔نوالہ ڈالتے ہو یکلا کھانا کھلا دو۔یا پھر مار ڈالو۔''

وہ واقعی رحم کا مستحق تھا۔یا پھر جیل میں آ کر مجھے رحم کی بیماری لگ گئی تھی۔

میرے اشارے پر ایک گارڈ پوری بے رحمی سے اس پر ٹوٹ پڑا۔

جب گارڈ تھک کر نڈھال ہو کر رکا تو میں نے خود اپنے ہاتھ سے اسکی رسیاں کاٹیں۔وہ بے جان ٹوٹے مجسمے کی طرح بکھرا پڑا تھا۔اسکے چہرے پر بے پناہ آسودگی تھی۔

ذہن میں ایک عجیب سی بے کلی تھی۔کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔گھر جاؤں یا دفتر میں بیٹھوں۔جیلر نے مسئلہ حل کر دیا۔

''سر اسکی فائل میں نے آپکی میز پر پہنچا دی ہے۔''

میں نے فائل کھولی۔

پہلا صفحہ۔۔۔نام

مجھے اس کے نام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

گرفتاری۔۔۔تاریخ درج تھی۔

جرم۔۔۔مارشل لاء کے دوران طالب علموں کی بغاوت پر اکسانا رہا تھا۔

شاہی قلعے میں تین سال۔۔۔پھر چودہ سال کی سزا۔۔۔ایک جیل سے دوسری جیل۔

ساری الجھنیں جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں۔میں نے فائل جیلر کی طرف بڑھا دی۔

''جیلر صاحب۔قیدی کو صبح شام بلاناغہ پورے احترام کے ساتھ اسکا نشہ مہیا کیا جائے۔اس میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کی جائے گی۔''

جیلر آنکھیں سکیڑے عجیب نظروں سے مجھے گھورے جا رہا تھا۔

میں پاگل نہیں ہوں۔ہم دونوں شاہی قلعے کے پروردہ ہیں۔میرا اور اسکا ایک رشتہ ہے۔

وقت کی مٹھی

رخسانہ صولت

وقت کی دہلیز تھکے ہارے قدموں کی دھمک سے دہل اٹھی۔ اس نے نظر گھما کر ادھر اُدھر دیکھا۔ تو چھت سے لگی الٹی چمگادڑوں اور مکڑی کے بڑے بڑے جالوں نے مہیب سا ماحول طاری کر رکھا تھا۔ دفعتاً اسے ایسے لگا جیسے ابھی چمگادڑیں لپک کر اس کے کانوں سے لٹک جائیں گی۔ اور جالے اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ اور وہ بالکل بے بس ہو کر رہ جائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی خوف سے اس کی گھگی بندھ گئی۔ اس نے چیخنا چاہا تو آواز اس کے گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ بھاگنے کے لیے قدم اٹھائے تو جیسے پاؤں زمین نے اپنے جبڑوں میں جکڑ لیے۔ اس نے ایک بار پھر بے بسی سے چھت کی طرف دیکھا۔ خوف دہشت اور بے بسی سے آنسو پلکوں پر چپک کر رہ گئے۔

یا خدا! یہ کیسا عذاب ہے۔

یہ کس جرم کی سزا ہے باہر بہت گرمی ہے۔ جس سے ہوا نے بھی جیسے احتجاج کرنے پر کمر باندھ رکھی ہو۔ سانسیں استخوانی ڈھانچوں میں گھٹ کر رہ گئی ہوں اسے خیال آیا ابھی صرف چند لمحے پہلے کی تو بات ہے وہ بظاہر بڑی بے فکری سے ٹھنڈی سڑک پر چلا جا رہا تھا اس کی کلف دار کلرکی نے بھی اسے اچھا خاصا معزز بنائے رکھی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی جیب میں کچھ پرانے سکے کھنکتے رہتے۔ جو اکثر اپنے دوستوں کو بڑے فخر سے دکھایا کرتا تھا جب وہ پوچھتے کہ یہ اس کے پاس کہاں سے آئے تو ایکدم اس کی گردن سوا نیزے سے اوپر تک اکڑ جاتی۔

اور وہ بڑے فخر سے بتاتا کہ یہ تو اس کے خاندانی ہیں اور ورثہ میں اسے ملے ہیں۔ ہاں تو سکوں کی کھنک نے ایک بار پھر اس کی سوچوں کو متوازی سمت میں رواں کر دیا۔ اسے خیال آیا کہ وہ سیدھا سڑک پر چلا جا رہا تھا اپنی دھن میں مگن۔ ہلکی ہلکی سیٹی بجاتا۔ ہاتھ میں ایک چابی کا رنگ گھماتا۔ اور ادھر اُدھر بڑی دکانوں کے شوکیس میں پل بھر رک کر چیزوں کا جائزہ لیتا۔ اور پھر بے نیازی سے اس طرح چل پڑتا۔ جسے اس نے کچھ بھی تو نہیں خریدنا۔ ایک جگہ لوگوں کا ہجوم تھا۔ اس کے تجسس نے اسے ٹھوکا دیا۔ اور یہ رک کر ہجوم کا جائزہ لینے لگا۔ لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا جب وہ آگے بڑھا تو اسے پتہ چلا یہ تو ایک مداری بندر نچا رہا تھا۔ وہ حیران تو ہوا کہ کتنے بڑے شہر کے اتنے مصروف بازار میں لوگوں کو اتنا وقت مل جاتا ہے کہ وہ کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھیں۔

ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ابھی چند روز پہلے اس کے بچے بھی ضد کر رہے تھے۔ کہ ابو شہر میں میلا لگا ہوا ہے میلے میں بندر کا تماشا دیکھنے جانا ہے۔

ایک روز اس کی بڑی بچی نے ضد کی۔ کہ سرکس میں ہاتھی اور شیر کے کرتب دیکھنے ہیں جی تو اس کا چاہا کہ وہ ابھی بچوں کی انگلی پکڑے اور ان کی ساری خواہش پوری کر دے۔ مگر بے بسی نے اس کے پاؤں پھر جام کر دیے۔ وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل کر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

اسے آج بھی تنخواہ نہیں ملی تھی۔ ایک مل مزدور کی تنخواہ ہی کیا ہوتی ہے اور آج تو ہڑتال کا دسواں دن تھا۔ اور اس کی جیب خالی تھی۔ گھر کا خرچہ تو مانگ مانگ کر چلا ہی رہا تھا یہ سر سپاٹوں کی خواہشات کیسے پوری کرتا۔

اس کی بیوی بشیراں اسے ہر روز کہتی تھی کہ تم یہ نوکری چھوڑ دو۔ کہیں چھابڑی لگا لو۔ سارا دن کے ہڑتال تماشوں سے تو بچے رہو۔ صبح سے شام تک آواز لگاؤ گے۔ شام کو چار پیسے تو جیب میں آئیں گے۔ اور وہ ہنس کر کہتا۔ بشیراں تو بھی بہت بھولی ہے بھلا لگی لگائی چھوڑ دوں تو کیونکر اور پھر چھابڑی کا بھی کیا بھروسہ۔ وردی والے کسی بھی وقت آ کر ہاتھ ماریں تو۔

ایک دن اس کی مل میں پھر جھگڑا ہوا منشی نے اس کی دس دن کی تنخواہ اس لیے کاٹ لی تھی کہ مل میں کام نہیں ہوا تھا۔ حاضری اگر پوری تھی بھی تو کیا ہوا۔ یہ کونسا قانون ہے کسی مائی کے لال میں ہمت ہے تو وصول کر لے۔ رشید اور بشیر بھی تو اسی اکڑفوں میں اپنی ٹانگیں تڑوا بیٹھے تھے۔ بھلا خالی ہاتھ اور زبان کبھی کلاشنکوف کا کام کر سکتی ہے؟۔ یہ سب ہی کہتے تھے اسی کے ساتھیوں کا ایک گروپ بڑے دعوے کرتا تھا۔ کہ یہ کلاشنکوف کیا چیز ہے۔ مزدور کی پسینے اور خون کی طاقت تو ظلم و جور کی ساری دیواریں ڈھا سکتی ہے مگر کیسے اور کب تک؟ ایک دن کی بات ہے وہ صبح سو کر اٹھا تو خلاف معمول اسے کچھ ایسے محسوس ہوا جیسے آسمان سرخ ہے۔ سورج کی تپش میں ان اجڑے چہروں کے آنسوؤں کی حدت تھی۔ جن کا لہو اچھل کر آسمان کو نیلا گیا تھا۔ اس کا دل دہل گیا۔ آج ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ یہ شک نہیں تھا وہم بھی نہیں تھا بلکہ یقین کا ایک ہیولہ تھا۔ جو اسے یہ باور کرا رہا تھا کہ آج بہت سے چولھے اندھے ہو گئے ہیں۔ بچے یتیم ہو گئے۔ ماؤں کی کوکھ اجڑ گئی۔ اس لمحے اس کے دل نے بغاوت کر دی۔ اور اس نے بشیراں کی بات مان لی۔ صدر کی بارونق شاہراہ پر اس نے چھابڑی لگا لی۔ اور شام ہوتے ہی اسے اپنی جیب بھاری سی محسوس ہوئی۔ اس کے دل نے اسے کہا۔ بشیراں بالکل ٹھیک ہی کہتی تھی۔ ہے تو وہ ان پڑھ مگر بات بڑے تجربے کی کرتی ہے۔ ذرا سی دیر میں بشیراں کی قدر اس کے دل میں پہاڑ برابر ہو گئی اور وہ آنے والے دنوں پر مستقبل کی دیوار کھڑی کرنے لگا۔ شیداں آنے والوں دنوں میں جوان ہو جائے گی۔ اس کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں اس کے لیے ابھی سے کچھ بنا کر رکھے گا۔ تو کچھ ہو سکے گا۔ ابھی رشید اور گاما اسکول جاتے ہیں۔ ان کو پڑھا لکھا کر اپنے پیروں پر کھڑا کر دے گا۔

پھر وہ بشیراں کے بارے میں سوچنے لگا اس کی خالی کلائیوں کیلئے

کنگن بنوا دے گا۔ بیچاری جنموں جلی جب سے اس گھر میں آئی تھی۔ اسے گھر والے سے بس ایک چاہ تھی کہ وہ اس کی سونی کلائیاں بھر دے گا۔ شادی کی رات سے اس کا یہ وعدہ تھا۔ اس نے گھر والے کے تین بچے جن دیئے تھے۔ مگر وہ اس کی سونی کلائیاں نہ بھر سکا تھا۔ پھر اس کا ذہن اپنی جھگی کی طرف چلا گیا۔ ایک دن اس طرح وہ گھر کی چار اینٹیں بھی اکٹھی کرے گا۔ اور اپنی چھت کے نیچے سکھ کا سانس لے گا۔

چھت کا خیال آتے ہی اس کی نظر اوپر کی طرف اٹھ گئی۔ الٹی لٹکی ہوئی چمگادڑوں اور خوفناک جالوں نے اسے اپنے آپ میں واپس لوٹا دیا۔ وہ تو اس چھت کا خواب تھا۔ کتنی بھیانک ہے یہ چھت۔ اسے احساس ہوا۔ اس سے بہتر تو وہ جھگی تھی۔ جس کی چھت میں گھاس پھوس اور پتوں کا سایہ تھا۔ اس میں سانس تو چل رہی تھی۔ ہوا کا گزر تو ہوتا تھا۔

پھر اس کے نتھنے بدبودار دھوئیں سے پھٹنے لگے۔ ملگجی کڑواہٹوں نے اس کے اندر کو کاٹ ڈالا۔ نمکین سمندری ہوا اپنی نمی میں ماحول کی تلخی اور جلتی ہوئی بدبوؤں کو جذب نہ کر سکی۔ کرتی بھی کیسے انسان کے جلتے ہوئے جسموں اور پگھلتی چربی کی بساند نے تو عرش کے کنگرے ہلا ڈالے۔ انسانوں اور گاڑیوں کے سیل بے رواں میں زندگی سسکتی رہی بلکتی رہی۔ اسے پتہ بھی نہ چلا۔ کہ کیسے سب کچھ ہو گیا اسے تو ایسے لگا جیسے کسی نے اسے پکڑ کر ہوا میں اچھال دیا۔ اور وہ لپک کر اس بوسیدہ سی چاردیواری میں گھس گیا۔ اب وہ وقت کی مٹھی میں تھا کہ اس کے ذہن میں گزرے لمحات کی کڑیاں جڑنے لگیں۔ تو آنکھیں برس پڑیں اور اس کی جھاڑی اس میں کچھ بھی نہیں تھا صرف کسی بچے کے جلے ہوئے دو ہاتھ پڑے تھے۔

<u>۔بقیہ کھونچے۔</u>

زندگی کی مجبوریاں جب سب کچھ ہو چکا تو دونوں آرام سے بیٹھ گئیں۔ حادیہ نے کلیم کو اسد (نائلہ کا بیٹا) کے برابر لٹا دیا۔ دونوں سو رہے تھے۔ اچانک اُسے ایک عجیب سا احساس نے آگھیرا اِک سرطھری بدن میں دوڑ گئی۔ ذہن میں سرسراہٹ سے ہونے لگی۔ زبان لکنت سے مظطرب ہوتے ہوئے بھی چند لفظوں کی صورت گویا ہوئی۔

''یہ.... یہ.... یہ.... دو..... دونوں..... ایک جیسے ..... لگ .... ر ..... ہ..... ہے.... ہیں۔''

''ھاں جیسے دونوں جڑواں ہوں۔'' نائلہ کی آواز اُسے کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

''عمر کے واضح فرق کے علاوہ دونوں بچوں کے ناک نقشے میں کوئی فرق نہ تھا۔

+ +

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی سوویں کتاب

''مشاہیر ادب سے مصاحبہ'' کے بعد تین نئی کتابیں

۱۔ بیہاری کی بھاشائیں (تنقید ہندی) صفحات: ۱۴۴ قیمت: ۱۵۰ روپے

۲۔ پرتی نیدھی انگیکا کہانیاں (انگیکا) صفحات: ۱۹۰ قیمت: ۱۵۰ روپے

۳۔ اصلی نقلی بریشہ (اردو بچوں کے لیے) صفحات: ۸۸ قیمت: ۵۰ روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸ وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶ (بھارت)

۔بقیہ نانی خیر والی۔

پتہ نہیں میری آمد کی خبر گاؤں والوں کو کیسے ہوگئی۔ لوگوں کا ایک ہجوم میری طرف اُمڈتا ہوا چلا آ رہا تھا اور اُسکے بعد مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ ہم سب اشکوں کی طغیانی میں کیسے بہتے چلے گئے۔ جب کچھ آنسو پونچھ گئے تو میں نے نانی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ گاؤں والے مجھے جلوس کی شکل میں اُس جگہ پر لے کر چلے گئے جہاں نانی نے اپنے لئے ایک نیا بسیرا ڈھونڈ لیا تھا۔ یہ گاؤں کا قبرستان تھا، جہاں نانی بڑی نیند سو رہی تھی۔ گاؤں والوں کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ ایک دن بندوق برداروں اور فوج کے بیچ جھڑپ ہوگئی۔ نانی معمول کے طرح چنار کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اُداس اور غمگین کر گولیوں کی دنا دن شروع ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ نانی کچھ سمجھ پاتی وہ فائرنگ کی زد میں آ گئی اور اس چنار کے بدن کی طرح نانی کا بدن بھی گولیوں سے چھلنی ہوگیا۔ نانی کا بدن تو برسوں پہلے گولیوں سے چھلنی ہوا تھا مگر مجھے تو لگ رہا تھا کہ وہ ساری گولیاں ایک ایک کر کے میرے بدن میں اُترتی چلی جا رہی تھیں میں نانی کی قبر پر بڑی عقیدت سے یوں ہاتھ پھیرنے لگا جیسے میں اُسکے زخموں کو سہلا رہا ہوں۔ اچانک کسی کی سرگوشیانہ آواز میرے کانوں میں گونجی۔

''اب نانی کی خبر لینے آئے ہو؟ بہت دیر کر دی تم نے آنے میں بیٹا۔ خیر اب آئے ہو تو خیر سے ہی رہنا بیٹے۔''

میرے اندر ایک تلاطم سا اُٹھا۔ میں اپنے جذبات کو روک نہیں پایا۔ میں قبر پر گر کر بچے کی مانند بلک بلک کر رونے لگا۔

☆☆☆

سیڑھیاں

یٰسین احمد

رام بابو کی دن بہ دن بڑھتی ہوئی مقبولیت سے برسر اقتدار جماعت بوکھلا اٹھی تھی۔ رام بابو ایسا رہنما تھا جس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ وہ جو کہتا تھا کر دکھاتا تھا۔ اُس کا یہی عمل اسے شہرت بخش رہا تھا۔ حالانکہ اُس نے باضابطہ اپنی کوئی جماعت نہیں بنائی تھی۔ لیکن جس حلقے سے اگلے چناؤ میں حصہ لینے کی توقع تھی وہ برسر اقتدار جماعت کے وقار کی سیٹ تھی۔ اگلا چناؤ بہت دور تھا۔ لیکن رام بابو ابھی سے ماحول بنا رہا تھا۔ رام بابو کے مخالفین کا خیال تھا کہ اس میں کامیاب رہنما بننے کے جراثیم ہی موجود نہیں ہیں۔ وہ رہنما نہیں بن سکتا جو وعدہ کرے اور مکر جائے۔

دو ڈھائی سال پہلے رام بابو سے کوئی واقف نہیں تھا۔ وہ آندھی اور بگولے کی طرح اٹھا اور طوفان کی طرح چھا گیا۔ اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ بچپن، پچپن برس اسی شہر میں گذرے تھے۔ یہیں تعلیم حاصل کی تھی۔ رام بابو کا باپ ایک بہت بڑی رائس ملز کا مالک تھا۔ وہ اب ضعیف ہو چلا تھا چاہتا تھا کہ رام بابو اُس کا کاروبار سنبھال لے۔ لیکن رام بابو کو دھان، چاول، بھوسا اور کنکی کے بوروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے مستقبل کو ان دیوہیکل مشینوں کی نذر کرنا نہیں چاہتا تھا جس کی گڑگڑاہٹ سے اُس کے احساس کی نازک رگیں تن جاتی تھیں۔ اس کے باپ کو اس کاروبار سے کیا ملا تھا؟ عمر کے آخری حصہ میں دمہ کا مریض بن گیا تھا۔

حالانکہ یہ اس کا موروثی کاروبار تھا۔ اُس کے باپ دادا نے اسی رائس ملز سے لاکھوں بلکہ کروڑوں کی جائیداد اور روپیہ پیسہ بنایا تھا۔ لیکن رام بابو کو روایتوں کی غلامی پسند نہیں تھی۔ وہ ان روایتوں کے حصار سے نکل کر کچھ اور کرنا چاہتا تھا۔ جہاں دولت ملے اور شہرت بھی۔ نام بھی ہو اور عزت بھی ملے اور سیاست سے اچھا کاروبار کیا ہو سکتا تھا؟ پڑھا لکھا تھا۔ دنیا کو زیر کرنے کا ہنر جانتا تھا۔ چنانچہ ضعیف باپ گھر پر بیٹھنے لگا تو اپنے جوان شادی شدہ بیٹے کو رائس ملز سونپ دی اور خود سیاست کے میدان میں کود پڑا۔

لگتا تھا جیسے کامیابی خود رام بابو کے قدم چومنے کے لئے بیتاب ہے۔ کچھ رشتے دار ساتھ تھے، کچھ دوست ساتھ تھے، جب عملی سیاست میں قدم رکھا تو کامیابی اُس کے قدم چومنے لگی یوں بھی وہ خالی الذہن سیاست میں نہیں آیا تھا۔ اُس کے پاس دولت تھی۔ پلان تھا۔ منصوبے تھے۔ جس کے سبب وہ آگے ہی بڑھتا گیا۔ کچھ ہی مہینوں میں عوام رام بابو کے گن گانے لگی۔

ایک بھرے پُرے جلسے میں رام بابو نے کہا، "میرا تعلق کسی باہر کے ملک سے نہیں ہے۔ میرا خمیر اسی شہر کی مٹی سے اٹھا ہے۔ یہیں میں نے تعلیم حاصل کی ہے۔ اپنے تعلیمی دور میں ہی مجھ کو احساس ہوا تھا کہ ہم لوگ تعلیم کے اعتبار سے دنیا سے کتنے پیچھے ہیں اور اس کی ذمہ دار بہت حد تک حکومت ہے۔ تعلیم کو اتنا مہنگا کر دیا ہے کہ غریب اور متوسط طبقے کے افراد کے لئے تعلیم حاصل کرنا آسان نہیں رہا۔ آزادی سے پہلے جو سرکاری مدارس تھے اُن میں سے بیشتر کو مقفل کر دیا گیا اور جو بچے کچے مدارس تھے ان کی حالت انتہائی خستہ ہے۔ نتیجتاً خانگی مدارس کے مالکوں نے درس گاہوں کو سلاٹر ہاؤس بنا دیا۔ ڈونیشن، فیس اور کمپیوٹر کے نام پر غریب طلباء کے والدین کو ذبح کیا جا رہا ہے۔ اس لئے میں اس شہر میں ایک ایسا اسکول قائم کرنا چاہتا ہوں جہاں عام طبقے کے افراد کو دشواری نہ ہو۔ میرا اسکول عصر حاضر کا شاہی تعلیمی ہوگا۔ جہاں کمپیوٹر ٹکنالوجی، سائنس اور دیگر علوم کی تعلیم کم سے کم فیس میں دی جائیگی۔"

رام بابو کی جذباتی تقریر صرف زبانی جمع خرچ نہیں تھی۔ اگلا تعلیمی سال شروع ہونے سے پہلے ہی اسکول کی عظیم الشان عمارت کھڑی کر دی۔ جہاں ابتدائی تعلیم سے لے کر دسویں جماعت تک کی تعلیم کا انتظام تھا۔ رام بابو کے اس کارنامے نے عوام کا دل جیت لیا۔ اسکول کے افتتاحی موقعہ پر وزیر تعلیم نے شرکت کی تھی۔ ربن کاٹی اور کچھ رسمی فقرے ادا کئے اور چلتے بنے۔ افتتاحی کاروائی کو براہ راست ٹیلی کاسٹ کیا گیا تھا۔

ایک خاتون صحافی نے مسکراتے ہوئے رام بابو سے سوال کیا، "آپ نے بہت شاندار اسکول بنایا ہے۔ اس کی تعریف یقیناً کی جائے گی۔ لیکن کیا اسکول میں آپ کے بچے یا آپ کے خاندان کے بچے بھی تعلیم پائیں گے۔؟"

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ رام بابو نے اپنے اکلوتے پوتے کو مشن اسکول سے اٹھا کر اپنے اسکول میں داخل کرا دیا۔ رام بابو نے اسکول نہیں کھولا تھا بلکہ اپنی قسمت کا دروازہ کھول لیا تھا، اس کے اس اقدام نے عوام کو گرویدہ بنا لیا۔ راتوں رات اس کا نام محلے سے نکل کر شہر کے دوسرے علاقوں میں پھیل گیا تھا۔

چھ مہینے گذرے تھے۔ رام بابو نے ایک چیرٹی ہسپتال قائم کر دیا۔ یہ ہسپتال ان دواخانوں سے مختلف تھا جہاں دوائیں نہیں رہتیں۔ ڈاکٹرز نہیں رہتے۔ اسٹاف سلیقے کا نہیں ہوتا۔ رام بابو کے ہسپتال میں ایک ہزار سے زائد بستروں کا انتظام تھا۔ تجربے کار ڈاکٹرز تھے۔ ہمدرد اسٹاف تھا، عصر جدید کے جراحی آلات مہیا تھے۔ ہر قسم کے امراض کا معقول علاج تھا۔ عوام جہاں رام بابو کے اس کارنامے پر حیران تھے وہیں مخالفین پریشان...

افتتاحی موقع پر میڈیا کا ہجوم ٹوٹ پڑا تھا۔ رسمی کاروائیوں کے بعد رام بابو اوٹ پیشنٹ کے شعبہ میں آیا۔ میڈیا والے ادھر بھی لپکے۔ انتظامیہ کے ایک کارکن کو بلا کر اوٹ پیشنٹ رجسٹر میں اپنا نام لکھوایا، مقررہ فیس ادا کی اور

کہا۔ ''میں نے ہر کام کی ابتداء اپنے آپ سے یا اپنے گھر کے کسی فرد سے شروع کی ہے۔ آپ میرا مکمل چیک اپ کریں۔ مسلسل کام کی وجہ سے تھکن سی محسوس ہو رہی ہے''

تین چار دن بعد رام بابو کو برسراقتدار جماعت کے ایک رہنما نے فون کیا۔ رام بابو اُس سے واقف تھا۔ ہمدردانہ لہجے میں وہ کہہ رہا تھا۔ ''رام بابو تم کو کیا ہو گیا ہے؟ باپ دادا کی خون پسینے کی گاڑھی کمائی کو پانی کی طرح بہا رہے ہو''

رام بابو خندہ پیشانی سے مسکرایا۔ ''ہر ایک کے کام کرنے کا ڈھنگ الگ الگ ہوتا ہے''

''بے شک۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''لیکن یہ عوام ہیں، عوام۔ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کل ووٹ دیتے وقت کیا فیصلہ کریں گے۔ کنگال ہونے کے بعد اگر چناؤ ہار جاؤ گے تو اس ہسپتال میں بھی صحیح علاج نہیں ہوگا جس کو تم نے خود تعمیر کیا ہے''

رام بابو نے رسیور رکھ دیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ فون پر دھمکیاں ملتی رہتی تھیں۔ خطوط بھی آتے تھے۔ سی بی آئی، انکم ٹیکس کے دھاوں سے بھی ڈرایا جاتا تھا۔ اس کے خلاف بہت کچھ کہا جا رہا تھا جسے میڈیا والے اچھال رہے تھے۔ رام بابو ان باتوں کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا، ہر صورت میں ہر حالت میں اور ہر قیمت پر...!

اُس دن وہ اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ چپراسی نے دو آدمیوں کے آنے کی اطلاع دی۔ رام بابو نے ان کو اندر بلایا۔ وہ دونوں عمر رسیدہ تھے۔ صاف ستھرے پوشاک میں، مہذب اور پڑھے لکھے نظر آتے تھے۔ پہلے انہوں نے رام بابو کو سراہا اور پھر ان میں سے ایک بولا۔ ''آپ نے ہسپتال اور اسکول بنا کر ہماری ایک ضرورت کی تکمیل کی ہے۔ ممکن ہے کہ حکومت بھی آپ کی تقلید کرے۔ ہم لوگ آپ کی توجہ ایک اور اہم کام کی طرف کرانا چاہتے ہیں۔ وہ ہے اولڈ ایج ہوم!''

''اولڈ ایج ہوم؟''

رام بابو نے دہرایا۔ اُن میں سے ایک بولا۔ ''جی! اولڈ ایج ہوم! آپ شاید جانتے ہیں اس شہر میں دس ہزار سے بھی زیادہ عمر رسیدہ افراد بے سہارا ہیں۔ بے آسرا ہیں۔ باہر کے کئی ممالک میں تو ایسے عمر رسیدہ افراد کے لئے اولڈ ایج ہوم بنائے جاتے ہیں لیکن اس شہر میں اب تک ایسا کوئی کام ہماری معلومات کے مطابق نہیں ہے''

رام بابو سوچ میں ڈوب گیا۔ اولڈ ایج ہوم کے بارے میں اُس نے بہت کچھ سنا تھا۔ لیکن اب تک اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی۔ اُن کی بات رام بابو کے دل کو لگی۔ بلاشبہ اپنی نوعیت کا منفرد کام تھا۔ اگر یہ پروجیکٹ مکمل ہو جائے تو اس کی شہرت میں اور اضافہ ہو سکتا تھا۔ چناؤ میں تو ایک ایک ووٹ کی اہمیت ہوتی ہے۔ دس ہزار افراد کے لئے اولڈ ایج ہوم بنانا تو اس کے بس کی بات نہیں تھی لیکن دو ڈھائی سو بے سہارا افراد کے لئے ٹھکانہ کا مستقل انتظام کر سکتا تھا اور ان کے یہ چھوٹی دو ڈھائی سو ووٹ اس کے کھاتے میں آ سکتے تھے۔

شہر سے پچیس تیس میل دور ایک افتادہ زمین جو رہائش کے قابل تھی اور نہ کاشت کے، اس سلسلہ میں کام آ سکتی تھی۔ یہ زمین اس کے باپ نے کوڑیوں کے مول خریدی تھی۔ رام بابو کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو دھن کے پکے ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے پایہ تکمیل تک پہنچا دیتے ہیں۔

اولڈ ایج ہوم کے بنانے کا خیال دماغ میں سمایا اور پھر تعمیر بھی ہو گیا اور اتنا خوبصورت اولڈ ایج ہوم تعمیر ہوا کہ دیکھنے والوں کی عقل دنگ رہ گئی۔ تقریباً تین سو افراد کے رہائش کی سہولتیں اس اولڈ ایج ہوم میں فراہم کی گئی تھیں۔ چہل قدمی کے لئے خوبصورت گارڈن، ہر قسم کی کتابوں سے بھری ہوئی لائبریری، کھیل کود کے لئے علیحدہ میدان، وسیع عریض ڈائننگ ہال۔ آرام دہ فرنیچر وہ اولڈ ایج ہوم کہاں تھا۔ ایک اعلیٰ قسم کا ہسپتال تھا۔ ایک، دو ستارہ والا ہوٹل تھا۔ معقول اور ہمدرد اسٹاف کا بھی تقرر ہو گیا۔ افتتاح سے پہلے ہی داخلے کے لئے درخواستیں آنی شروع ہو گئیں۔

رام بابو نے اس اولڈ ایج ہوم کا افتتاح بھی اسی شان و شوکت سے کیا جس طرح ہسپتال اور اسکول کا ہوا تھا۔ افتتاح کے وقت وہ لوگ موجود تھے جو صحیح معنوں میں اس کے دوست تھے اور وہ بھی جو اُس سے خار کھاتے تھے اور اس دن اتنی گہما گہمی نظر آئی جیسے شہر سے دور ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہو گیا ہو۔ رام بابو نے ان سب کا شکریہ ادا کیا اور پھر اس اولڈ ایج ہوم کے قیام کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ جیسے ہی اُس کی گفتگو ختم ہوئی جلسہ گاہ سے ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا اور اونچی آواز میں کہا۔

''رام بابو جی! آپ نے اسکول کھولا تو سب سے پہلے اپنے پوتے کو اُس اسکول میں داخل کروایا۔ ہسپتال بنایا تو سب سے پہلے اپنے آپ کا میڈیکل چیک اپ کرایا۔ اس رسم کو روایت بنانا ہو تو اس اولڈ ایج ہوم میں بھی اپنے ہی خاندان کے کسی فرد کو شریک کرنا پڑے گا''

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رام بابو اس قسم کے سوالات سننے کے لئے پہلے سے ہی ذہنی طور پر تیار تھا۔ وہ نہ گھبرایا اور نہ ہچکچایا۔ اپنے اولڈ ایج ہوم کے انچارج کو اشارہ سے بلایا اور مائک انچارج کے ہاتھ میں تھما کر ان لوگوں کے نام پڑھنے کے لئے کہا جنہوں نے اولڈ ایج ہوم میں داخلہ کی درخواستیں دی تھیں۔

انچارج نے فہرست میں جو نام سب سے پہلے پڑھا وہ رام بابو کے باپ کا تھا۔

گھونچو

ڈاکٹر عمران مشتاق (یو۔کے)

مری، نتھیا گلی، ایوبیہ، کاغان وناران کے حسین مرغزاروں میں، جب وہ یادگار ہنی مون گزار کے واپس کراچی لوٹی، تو دو خبریں اُسکی منتظر تھیں۔ اُسکے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے اور وہ بھی اُسکے بغیر۔ اُسکی بہترین دوست نائلہ جسے وہ بہنوں سے بھی زیادہ عزیز رکھتی تھی جس کی چند روز پہلے شادی ہو گئی تھی اور اتنا ہی نہیں کل وہ اپنے "پیا" کے سنگ لاہور بھی سدھاری تھی۔

"کمینی کہیں کی! اتنا بھی نہ ہوا کہ میرا انتظار کر لیتی۔ آخر ایسی کیا ایمرجنسی آپڑی تھی؟" اپنی سوچ کو اُس نے سوال کی صورت اپنی اماں کے سامنے رکھا تو وہ بولیں۔ "مجھے پتہ ہے کہ تمہیں اِس خبر سے بہت تکلیف پہنچی ہے وہ بھی راضی نہ تھی بس حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے کہ نائلہ کی شادی فوراً ہی ہو گئی۔ اُسکا لاہور سے آیا ہوا کزن اور اُسکے ماں باپ نے ایسے جلدی ڈالی کہ نائلہ کے اماں باوا کو ماننے ہی پڑی۔"

"اتنا تو وہ آپ کر ہی سکتے تھے کہ مجھے اِس 'حادثے' کی اطلاع ہی دے دیتے۔" وہ روہانسی سے ہو گئی۔

"بیٹی میں تو کرنا چاہتی تھی مگر نائلہ نے منع کر دیا تھا اُسکا کہنا تھا کہ تم اپنا ہنی مون کینسل کر کے فوراً واپس آجاؤ گی۔" اماں نے صفائی پیش کرنا چاہی۔

"بھاڑ میں گیا ہنی مون۔ میرے لئے اُسکی شادی میں شرکت سے بھی زیادہ کوئی چیز اہم ہو سکتی تھی۔" اُسکی شعلہ برساتی آنکھوں میں یکدم آنسو بہنے لگے۔ یہ ایک ایسا جھٹکا تھا جس سے سنبھلے کیلئے اُسے وقت درکار تھا۔ اماں یہ جانتے ہوئے بھی دل مسوس کر رہ گئیں۔

"میں اُس کمینی بے وفا سے کبھی نہ بولوں گی۔" وہ کہتے ہوئے اُٹھ گئی تو اماں کا دل کٹ کے رہ گیا۔ رات کو یہی بات اُس نے اپنے شوہر سلیم سے کی تو وہ لاپرواہی سے بولا۔ "ہم تو پہلے سے ہی جانتے تھے کہ وہ ہرجائی ہے پر تم ہماری بات مانو تو نا۔"

"اس میں ہرجائی پن کی کیا بات ہے۔" وہ چڑ گئی۔ "اچھا اب سمجھ آئی آپ اپنا جلاپا نکال رہے ہیں۔ کیوں گھونچو جی۔" وہ ہنسی اور یکدم اُسکا موڈ ٹھیک ہو گیا۔

"خبردار جو تم نے مجھے گھونچو کہا۔" سلیم نے آنکھیں نکالیں تو وہ ہنستی ہی چلی گئی۔ "خدا کی قسم تم پورے گھونچو لگ رہے ہو۔ وہ نائلہ کی بچی ٹھیک کہتی ہے۔ تم ہو ہی گھونچو......... گھونچو......... گھونچو۔"

"فون کروں یا خط لکھوں۔" اتنی دیر سے وہ یہی سوچے جا رہی تھی۔ غصہ بھی تھا اور یہ جاننے کی چاہت بھی کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ کچھ سوچ کے اُس نے کاغذ قلم سنبھال لیا۔

جان سے عزیز مگر بے حد کمینی اور ہرجائی کے نام

بم پھٹ پڑا تھا، کوئی جاں بلب تھا یا تجھ سے ہی انتظار نہیں ہو رہا تھا کہ تو نے فٹ بیاہ رچا لیا۔ میرا انتظار بھی نہ ہو سکا میرے تو سارے ارمان دل میں ہی رہ گئے نا۔ تم نے مجھے بے حد مایوس کیا ہے میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ تم میرے ساتھ اپنی بہترین سہیلی کے ساتھ، عزیز بہن کے ساتھ ایسا کرو گی۔ اب خود ہی اپنی سزا تجویز کر ڈالو ورنہ میں آ رہی ہوں لاہور۔ "اِسے دھمکی ہرگز نہ سمجھنا"

میرا دل اتنا جلا ہوا ہے کہ میں تجھ سے رابطہ ہی نہیں کرنا چاہتی تھی مگر سلیم صاحب نے سمجھایا کہ نہیں پوچھ تو لو کہ آخر ایسی کیا افتاد آپڑی کہ سب کچھ جلدی میں کرنا پڑا۔ تو جناب میں آفیشلی تم سے اِس معاملے کی رپورٹ طلب کر رہی ہوں سات دن کے اندر اندر اگر ہمیں مطمئن نہ کیا گیا تو پھر تم جانتی ہی ہو۔۔۔؟ آگے کیا لکھوں بس اتنا ہی کہ سلیم بہت اچھے ہیں اور میرے لیے گھونچو ہی ہیں پر وہ نہیں جو تم سمجھتی ہو۔

تم سے اب بھی بہت پیار کرنے والی

حادیہ سلیم

چار دن کے بعد نائلہ کا فون آ گیا، تو حادیہ اُسے بے بھاؤ کی سناتی رہی، وہ چپ چاپ سنتی رہی اور جب حادیہ سارا غبار نکال بیٹھی تو پھر وہ بولی۔ "شکر ہے تمہارا سارا غم وغصہ تو نکلا۔ اب بغیر قطع کلامی کے میری ساری بات سنو۔" حادیہ کو وہ بہت سنجیدہ لگی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "تجھے پتہ ہی ہے کہ ابا کو میری شادی کی بڑی فکر لگی ہوئی تھی اور جب سے تیری شادی ہوئی ہے وہ کچھ زیادہ ہی پریشان رہنے لگے تھے۔ ارشد کے والد (ارشد اُسکے شوہر کا نام تھا) ابا کے دور کے بھائی ہیں اُن سے ابا کی نہ جانے کیا بات ہوئی کہ دنوں میں دونوں شادی کے لئے تیار ہو گئے۔ ابا کو یہ دھڑکا سا لگ گیا ہے کہ اُنکی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ جب سے اُنہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے بس ایسے ہی ہو گئے ہیں۔"

"چچا جان یقیناً ایک لمبی عمر جئیں گے۔" حادیہ نے خلوص سے دعا دی۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اُنہیں کون سمجھائے۔" نائلہ نے اُسکی بات کاٹ دی۔ "میں اتنی جلدی کیلئے راضی نہ تھی مگر ابا کی منطق کے آگے کسی کی نہ چلی۔"

"مجھے بلانے میں آخر کیا قیامت تھی؟" اُسکے لہجے میں تلخی در آئی۔

"میری جان میں تیرا ہنی مون برباد نہیں کرنا چاہتی تھی اور وہ بھی گھونچو کے ساتھ۔"

"بھئی اب تم اُنہیں گھونچو کہنا چھوڑ دو اب وہ تمہارے دُلہا بھائی، بہنوئی / بہنوئی وغیرہ وغیرہ ہیں۔"

"تم کہتی ہو تو اب نہیں کہیں گے۔" حادیہ کو نائلہ کچھ بجھی بجھی سی لگی۔

''تم ٹھیک تو ہونا۔ ارشد کیسے ہیں؟ تم خوش ہو؟'' حادیہ نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

''میں بہت خوش ہوں۔ ارشد بہت ہی اچھے ہیں بس کھونچو نہیں ہیں۔''

نائلہ ہنسی تو حادیہ کی جان میں جان آئی۔ ایسی ہی کچھ باتوں کے بعد نائلہ نے فون بند کیا تو وہ پوری طرح سے مطمئن ہو چکی تھی۔

نائلہ سے اسکی دوستی چار برس پرانی تھی۔ کالج میں پہلے دن دونوں ملیں تو پھر ہمیشہ کیلئے دوستی کے مضبوط رشتے میں بندھ گئیں۔ نائلہ نے سلیم کو پہلی بار دیکھا تھا تو جی کھول کر ہنسی تھی اور حادیہ کا خوب مذاق اُڑایا تھا کہ ''اس نے کس ''کھونچو'' کو شریک حیات کے طور پر چنا ہے۔''

''میں نے نہیں چنا وہ میرا ماموں زاد بھائی ہے اور ہماری منگنی بچپن میں ہی طے کر دی گئی تھی۔'' اس نے برا مانتے ہوئے بھی ساری تفصیل بتانا ضروری سمجھا تھا۔

''یہ شروع سے ہی ایسا ہے یا ''جوانی'' اپنا کام دکھا گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ۔۔۔'' نائلہ مزے لے لے کے کہنے لگی۔ ''پتلا ڈبلا سا قد، پورا کھمبے کا کھمبا، جیسے ڈانگ ہو، ہڈیاں ہی ہڈیاں سوکھا درخت، چہرے پہ ازلی یتیمی برستی ہوئی۔ اب تم خود ہی بتاؤ ایسا شخص ''کھونچو'' کے علاوہ کچھ اور ہو سکتا ہے۔''

''بس یا کھونچو کی اور بھی کچھ صفات ہیں؟'' حادیہ جانتی تھی کہ اسے نئے نئے الفاظ ایجاد کرنے کی بیماری سی ہے۔

''ابھی کہاں جناب'' وہ شرارت سے مسکرائی۔ ''چلتے تو یوں جیسے پنڈولم ڈول رہا ہو۔ اب گرا کہ تب۔ آنکھوں سے جھانکتی مسکینی کہ جیسے کہہ رہا ہو کہ مجھے گود لے لو تمہیں اللہ کا واسطہ۔''

''اب بس بھی کرو تو پوری شیطان کی خالہ ہے'' حادیہ کوشش کے باوجود اپنی ہنسی نہ روک سکی۔

حادیہ کو کالج لانے لیجانے کی ذمہ داری سلیم پہ تھی وہ جب نائلہ کو دیکھتا تو اُسکے چہرے پہ کھیلتی شرارت سے نروس ہو جاتا اور اُسکی کوشش ہوتی کہ اُسے نائلہ سے بات ہی نہ کرنا پڑے پر وہ خود کہاں باز آتی تھی اُسے مخاطب کر کر کے چھیڑتی اور مزا اُٹھاتی۔

''نائلہ تو باز آ جا وہ بیچارہ اتنا شریف ہے اور تو اُسے زچ کر دیتی ہے'' ایک دن حادیہ نے اُسے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔

''ہاں ایک وہ بے چارہ اور دوسرا لالو پرشاد'' اِک شریر ہنسی نے اُسکے لبوں کو چھوا۔

''یہ لالو پرشاد کہاں سے آ ٹپکا۔''

''دیکھ میری بنو اگر وہ کھونچو نہ ہوتا تو لالو پرشاد ہوتا یا پھر چمچو ہوتا۔ بدھو ہوتا یا پھر۔۔ جھنڈو۔''

''بس۔۔ بس بس کھونچو ہی ٹھیک ہے۔ تجھ سے تو خدا ہی سمجھے'' حادیہ اُسکے سامنے خود کو بے بس ہی پاتی تھی۔

سلیم اُس سے نائلہ کے رویے کی شکایت کرتا تو وہ اُسے سرسری انداز میں نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی۔ اپنا رویہ ایسا رکھتی کہ اُس پہ جانب داری کا شائبہ نہ ہو۔ پھر بھی سلیم کے انداز میں کبھی کبھار شکوہ در ہی آتا۔ ''تم تو اپنی سہیلی کی ہی سائیڈ لو گی جبکہ وہ دنیا بھر کا مذاق اُڑاتی پھرتی ہے۔''

''یہ جناب ''دنیا بھر'' کب سے ہو گئے ہیں؟'' وہ شرارت میں بات ٹالنے کی سعی کرتی۔

''حادیہ میں آخر تمہیں کیسے سمجھاؤں؟'' وہ بے بس سا ہو جاتا۔

''بیچاری تھوڑا ہنس بول لیتی ہے تو اِس میں آپکا کیا جاتا ہے اُسکے کہنے سے آپ کوئی سچ مچ کے ''کھونچو'' تھوڑے ہی بن جاتے ہیں۔'' حادیہ کا غیر سنجیدہ انداز سلیم کو کھلتا تو بہت مگر وہ بات بڑھ جانے سے احتراز ہی کرتا۔

یوں ہی ہنستے بولتے کالج کے چار سال بیت گئے۔ حادیہ اور نائلہ کا کالج چھوٹا۔ سلیم کی نوکری مستقل ہوئی تو حادیہ اور سلیم کے والدین نے دونوں کو مزید ''ڈھیل'' دینے کی بجائے یکجائی کا فیصلہ کر دیا۔

حادیہ کا نائلہ سے مسلسل رابطہ تھا۔ دونوں سہیلیاں ایک دوسرے سے ملنے کیلئے بے چین تھی مگر کوئی صورت نہیں بن پا رہی تھی۔ نائلہ کو طبیعت کی خرابی، متلی اور اُلٹیوں نے ادھ موا کیا تو چھ آٹھ ہفتوں بعد حادیہ کی کیفیت بھی اُس سے کچھ مختلف نہ تھی۔ اب حالات کی تبدیلی کی وجہ سے سفر ممنوع قرار پایا تھا۔ نائلہ کے اگلے چند ماہ گھر سے ہسپتال کے چکر لگانے ہی گزر گئے جبکہ حادیہ کی طبیعت ''معمول'' کے مطابق ہی رہی۔

نائلہ نے وقت سے پہلے جب ست ماہی بیٹے کو جنم دیا تو حادیہ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ اُس نے کوریئر کے ذریعے پھول، مٹھائی اور تحائف بھجوائے۔ نائلہ چار ہفتے ہسپتال میں گزار کے واپس آئی اور ابھی ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق سفر کرنے کے قابل نہ تھی۔

حادیہ بھی بیٹے کی ماں بنی تو زندگی میں رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔ سلیم کی مسرت دیدنی تھی۔ سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ نومولود کی شکل باپ پر پڑی ہے۔

''کوئی خاص نام تمہارے ذہن میں ہے'' سلیم نے چند دن بعد پوچھا تو وہ بیٹے کو محبت سے سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔

''ننھا کھونچو۔۔۔'' ''کیا۔۔۔ کیا؟'' سلیم کا منہ بن گیا۔

بیٹے کا نام کلیم تجویز ہوا۔ کلیم ابھی چار ہفتے کا ہی تھا کہ اُسے پتہ چلا کہ نائلہ امی کے گھر آئی ہے۔ وہ دوڑی دوڑی گئی۔ گلے شکوے حالات کا رونا،

سارا تی دقت کی مٹھی میں۔

بلاؤز

راجندر رورما (ہریانہ، بھارت)

''سنو جی۔ سو بات کی ایک بات۔ میں آپکو آخری بار تنبیہ کر دیتی ہوں کہ اگر وہ کلمو ہا سوتُو اب سے میرے گھر آیا تو مجھ سے بڑا کوئی نہ ہوگا۔ ایسا ڈھیٹ آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ لاکھ بار پھٹکارنے کے بعد بھی اپنا بدنما چہرہ اٹھا کر چلا آتا ہے اور چار پانچ گھنٹے برباد کرنے کے سے پہلے ہلنے کا نام تک نہیں لیتا۔ پتہ نہیں ایسے لوگ شرم سے غرق دریا کیوں نہیں ہو جاتے۔ آخر کسی چیز کی حد ہوتی ہے۔''

''بس کرو بیگم بس کرو! تم کونسی حد میں رہنے والی ہو! دو منٹ میں اچھے بھلے آدمی کی پگڑی اچھال رہی ہو۔ تمہیں اس کے بارے کافی غلط فہمی ہے۔ وہ یہاں کوئی شراب پینے یا جوا کھیلنے نہیں آتا۔ وہ تو شطرنج کا کھلاڑی ہے اور محض شطرنج ہی کھیلنے آتا ہے اور تم جانتی ہو کہ شطرنج کھیل ہی ایسا ہے کہ اس میں وقت گزرنے پتہ ہی نہیں چلتا۔ وہ تم پر کونسا بوجھ ڈالتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ شکر کے چائے کی ایک پیالی پیتا ہے اور وہ بھی تم دیدہ دانستہ کبھی کبھی ٹال جاتی ہو۔ بیگم صاحبہ شطرنج ایک شاہی شغل ہے جو کہ عالی دماغ لوگ ہی کھیلتے ہیں۔ تمہیں بخوبی علم ہے کہ مجھے بھی اس کھیل کا بےحد شوق ہے۔ اگر میں چند گھڑیاں بساط کی نذر کر لیتا ہوں تو کونسا گناہ کر دیتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم عابد کی بیوی کی نقل کرنا چاہتی ہو جو ہر روز اپنے میاں کے بازو میں بازو ڈال کر گھر سے نکل جاتی ہے اور رات کے بارہ بجے تک کسی نہ کسی پانچ ستارہ ہوٹل میں رنگ رلیاں منا کر آتی ہے۔ تم جانتی ہو کہ نہ تو میرے پاس دو نمبر کا پیسہ ہے اور نہ ہی مجھ میں ایسی عادت معیوب ہے میرا۔۔۔۔''

ابھی صادق اپنی بات پورے طور پر کہہ ہی نہ پایا تھا کہ جمیلہ بات ٹوک کر بولی ''دیکھو میاں جی۔ میں نے کب کسی پانچ ستارہ ہوٹل جانے کی فرمائش کی ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ میرے میاں کی شام میرے ساتھ گذرے۔ کیا تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے؟''

''جمیلہ۔ کیا تم اس بات سے انکار کر سکتی ہو کہ تیرا سارا دن اور ساری شام خواتین کے لیے نئے نئے لباس ڈیزائن کرنے میں صرف ہو جاتی ہیں۔ ہر تیسرے دن تیری فیشن پریڈ ہوتی ہے تمہارے پاس میرے لیے وقت کہاں ہے؟ جب تم مصروف ہوتی ہو تم میں تو کٹی پتنگ کی طرح محسوس کرتا ہوں۔ تمہیں تو اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جو تمہارے شوہر کو گھر پر باندھے رکھتا ہے اور بیرونی خرافات سے دور رکھتا ہے۔''

''چاہے کچھ بھی ہو۔ میں تمہیں گھنٹوں شطرنج کے کھیل میں برباد کرنے نہیں دوں گی۔''

اتنے میں گھنٹی بجی اور بیش قیمت میں ملبوس اور خوشبو میں لپٹی ہوئی چند مستورات بلا تکلف گھر میں گھس آئیں اور ہائی۔ ہائی کہہ کر کے بعد دیگرے جمیلہ سے بغل گیر ہوئیں۔ اُن کی آمد سے گھر معطر ہو گیا اور نقرئی ہنسی کی گھنٹیوں سے گونج اٹھا۔ جمیلہ ان سب کو لے کر لابی میں جانے ہی والی تھی کہ گھنٹی پھر سے بجی۔ سوچنے لگی کہ وہ مرزود منحوس پھر سے تو نہیں آ گیا۔ اُس کی سوچ ٹھیک نکلی۔ دروازے پر انور ہی تھا جسے صادق پھرتی سے ڈرائنگ روم میں لے گیا اور جلتی کڑھتی جمیلہ اپنے مہمانوں کے ساتھ مصروف ہو گئی۔

''تمہاری عمر بہت لمبی ہے تمہارے بارے میں بات کر رہے تھے۔''

''مجھ سے میرا ذکر اچھا جو تیری محفل میں ہے''

''تو پھر جمائیں کھیل؟''

''آیا کس لیے ہوں؟

''آج اگر میں نے لگاتار تجھے نہیں ہرایا تو کھیلنا چھوڑ دوں گا۔''

''ارے یہ کیسا عزم ہے؟''

''ہاں یار۔ روز روز میں شکست نہیں کھا سکتا''

''تم اور شکست؟''

''بس آج کچھ ایسا ہی ارادہ ہے''

''چھوڑو ان باتوں کو اور شطرنج بچھاؤ۔''

''ابھی لاتا ہوں''

صادق یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ سائیڈ بورڈ کے دراز میں شطرنج کے مہرے تو تھے مگر سفید اور کالے رنگ کے خانوں والا ریشمی کپڑہ جو انور کے شطرنج کے اچانک گم ہو جانے کے بعد بطور بساط ہوا کر لایا تھا غائب تھا۔ سائیڈ بورڈ کا چپہ چپہ چھان مارا مگر اس کپڑے کی بساط کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ صادق کا ماتھا ٹھنکا کہ ہو نہ ہو یہ جمیلہ کی ہی کرتوت تھی۔ جو ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ شطرنج کھیلے۔ اس وقت گھر کا ماحول ایسا تھا کہ بساط کے بارے جمیلہ سے کچھ دریافت کرنا گھر میں ہنگامہ کھڑا کرنے کے مقابل تھا۔ اُس نے اپنے کندھوں کو ہلکا سا اوپر کی طرف جھٹکا دے کر کہا ''یہ عیاں طور پر جمیلہ کی ہی شرارت ہے مگر اس وقت اس سے کچھ پوچھنا شیر کی مونچھ کو ہاتھ لگانے کے برابر ہے۔ چلو آج گتے پر ہی سفید اور کالے خانے ڈال کر کھیلتے ہیں۔''

یہ کہہ کر صادق نے ایک صاف ستھرے گتے کا ٹکڑہ جو کسی قمیض میں لپیٹ کر آیا تھا لیا۔ اُس پر سفید اور کالے خانے بنائے اور شطرنج کی بازی شروع کر دی۔

کچھ بھی ہو۔ انہیں گتے کے اس معمولی ٹکڑے پر شطرنج کھیلنے کا اصلی مزہ نہیں آ رہا تھا۔ یہاں یہ دوست بے دلی سے شطرنج کھیل رہے تھے اور دوسری

باقی آخری فیصلہ میں۔

دولتِ امکاں

سید مشکور حسین یادؔ (لاہور)

وہ اُس کے ہاتھ جو رنگِ حنا سمیٹتے ہیں
افق افق سے شفق سی دُعا سمیٹتے ہیں

ہے بود و باش ہماری فضائے امکاں میں
بکھیرتے ہیں پتے لاپتا سمیٹتے ہیں

ہماری دولتِ امکاں کو کوئی کیا سمجھے
قدر سے جھولیاں بھر کر قضا سمیٹتے ہیں

بتائے گا یہ ہمارا مہکتا وقت کہ ہم
چٹکتی کلیوں سے کیا کیا ہوا سمیٹتے ہیں

بس ایک لمحے میں کرتے ہیں پار سرحدِ شوق
پلک جھپکتے ہیں ارض و سما سمیٹتے ہیں

اُنہیں خبر نہیں مل جُلنے میں ہے کیا راحت
جُدا جُدا جو جہانِ جزا سمیٹتے ہیں

ہم اپنے آپ کو رکھتے ہیں درمیان میں یادؔ
نہ ابتدا نہ کوئی انتہا سمیٹتے ہیں

○

انور سدید (لاہور)

زمانے سے تکرار کرتے رہو
جو سوچا ہے' وہ یارا کرتے رہو

کبھی اس کی نفرت بھی مٹ جائے گی
محبت کا اظہار کرتے رہو

نتیجے پہ رکھو نہ اپنی نظر
فقط کار دشوار کرتے رہو

روایت میں شامل کرو جدّتیں
روایت سے پھر پیار کرتے رہو

کبھی ان میں بوئیں گے پودے نئے
زمینوں کو ہموار کرتے رہو

نہ احسان اٹھاؤ کسی کا یہاں
خودی اپنی بیدار کرتے رہو

لکھو رنگِ حالیؔ میں انورؔ غزل
زمانے کو بیدار کرتے رہو

○

شبنم شکیل (اسلام آباد)

قدم شبنم یہ کیسا لے رہی ہے
کہ دریا دے کہ صحرا لے رہی ہے

نہ جانے زندگی کیوں مجھ سے واپس
مرا ہر اِک حوالہ لے رہی ہے

ذرا سی موت سے مانگی تھی مُہلت
حیات اَب اُس کا بدلہ لے رہی ہے

محبت بے اثر ہے اور طبیعت
اثر اِس کا بھی گہرا لے رہی ہے

مسافر کس قدر جلدی میں ہے اور
مسافت وقت کتنا لے رہی ہے

نظر کب تک مِلاؤں اُس نظر سے
جو تاوانِ تماشا لے رہی ہے

مسافت رائگاں ہے اور مجھ سے
تھکن اپنا اثاثہ لے رہی ہے

بہت مٹنے کو ہے بے تاب شبنم
کہ سورج کا سہارا لے رہی ہے

○

مظفر حنفی (دہلی)

جو دہشت گرد کہہ کر بے خطا پر وار کرتے ہیں
زمانے کو بغاوت کے لیے تیار کرتے ہیں

ہمارے شہر میں جدت طرازی کا یہ عالم ہے
مسیحا تندرستوں کو یہاں بیمار کرتے ہیں

ہمیں بھی جان پیاری ہے مگر اتنی نہیں پیاری
یزیدِ وقت کی بیعت سے انکار کرتے ہیں

اٹھو لوگو زمانہ چال چلتا ہے قیامت کی
مُوذّن خوابِ غفلت سے تمھیں بیدار کرتے ہیں

یقیناً سیکڑوں کو آج بے گھر بار ہونا ہے
سُنا ہے آج عالی جاہ پھر دربار کرتے ہیں

اگر خاموش رہتے ہیں تو سر جاتا ہے کاندھے سے
ہماری جان جاتی ہے اگر تکرار کرتے ہیں

مظفرؔ زخمِ نشتر سے زیادہ قیمتی شے ہے
جنوں کی ناز برداری مرے اشعار کرتے ہیں

○

ڈاکٹر صابر آفاقی (مظفرآباد،آزادکشمیر)

اس شہنشہ کی سواری آئے گی
ہم فقیروں کی بھی باری آئے گی

اک مصیبت جھیل لی ہے پارسال
اک مصیبت اور بھاری آئے گی

باری باری وہ عطا کرتے ہیں جام
صبر کر تیری بھی باری آئے گی

خشک شاخو۔ بس ذرا سا حوصلہ
آئے گی بادِ بہاری آئے گی

اے دلِ من۔ گر نہ آئے گا قرار
رکھ تسلی بے قراری آئے گی

شیخ جی آساں نہیں شغلِ شراب
آتے آتے بادہ خواری آئے گی

راہ میں آنکھیں بچھی ہیں ہر طرف
آپ کی شاید سواری آئے گی

وادیٔ کشمیر سے وہ رشکِ گل
بیٹھ کر بس میں چناری آئے گی

عشق کرنا سیکھ لو چھوٹے میاں
تم پہ بھی یہ ذمہ داری آئے گی

اس لئے زندہ ہے صابرؔ برف میں
آس ہے بادِ بہاری آئے گی

○

امجد اسلام امجد (لاہور)

تیرا پیغام بھی نہیں آیا
دل کو آرام بھی نہیں آیا

دن کے بھولے کو اور کیا کہیے
ہو گئی شام بھی ' نہیں آیا!

کون تھے وہ جو کامیاب آئے
میں تو ناکام بھی نہیں آیا

دل نے خدمت بھی خوب لی ہم سے
اور کسی کام بھی نہیں آیا

جس کے ہاتھوں پہ خون تھا اپنا
اُس پہ الزام بھی نہیں آیا!

اپنی محفل میں جا وہ کیا دیتا
جو سرِ بام بھی نہیں آیا

○

مامون ایمن (نیویارک)

صحرا میں تماشا نہیں ہوتا بابا
غم آپ مداوا نہیں ہوتا بابا

وجدان سے آگے ہے تصور، یعنی
اُلفت کا سراپا نہیں ہوتا بابا

سایے کو کبھی دھوپ کی خواہش دل کو
جینا کبھی مرنا نہیں ہوتا بابا

رونے کا بہانہ ہے جہاں میں یہ دل
جی کھول کے ہنستا نہیں ہوتا بابا

روزن کا مقدر نہیں ہوتی آندھی
دیوار پہ جھونکا نہیں ہوتا بابا

دل کرب نہ بنتا، جو کبھی آنکھوں نے
سپنا کوئی دیکھا نہیں ہوتا بابا

کٹ جاتی ہے جب آس کی ڈوری کوئی
ہر سانس پہ دھڑکا نہیں ہوتا بابا

جز موت نہیں ملتی کسی کو فرصت
یہ دام ہے، سستا نہیں ہوتا بابا

غیروں سے تعلق ہے وفا کا، ایمنؔ!
اپنوں سے تقاضا نہیں ہوتا بابا

○

حامدی کاشمیری (سری نگر، کشمیر)

سنگ کو شعلہ بیانی دے دوں
اپنے ہونے کی نشانی دے دوں

برف سے جم گئے ہیں صدیوں سے
اِن پہاڑوں کو روانی دے دوں

جلتے صحرا نہیں دیکھے جاتے
اِن کو میں آنکھوں کا پانی دے دوں

دیکھتے ہی آنکھ سے جھڑ جاتے ہو
تم کو شعلوں کی جوانی دے دوں

جی میں آتا ہے لہو کا پیغام
اسکو تاروں کی زبانی دے دوں

سینے میں اُگتا ہے لفظوں کا شجر
میں اِسے کتنے معانی دے دوں

○

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

اس نے کچھ یوں لشکارے ڈالے
میری آنکھوں میں ستارے ڈالے

مجھے بچہ ہی سمجھ رکھا تھا
میری جھولی میں غبارے ڈالے

مَیں نے تو پھول اُچھالے اُس نے
میری آنکھوں میں شرارے ڈالے

کتنے آرام سے بیٹھا ہے وہ
کچی اینٹوں کے چبارے ڈالے

سونت کر تیغ کھڑا ہے سر پہ
کسی بھی لمحے وہ مارے ڈالے

اُس نے کس طرح کی باتیں کی ہیں
باتوں باتوں میں اشارے ڈالے

مَیں نے پھیلایا جو دامن اکبر
اُس نے بھی چاند ستارے ڈالے

○

پی۔ایس جین جوہر (میرٹھ،بھارت)

خلاف بت پرستی جو بہت تقریر کرتے ہیں
وہی سرخم کیئے گل پوشی تصویر کرتے ہیں

فلک پہ چاند،تارے کرتے ہیں سرگوشیاں باہم
زمیں کے باسیوں کی قسمتیں تحریر کرتے ہیں

جو خوش رہتے ہیں اپنی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں ہی
امیروں کے لئے شاہی محل تعمیر کرتے ہیں

وہ کیا سے کیا بنا ڈالیں گے آنے والی دنیا کو
بہت وعدے بڑے پیاں دمِ تقریر کرتے ہیں

کھڑاؤں پاؤں میں ڈالے کمنڈل ہاتھ میں لے کر
غمِ ہستی سے چھٹکارے کی ہم تدبیر کرتے ہیں

ہزاروں پُل ہیں،لیکن فاصلے بڑھتے ہی جاتے ہیں
دِلوں کو جوڑ کہ ہم پُل نئے تعمیر کرتے ہیں

کسی نے خود کو مرتے آج تک دیکھا نہیں سپنوں میں
یونہی خوش فہمیوں میں خواب کی تعبیر کرتے ہیں

گوارا بھی نہیں کرتے ہیں ملنا،غم کے ماروں سے
بہت کم لوگ ہیں جو درد کی توقیر کرتے ہیں

○

قیصر نجفی (کراچی)

بکنا ہے تو اس شہر میں بازار بہت ہیں
گاہک بھی بہت، درہم و دینار بہت ہیں

میں جب سے خلاف اپنے ہوا ہوں تو کھلا ہے
اس شہر میں میرے بھی طرف دار بہت ہیں

آنکھوں میں ہماری تو ہوئے کم نہ اندھیرے
تم لاکھ کہو صبح کے آثار بہت ہیں

اس بار تو آیا ہے عجب مرگ کا موسم
بے وجہ یہاں مرنے کو تیار بہت ہیں

زخم آئے ہیں اس رہ میں ہمیں جس میں سنا تھا
اے ہم نفسو! گلشنِ بے خار بہت ہیں

گل جتنے بھرے ہیں یہ مرے دامن جاں میں
سرکار بہت ہیں، مری سرکار بہت ہیں

لگ جائے گا دل اپنا یہاں جلد ہی قیصرؔ
صد شکر کہ اس شہر میں اغیار بہت ہیں

○

گلشن کھنہ (یو۔کے)

حسین شب ہے کوئی آفتاب دے مجھ کو
شراب دے مرے ساقی شراب دے مجھ کو

جو نفرتوں کے اندھیروں میں روشنی بخشے
محبتوں کا وہی ماہتاب دے مجھ کو

سفر حیات کا گزرا ہے خارزاروں میں
حنائی ہاتھ سے اب تو گلاب دے مجھ کو

تری خموشی مری جان لے کے جائے گی
مرے سوال کا کچھ تو جواب دے مجھ کو

یہ زندگی کا سفر کٹ رہا ہے بے معنی
رہِ طلب میں کوئی تو سراب دے مجھ کو

جگا دے مردہ دلوں میں شعور و فکر کی لو
نئے جہاں کی نئی آب و تاب دے مجھ کو

مری وفا کا بھی گلشن رہے گا اندازہ
زمانہ اپنے ستم کا حساب دے مجھ کو

○

غالب عرفان (کراچی)

مرے شعور کا سنانا میرے بس میں نہ تھا
اگرچہ دشت کہیں کوئی پیش و پس میں نہ تھا

بس ایک ساعتِ تکرار نے دیا دھوکا
گزرنا کوئی بھی لمحہ تو دسترس میں نہ تھا

فضا میں اُڑتے ہوئے لکھ رہا تھا اک تاریخ
پرندہ جو کبھی تہذیب کے قفس میں نہ تھا

بوقتِ آخرِ شب سمتِ شرق اُجلائی
پیام کوئی مگر صبح کے جرس میں نہ تھا

جو شہرِ خوف میں شہزادہ مر گیا اس پہ
اثر نسب کا کسی نبض اور نس میں نہ تھا

خیال و خواب کے گم گشتہ عہدِ عرفاںؔ میں
یہ خوشبوؤں کا سفر یوں نفس نفس میں نہ تھا

○

کوثر صدیقی (بھوپال بھارت)

سایہ نہیں نصیب درختوں کے شہر میں
رہتی ہے سر پہ دھوپ ہنچوں کے شہر میں

ملتا نہیں ہے دانۂ جو کا کہیں سراغ
بطنِ زمیں میں دفن خزانوں کے شہر میں

لطفِ نظارگی ہے چلو مل کے بانٹ لیں
پانی کہاں نصیب سرابوں کے شہر میں

ہوتی نہیں ہے پوری کسی کی کوئی مُراد
چادر چڑھاتے پھر یے مزاروں کے شہر میں

ظاہر ہیں سب کے عیب مگر یہ بھی ہے ہنر
سب لوگ خوش لباس ہیں ننگوں کے شہر میں

پھولوں کو پوچھتا نہیں کوئی کسی بھی بھاؤ
کانٹوں کے اونچے بھاؤ ہیں پھولوں کے شہر میں

دبکے ہوئے سوال ہیں ہر ہونٹ پر مگر
ملتا نہیں جواب سوالوں کے شہر میں

میں اپنی نعش سر پہ رکھے کب تلک چھپوں
خنجر اُٹھائے ناچتی روحوں کے شہر میں

کوثرؔ تمھیں بھی دیدۂ بینا سے کیا ملا
ظلمت میں غرق تیز اُجالوں کے شہر میں

○

انوار فیروز (راولپنڈی)

ایک طوفان اٹھا ہے میرے اندر کیسا
زندگی تو نے دکھایا ہے یہ منظر کیسا

خشک آنکھوں میں چھپا ہے یہ سمندر کیسا
گر مکان خالی ہے پر شور ہے اندر کیسا

میں تو تقدیر کی زنجیر سے وابستہ ہوں!
چھپ کے بیٹھا ہے کمیں گاہ میں یہ لشکر کیسا

نہ میں جیتا ہوں نہ مرتا ہوں مصیبت کیا ہے
میرے سینے پہ ہے حالات کا پتھر کیسا

میرے ہاتھوں میں ہے رسوائی کا پرچم یارو
اس تہی دست کا دنیا میں مقدر کیسا

غم کے پرہول اندھیروں سے نکل آئے ہیں
دھڑکا پھر دل کو لگا رہتا ہے اکثر کیسا

مجھ سے انوار لپٹتے رہے بازو میرے
کوئی خوشبو، کوئی جگنو کوئی پیکر کیسا

○

اسلم راہی (اسلام آباد)

دیے جلا کے بھی ہر آدمی اندھیرے میں
تلاش کرنے لگا روشنی اندھیرے میں

جو روشنی کی طلب ہم نے کی اندھیرے میں
کچھ اور پھیل گئی تیرگی اندھیرے میں

کسی نے پوچھ لیا ظلمتوں کی حد کیا ہے
یہ سن کے شمع کوئی جل اٹھی اندھیرے میں،

سمیٹتی ہیں اب اِس ڈر سے مائیں بچوں کو
اٹھا کے لے ہی نہ جائے کوئی اندھیرے میں

دکھا کے زلفِ سیہ تاب کھو گئی ہے کہاں
مری جوانی مجھے سرمئی اندھیرے میں

پھر اُس نے سوگ منایا چراغ گُل کر کے
اک اور لاش اٹھائی گئی اندھیرے میں

مرے نصیب کی اب رات ہونے والی ہے
یہ کہہ کے شام کی دیوی چلی اندھیرے میں

صریرِ خامۂ مژگاں سے کوئی ایک غزل
کبھی کہے کہ جو میں نے کہی اندھیرے میں

عجیب عدل ہے انصاف ہے نیائے ہے
کہ روشنی میں کوئی ہے کوئی اندھیرے میں

کہا ہے جس نے تفاخر سے روشنی میں ہوں
اسے دھکیل گئی روشنی اندھیرے میں

یہ کس کی طرزِ جفا ہے یہ کس کا طرزِ ستم
وہ کون لے کے گیا اک صدی اندھیرے میں

نہ آبرو وہ تقدس نہ رشتہ و پیوند
کہاں سے لاؤ گے گم ہیں سبھی اندھیرے میں

جمال اُس کا میسر ہُوا مجھے راہیؔ
بڑے سکون سے کی شاعری اندھیرے میں

غُلام مُرتضیٰ راہیؔ (فتح پور بھارت)

شکل صحرا کی ہمیشہ جانی پہچانی رہے
میرے آگے پیچھے دائیں بائیں ویرانی رہے

میرا خطرے کا نشان ہونا' کبھی ظاہر نہ ہو
اے ندی! سر سے مرے اُونچا ترا پانی رہے

اب تجاوز بن گیا معمول' ورنہ مدّتوں
اپنی اپنی حد میں شہری اور بیابانی رہے

آگے آگے میں ترا پرچم لیے چلتا رہوں
ارضِ دل پر میری قائم تیری سلطانی رہے

روشنی کو ہو مری ایسا کوئی ماخذ عطا
ذرّۂ ناچیز میں دن رات تابانی رہے

ساری سمتیں آ کے جس مرکز پہ ہو جاتی ہیں ایک
خَم اُسی جانب ہمیشہ میری پیشانی رہے

نیزہ و شمشیر و خنجر کی اگر افراط ہے
خون کی میری رگوں میں بھی فراوانی رہے

میری کشتی کو ڈبو کر چین سے بیٹھے نہ تو
اے مرے دریا! ہمیشہ تجھ میں طغیانی رہے

یہ اُصول ایسا ہے راہیؔ درگزر جس سے نہیں
ہم ہیں کثرت سے تو لازم ہے کہ ارزانی رہے

ماجد سرحدی (پشاور)

جبیں جبیں پہ لہو اور داغِ رسوائی
کرے کے نام پہ یہ کیسی شامِ غم آئی

امیرِ شہر کے خنجر نے وہ ستم ڈھایا
کہ پھر سے شامِ غریباں کی یاد ابھر آئی

مرا وکیل بھی قاتل کا ہمنوا نکلا
یقین کس پہ کروں کس کو میں کہوں بھائی

میں سازشوں کے جنازے کہاں پہ دفن کروں
یہی تو بات ابھی تک سمجھ نہیں آئی

میں اُسکو اب بھی دعا دے رہا ہوں اے ماجدؔ
کہ جس نے میرے ہی گلشن میں آگ پھیلائی

○

خیال آفاقی (کراچی)

دیکھ تو یہ کون زندہ دل ہے تیرے سامنے
اے مرے عزلت نشیں محفل ہے تیرے سامنے

اک ذرا ہمت پکڑ اے کاروانِ تیز رو
کٹ چکا سب راستہ منزل ہے تیرے سامنے

بے خطر رکھ دے قدم حدِ شہادت گاہ میں
دیکھ تیری زیست کا حاصل ہے تیرے سامنے

اب تری مرضی ہے تو جس دور میں بھی سانس لے
تیرا ماضی حال و مستقبل ہے تیرے سامنے

پھر کوئی صورت بنا' کیا سوچتا ہے کوزہ گر
چاک ہے موجود' آب و گل ہے تیرے سامنے

عشق کو مجنوں بنا لے' حسن کو لیلیٰ سمجھ
بڑھ کے ہاتھ روک لے' محمل ہے تیرے سامنے

شورِ طوفاں میں بھی اک آواز آتی ہے خیالؔ
ڈوبنے والے سنبھل' ساحل ہے تیرے سامنے

○

رؤف خیر (حیدرآباد بھارت)

(عالمی صورت حال کے تناظر میں)

شاطر وہ خواب دیکھتا ہے شاہ مات کا
مہرہ ہے یہ سپاہی اسی کی بساط کا

آتا ہے سر کچلنا ہمیں شر صفات کا
یہ ہت بنا ہوا ہے ہمارے ہی ہات کا

ہے فلسفہ عجیب حیات و ممات کا
دن کا ٹھکانا ہے نہ بھروسہ ہے رات کا

نادان کیسے کیسے کنویں جھانکنے لگا
چکر خراب ہوتا ہے آبِ حیات کا

لاوا پھٹا زمیں سے کبھی آسمان سے
دن رات امتحان ہے پائے ثبات کا

گھر گھر کی مخبری میں بھی وہ پیش پیش ہے
پابند بھی ضرور ہے صوم و صلوٰۃ کا

فنی اشاریت' ادبیت میں حسن ہے
اظہار برملا نہ کرو جنسیات کا

سر پر اٹھا اٹھا کے نہ پانی میں پھینکیے
اب اس میں کیا قصور ہے لات و منات کا

طعنے ہے رؤف خیر ادا کر رہا ہوں میں
کچھ فرض دن کا ہوتا ہے کچھ قرض رات کا

○

پنہاں (یو۔ایس۔اے)

سازِ دل بھی دل شکستہ چاہیے زندگی کو سوزِ نغمہ چاہیے
مر کے جینے کا سلیقہ چاہیے عشق کرنے کو کلیجہ چاہیے
مسکراتے چشم ولب کے ساتھ ساتھ درد کا دل میں دفینہ چاہیے
دن گزر جائے تماشہ دیکھتے رات بھر کہنے کو قصہ چاہیے
خلوتِ ہستی میں ہر پل ہر نفس نام کا اس کے وظیفہ چاہیے
ڈھونڈتا تو ہے سکونِ دل مگر نت نیا انساں کو فتنہ چاہیے
مفلسی کی حد سے نیچے ہیں کہیں جن کو ہر قیمت پہ پیسہ چاہیے
منزلوں پہ آ کے یہ جانا کہ بس بس مجھے چلنے کو رستہ چاہیے
تن تو مٹی ہے حفاظت اسکی کیا روح کو آنکھوں کا پردہ چاہیے
زندگی تخلیق ہے اللہ کی تو اسے خالق سا رتبہ چاہیے
خالق و مخلوق کے مابین بھی کچھ براہِ راست رشتہ چاہیے
امتیازِ خیر و شر کے واسطے حادیٔ من دل صحیفہ چاہیے
زندگی مرنے کو بھی کم پڑ گئی جبکہ جی اٹھنے کو لمحہ چاہیے
زندگی کی شاعرہ ہونا ہے گر پھر تو پنہاں کو سکینہ چاہیے

○

شگفتہ نازلی (لاہور)

اُن کا ہُنر بھی مصرعوں میں کیا ماہرانہ ہے
اور رنگ شعری فیض کا بھی غائبانہ ہۓ

شاید بظاہر اِس کا نہ اِدراک ہو سکے
لیکن دراصل چال بڑی شاطرانہ ہۓ

مُسکاتی سوچ ساتھ چلے حرف حرف جوت
یہ انہماک لگتا تو کچھ شاعرانہ ہۓ

اِس درجہ اپنی رائے پہ اصرار کیا کہیں
اسلوب کیا سکالے کا جارحانہ ہۓ

ذُو جوں کے اٹا ٹے رہے ہیں مرکزِ نظر
اَنداز بھی تو دیکھیے کیا غاصبانہ ہۓ

محکوم کا کیا کام کہ خود فیصلہ کرے
حاکم کی یہی سوچ کتنی آمرانہ ہے!

○

دل نواز دلؔ (لاہور)

- غزل -

روتا ہے اَب بھی دل ترے قول و قرار کو
کب تک چھپائے آنکھ میں دل انتظار کو

قابو میں رکھ کہتے ہے یہ دُنیا دنی مجھے
تُو دل کو اور دیدۂ بے اختیار کو

ہے اَب بھی مجھ کو تجھ پہ بھروسہ خیال رکھ
پہنچے نہ ٹھیس دیکھ مرے اعتبار کو

اُن کی نظر میں پھول کھلیں گے چمن چمن
وہ جو خزاں میں یاد رکھیں گے بہار کو

سورج غروب ہو کے گیا چشمِ تر کو دیکھ
دریا رُلا رہا ہے لہو آبشار کو

دریا رواں دواں ہے سمندر کی اور پھر
دیکھے کنارِ آب کوئی آر پار کو

جو راز خود ہی کھول دیا ہے نگاہ نے
اَب کس طرح چھپاؤں میں اس آشکار کو

ہر دل ہے ناصبور تو ہر آنکھ مضطرب
کیسے کرے گا ختم تُو اس خلفشار کو

قدموں کے سب نشان تجھے آئیں گے نظر
اے دلؔ تو بیٹھنے تو دے گرد و غبار کو

ترسے ہے آنکھ آج بھی ظالم کے پیار کو
دل ڈھونڈتا ہے اَب بھی ستم گار یار کو

ترسے ہے کوئی خوش نہ ہے عزل ہے کوئی خوش
عزل کو کوستا ہے کوئی ترہ گندار کو

جو نقد کاروبار کریں اس جہان میں
لعنت وہ جانتے ہیں کسی بھی اُدھار کو

بکھرے پڑے ہیں چاند کے ذرّات دیکھیے
اب رات رات بھر لیاں اختر شمار کو

دامن وہ تار تار کیا تھا کبھی جو خود
سینا پڑا ہے آج اُسی تار تار کو

ٹھنڈی ہوئی ہے جان کی اَب راکھ اس طرح
ڈھونڈے ہے برف زار میں اَب اک شرار کو

غمگین آنکھ اور بھی نمناک ہو گئی
سمجھاؤں کیسے اَب میں دلِ سوگوار کو

جب کر رہا ہے دردتی میری پرورش
کیوں دوش دے رہا ہے تُو پروردگار کو

دیکھوں میں کیسے دلؔ کا لہو ہو رہا ہے جو
روکوں میں کیسے آج نگہِ اشکبار کو

○

یا نصیب!

جاوید اختر چوہدری (برمنگھم، برطانیہ)

حامد کے والد روزنامہ دا ٹائمز **(Daily The Times)** خریدتے اور سب سے پہلے اداریہ پڑھتے۔ بڑے بھائی شاہد روزنامہ دا مرر **(Daily The Mirror)** باقاعدگی سے پڑھتے اور اخبار ہاتھ میں لیتے ہی اسپورٹس کا صفحہ اپنے چہرے کے سامنے پھیلا لیتے۔ اس لئے شاہد کو فٹ بال کے کھلاڑیوں اور کلبوں کے متعلق بہت ساری معلومات حاصل تھیں۔ چھوٹے بھائی زاہد روزنامہ دا سن **(Daily The Sun)** کا صفحہ نمبر تین دیکھتے اور مسکراتے اور گھڑ دوڑ کے صفحے سے چپک جاتے۔ لیکن حامد کو نہ تو اداریے سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی اسپورٹس اور صفحہ نمبر تین سے کوئی لگاؤ۔ اس کے ہاتھ جونہی اخبار یا رسالہ لگتا تو وہ بس پیش گوئیوں والا صفحہ پڑھتا۔

گھر کے سب ہی افراد حامد سے مذاق کرتے۔۔۔ "بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اخبارات میں شائع شدہ پیش گوئیاں درست ہوں۔ دنیا کے لاکھوں کروڑوں افراد کی تاریخ پیدائش کے لئے ایک ہی برج ہوتا ہے جب کہ ہر فرد کے حالات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں تو پھر ایک ہی برج میں پیدا ہونے والے اشخاص کیوں کر اسے درست تسلیم کرلیں۔ یہ کوئی علم نہیں فراڈ ہے"۔ وہ اس لہجے میں اپنی بات کہتے جیسے وہ حرف آخر ہو۔ حامد ان کی باتیں سنتا اور مسکرا دیتا۔

حامد کو پاکستان کے اردو اخبارات بہت پسند تھے۔ پہلے وہ اخبارات میں درجہ بند عنوانات کے مختصر اشتہارات **(Classified Short Advertisements)** پڑھتا۔ بعض عاملوں کے اشتہارات تو سارا سال اخبار میں مستقل اسے ملتے۔ جیسے......

عامل میاں باقری کا اعلان

آپ کی ہر تمنا تین یوم میں پوری ہوگی۔ وہ خواتین و حضرات جو عاملوں اور جادوگروں کے پاس جا کر کام اور مایوس ہو چکے ہیں، صرف اور صرف ایک مرتبہ ساٹھ سالہ تجربہ کار عامل میاں باقری کو فون کر کے اپنی تمام الجھنوں اور مشکلوں کا تسلی بخش حل معلوم کریں۔ ہر کام سو فی صد گارنٹی سے کیا جاتا ہے۔ آزمائش شرط۔ مثلاً دل پسند شادی، سنگ دل سے سنگ دل محبوب کو قدموں میں لانا، کاروبار میں فائدہ، جادو ٹونے کا اثر، جن بھوت پریت کا سایہ، نافرمان اولاد کو تابع کرنا، دشمن سے نجات، امتحان میں کامیابی، گرین کارڈ، غرض کہ ان تمام پریشانیوں کا حل بذریعہ عملیات کیا جاتا ہے۔

(یا)

کالے و سفلی علم کی کاٹ و پلٹ کے ماہر

ہر انسان مقدر کا سکندر ہو سکتا ہے۔ انعامی چانس ہر انسان کو اللہ میاں نے دیا ہے۔ وہ خوش نصیب آپ بھی ہو سکتے ہیں۔ صرف واسطہ اور وسیلہ تلاش کریں۔ علم اور عملیات سے رہبری ہم کریں گے۔ آگے نصیب آپ کے۔ یہ دعویٰ نہیں حقیقت ہے۔ کلام الٰہی میں بڑی طاقت ہے۔ یقین کامل، پیر کامل۔ بہت سے بہن بھائی ہمارے تعویذوں سے کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ آپ آج ہی رابطہ کریں۔ یقیناً کامیابی ہوگی عملیات کے ساتھ.... عامل اے ایم شیرازی

(یا)

ہر الجھن کا خاتمہ تین منٹ میں۔ ناکامی کسی کا مقدر نہیں۔ آزمائش شرط...... عامل ایس اے قیصرانی

(یا)

آپ کی ہر خواہش آپ کے قدموں میں۔ ستاروں کے میل و ملاپ کے ماہر کا اعلان ..... م ش ساگر

(یا)

جس کو چاہو تابع کر لو........ عامل این اے زبیری

(یا)

کالے علم کا دشمن اور عملیات کا ماہر..... این اے خاور

(یا)

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے...... عامل روحانی بنگالی بابا

(یا)

تقدیر کو ناخن تدبیر سے بدل ڈالو۔ مایوسی اور ناامیدی کفر ہے۔ دلی تمناؤں کو خوشیوں میں تبدیل کرنے کا پیغام۔ انشاء اللہ آپ کی خواہش پوری ہوگی۔ دشمن آپ کے قدموں میں.....
پروفیسر محمد شفیع کا اعلان

(یا پھر)

سو کلات کے چلتے پھرتے کرشمے۔ جھوٹوں پر لعنت۔ علم وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ خدا نے فرمایا ہے دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں جو ناممکن ہو۔ بس کامیابی کے لئے انسان کا کامل ہونا شرط ہے۔ میں بذریعہ عملیات آپ کے دکھوں اور مصائب کا حل پیش کر سکتا ہوں۔ گولڈ میڈلسٹ ایم اے رحمانی

حامد عقل کے گھوڑے دوڑاتا.... "اگر عکومتوں کے سربراہ یہ عامل ہو جائیں تو دنیا کے دلدّر دور ہو جائیں"۔ اس کی ماں اُس کی ان اشتہارات میں

غیر معمولی مشغولیت اور دلچسپی دیکھا کرتی تھی۔ ایک دن اُس نے بیٹے کو بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر پیار سے کہا.....

''بیٹے! گھر کے سب لوگ تمہارا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان واہیات اشتہارات کو مت پڑھا کرو۔ یہ سب فراڈ ہے''۔

حامد نے ماں کی بات سن کر اس طرح دیکھا جیسے کوئی کسی معصوم چار سالہ بچے کی بے معنی بات سن کر اس کی جانب دیکھتا ہے۔ اور بولا.....

''ماں! اشتہارات تو وہ لوگ دیتے ہیں جنہیں معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی مصنوعات کی مانگ ہے۔ یہ جوتشی سارے لوگ تو اتنے اشتہارات دیتے ہیں، آخر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ یقیناً دنیا میں ایسے لوگ ہیں جو ان اشتہارات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اشتہار دینے والوں کے ٹیلی فون نمبر، موبائل ٹیلی فون نمبر اور پتے لکھے ہوتے ہیں۔ میں نے کبھی یہ نہیں سنا یا پڑھا کہ کسی نے ان لوگوں کو پولیس کے حوالے کیا ہو یا کہیں اُن کی شکایت کی ہو''۔

''نہیں بیٹے، یہ سب لوگ جھوٹے اور مکار ہیں۔ غیب کا علم صرف اللہ کو ہے۔ اور دلوں کا بھید بھی بس وہی جانتا ہے''۔ ماں نے کہا۔

''ماں! آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں''، حامد نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا، ''مجھے آپ سے سوفی صد اتفاق ہے۔ اللہ نے زمین و آسمان پیدا کیے ہیں اور تحقیق کرنے کے لئے کہا ہے۔ سوان عالموں نے تحقیق کی ہے اور اسے اپنے روزگار کا وسیلہ بنایا ہے۔ چاند کے گھٹنے بڑھنے سے انسان کی صحت پر اثرات پڑتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ کے سائنس دانوں نے معلوم کرلیا ہے چاند کی پہلی اور آخری تاریخوں میں بڑے آپریشن کے بعد جلد صحت یاب نہیں ہوتیں۔ اگر چاند کی گردش انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے تو مجھے یقین ہے ستاروں کے علم میں بھی صداقت ہوگی''۔

اب بے چاری ماں کیا بحث کرتی۔ وہ چپ ہوگئی۔

اِدھر حامد کبھی کبھی یہ سوچ کر اُلجھ جاتا کہ دنیا میں چند قوموں کے کروڑوں افراد اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کی نہ صرف پرستش کرتے ہیں بلکہ بیماری سے بچاؤ، مال و زر کے حصول اور دیگر دنیاوی و روحانی خواہشات کے بر آنے کے لئے اُن سے مدد مانگتے ہیں۔ اگر بتوں کی پوجا سے من کی مرادیں پوری ہوسکتی ہیں تو چاند ستاروں کے علم سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کبھی کبھار رشک کی دراڑیں بھی پڑنے لگتیں۔ حامد کو اس کی پروا نہیں تھی کہ اس کی سوچ پر کوئی دوسرا مذاق بھی اُڑائے گا۔ وہ ہفتے بھر کے لئے اخبارات کی پیش گوئیوں کو اپنے سامنے رکھتا۔ اور خوش دلی سے ہفتے کا آغاز کرتا۔ اُس نے چپکے سے انگریزی اخبارات خریدنے شروع کردیے تھے۔ جب تک وہ تمام اخبارات میں پیش گوئیوں کو پڑھ نہ لیتا کوئی کام شروع نہ کرتا۔

ستاروں سے متعلق پیش گوئیاں اُسے زندگی کے بارے میں بہت مثبت پہلوؤں سے آگاہ کرتیں۔ مثلاً، اُس وقت تک مالی آزادی کا حصول مشکل نہ ہوگا جب تک آپ یہ یاد رکھیں گے کہ آپ کہاں سے اور کن حالات سے گزر کر آئے تھے۔ اس بات کا یقین کریں کہ کچھ لوگوں کو اپنی تقدیر بنانے کا ہنر آتا ہے اور ہر آدمی کو کوئی نہ کوئی کامیابی کی سیڑھی اوپر چڑھنے کے لئے مدد دیتا ہے۔ آپ اپنے ساتھیوں سے اچھا سلوک کریں۔ اُن میں سے کوئی نہ کوئی تمہیں کامیابی کا موقع فراہم کردے گا۔ لہٰذا تعلقات کو مضبوطی سے استوار کریں۔

حامد جب یہ پڑھتا تو خود احتسابی کے عمل سے گزرتا۔ اپنے ساتھیوں سے ملنے جلنے میں انکساری اور خلوص سے کام لیتا۔ لوگ بھی جواباً اس سے مروت سے ملتے۔ اُسے زندگی کا یہ پہلو بہت اچھا لگا۔

اور حامد جب کبھی پڑھتا کہ..... ''اس ہفتے میں جس کام میں ہاتھ ڈالو گے تو وہ کام عنقریب سر انجام دے لوگے اور تمہارے اور دوسروں کے درمیان معاملات آسانی سے طے ہوسکیں گے۔ ذہنی طور پر محتاط رہنا ضروری ہے''۔ حامد ہفتہ گزارنے کے بعد اپنے کاموں پر نظر ڈالتا تو اُسے خوشی ہوتی کہ اُس کے بیشتر کام پورے ہوگئے۔ حامد کے اعتماد میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔

ایک ہفتے اتفاق سے تمام اخبارات نے پیش گوئی کی کہ اسٹاک مارکیٹ(stock Market سٹہ بازی) میں سرمایہ کاری سے فائدہ ہوگا۔ حامد نے دس ہزار پونڈ بینک میں جمع کر رکھے تھے۔ اُس نے کسی سے مشورہ کیے بغیر بلو چپ اسٹاک(Blue Chip Stock) میں نے لیے نیشنل بینک (Abbey National Bank) کے حصص بحساب تین پونڈ فی حصہ اور ایک انشورنس کمپنی کے کچھ حصص بحساب دو پونڈ فی حصہ اور سافٹ ویر کمپیوٹر سروسز کی کمپنی آٹونومی کارپوریشن (Autonomy Corporation) کے چند ہزار حصص بحساب ساٹھ پینس فی حصہ خرید لیے تھے۔

حامد نے اب پیش گوئیوں کے ساتھ ساتھ اسٹاک مارکیٹ میں حصص کے اُتار چڑھاؤ میں بھی دلچسپی لینا شروع کردی تھی۔ چند ماہ گزرے تو اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ کوئی بڑا بینک کسی چھوٹے بینک کو خریدنے کے اقدامات کر رہا ہے۔ خبر شائع ہوتے ہی نیشنل بینک کے حصص کی قیمت بڑھنے لگی اور بارہ پونڈ فی حصہ تک پہنچ گئی تھی۔ اسی دوران ایک اور خبر آئی کہ دو انشورنس کمپنیاں کا آپس میں الحاق ہونے والا ہے تو جس کمپنی کے حصص حامد نے خرید رکھے تھے ان کی قیمت بھی دوگنی ہوگئی تھی۔ اُدھر آٹونومی کارپوریشن کے حصص کسی پر اسرار شخص نے خریدنے شروع کیے تو ساٹھ پنس کا شیئر پندرہ پونڈ تک جا پہنچا۔ حامد پر نشے کی سی کیفیت طاری رہنے لگی تھی۔

والدین کے کان میں کسی صورت بھنک پڑی کہ حامد نے اسٹاک مارکیٹ میں سرمایہ کاری کی ہے تو وہ بہت گھبرائے۔ حامد کے والد کو بہت سارے ایسے لوگوں کے متعلق معلومات تھیں جو اسٹاک مارکیٹ کے ہاتھوں تباہ ہو چکے

تھے ۔باپ نے بیٹے سے دریافت کیا تو حامد نے جواب دیا......

''ابا جان! آپ فکر نہ کریں میں اسٹاک مارکیٹ کو خوب سمجھتا ہوں ۔
یقین جانئیں میرا روپیہ محفوظ ہے''۔

جس پر باپ نے صرف یہ کہا....

''اف یو ڈونٹ نو ہو یو آر، دین اسٹاک مارکٹ از دا ورسٹ پلیس ٹو فائنڈ آوٹ(**If you don't know who you are, then stock market is the worst place to find out**
اگر تمہیں اپنے بارے میں شبہ ہے کہ تم کچھ ہو تو سٹہ بازار پہچان کے لیے سب سے معقول جگہ ہے)۔ بیٹے اسٹاک مارکیٹ میں بڑے بڑے ذہین لوگ تباہ ہو چکے ہیں۔ اسٹاک مارکیٹ میں سرمایہ کاری انتہائی خطرناک ہے۔ اس کھیل سے باز آجاؤ۔ یہ ستاروں کی پیش گوئیاں اور اسٹاک مارکیٹ تمہیں کہیں کا نہ رہنے دیں گے''۔

حامد نے باپ سے بحث نہ کی اور ان سے صرف یہ کہا کہ وہ شغل کے طور پر پیش گوئیاں پڑھتا ہے اور جو اس نے کیا ہے محض جبلی حس کے تحت کیا ہے۔

حامد کو سرمایہ کاری کیئے ہوئے ایک سال ہو چلا تھا۔ اور جس ہفتے ستاروں کی گردش پر پیش گوئی کرنے والوں نے کہا کہ دنیا میں کوئی بڑا حادثہ رونما ہونے کو ہے جس سے اسٹاک مارکیٹ میں بھونچال آنے والا ہے تو اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ کسی انجانے خوف کے تحت اُس نے ایک دم اسٹاک مارکیٹ میں اپنے شیئرز فروخت کردیے۔ اُسے مجموعی طور پر پچاس ہزار پونڈ کا فائدہ ہوا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد گیارہ ستمبر 0002ء کا حادثہ رونما ہوا۔ دنیا بھر کے اسٹاک مارکیٹوں میں زبردست زلزلہ آیا۔ پورے ہفتے ٹیلی ویژن کے اسٹاک مارکیٹ کے اسکرینوں پر صرف اور صرف سرخ ہندسے ہی نظر آتے رہے تھے۔ حصص کے کاروباری حواس باختہ ہو گئے تھے۔ کھربوں ڈالر اسٹاک مارکیٹ سے وہپ آوٹ (Wipe-out نیست و نابود) ہو گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت دم توڑ رہا ہو۔ ہزاروں چھوٹی کمپنیاں ایک ہی جھٹکے میں اسٹاک مارکیٹ سے غائب ہو گئی تھیں۔

حامد کے گھر والے حامد کی سرمایہ کاری سے پہلے ہی پریشان تھے، گیارہ ستمبر کے حادثے کی خبر سن کر باپ نے اُس سے تا دیا دوبارہ کہا........

'' لگتا ہے ستاروں کی پیش گوئیاں اور اسٹاک مارکیٹ نے تمہیں تباہ کردیا ہے''۔

لیکن حامد نے انہیں بڑے اطمینان سے اپنے بروقت اقدامات کے متعلق بتایا کہ کس طرح حادثے سے چند دن پیشتر تمام اسٹاک فروخت کر کے اُسے ایک سال میں کم از کم پچاس ہزار پونڈ کا فائدہ ہوا تھا۔ گھر کے افراد نے سنا تو ان کے تاثرات گو ملے جلے تھے تاہم انہیں حامد کی قسمت پر رشک تھا۔

۱۴/ ستمبر کو حکومتِ امریکہ نے واقعات کی سنگینی کو نہ صرف قبول کر لیا بلکہ قوم کی مورال (morle حوصلہ) کو بحال کرنے کے لئے چند انقلابی اقدامات، خصوصاً اسٹاک مارکیٹ میں عوام کے اعتماد کو واپس لانے کے لئے، کیئے کیوں کہ امریکہ میں ہر تیسرا آدمی اسٹاک مارکیٹ کے ساتھ کسی نہ کسی طور ملوث ہے۔ سرمایہ داری نظامِ معیشت ناکام نہیں ہوا تھا صرف اُس میں وقت طور پر رخنہ پڑا تھا۔ ستاروں کی گردش بتانے والوں اور اسٹاک مارکیٹ کے تجزیہ نگاروں نے حالات کی بہتری کی طرف نشاندہی شروع کردی تھی۔ ۲۰۰۲ء کے اوائل میں منجموں اور اقتصادیات کے تجزیہ نگاروں نے کہنا شروع کردیا تھا کہ مضبوط قوت ارادی کے مالک لوگوں کے لئے سنہری موقع آگیا ہے کہ وہ دوبارہ اسٹاک مارکیٹ میں سرمایہ کاری کریں۔ بینکنگ، ادویہ سازی اور پڑوکیمیکل انڈسٹری میں بہتری کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔

حامد نے ایک سال میں گو اتنا کما لیا تھی جو عام حالات میں وہ دس سال بھی نہیں انداز نہیں کر سکتا تھا تاہم گیارہ ستمبر کے حادثے نے اسے بھی اسٹاک مارکیٹ سے خوف زدہ کردیا تھا۔ منجموں اور اقتصادیات کے تجزیہ نگاروں کی پیش گوئیوں کے باوجود وہ دو تین ماہ تک حصص کی خرید و فروخت سے باز رہا۔ لیکن چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ جوں ہی مختلف اخبارات کے نجومیوں اور اقتصادیات کے تجزیہ نگاروں کے حوصلہ افزا بیان شائع ہونے شروع ہوئے اور ہفتہ وار اِن ویسٹر کرانیکل (**Weekly Investor Chronical**) کی ٹپس(**tips** نجی اور خفیہ معلومات کی اساس پر اندازے) کا جائزہ لیا تو انجانے جذبے سے مغلوب ہو کر فون اُٹھایا اور ٹپس کے مطابق مختلف کمپنیوں کے حصص خریدنے کی ہدایات اسٹاک بروکر (**Stock Broker**) کو دے ڈالیں۔

حامد کے خریدے ہوئے حصص نے نمایاں ترقی کی۔ اسٹاک مارکیٹ نے کھویا ہوا اعتماد بحال کردیا تھا۔ پینی شیرز (**Penny shares**) نے خاص کر بہت اچھا پرفارم(**perform** مظاہرہ) کیا تھا۔ حامد نے اب اپنا زیادہ وقت اخبارات کے مطالعے کے علاوہ انٹرنیٹ(**inter-net**) سے مختلف نجومیوں کی پیش گوئیاں اور مالی امور سے متعلق شائع ہونے والے مخصوص اخبارات و رسائل بھی پڑھنا شروع کردیے تھے۔

جب عراق پر جنگ کے خطرات منڈلانے لگے تو اُس نے تمام پیش گوئیوں کو بالائے طاق رکھ کر تمام حصص فروخت کردیے۔ اور اسٹاک مارکیٹ سے باہر نکل آیا۔ اس عمل میں اس نے اچھا خاصا منافع کما لیا تھا۔

جنگ کے شروع ہوتے ہی اسٹاک مارکیٹ میں سراسیمگی پھیل گئی۔ حصص کے نرخ تیزی سے گرنے لگے۔ لیکن حامد جو اس وقت تک لاکھوں کما چکا

باقی رنج سے خوگر میں۔

خواب، خواب، زندگی

یوگیندر بہل تشنہ

(دہلی، بھارت)

کئی دنوں سے میں اِس خیال میں اُلجھا رہا کہ تیرہ برسوں کے بعد، کس منہ سے تم سے رابطہ قائم کروں، تم پوچھو گی کہ اتنا عرصہ کہاں تھے کیا اِس سے قبل خیال نہ آیا، تو کیا جواب دوں گا، پھر اچانک خیال آیا کہ تم تو خود خواب ہو گی اور تمہیں خواب میں ہی جا ملتا ہوں جس طرح میری دنیا بھی ایک طویل خواب ہے۔ جسمیں ہم ملتے ہیں، بچھڑتے ہیں اور پھر کسی اور جنم آ کر پھر مل جاتے ہیں۔ جیسے ہم ایک ہی رات میں، ایک ننھے سے وقفے میں، کتنی ہی زندگیاں جی جاتے ہیں۔ خواب میں پیدا ہوتے ہیں لڑکپن، جوانی اور پھر شادی کر لیتے ہیں، بچے پیدا ہوتے ہیں اُن کی خوشیاں، اُن کے درد و آلام اور پھر اچانک خواب میں ہی کسی حادثے کا شکار ہو کر یا پھر ایسی ہی کسی اور واردات کے زیرِ اثر، خوف و ہراس سے پسینے میں شرابور تڑپ کے اُٹھتے ہیں اور گھبرا کر ہماری آنکھ کھل جاتی ہے حیران و پریشان اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ کچھ بھی نہیں رہا۔ سب ختم ہو گیا۔ اور کہہ اُٹھتے ہیں، اوہ! یہ تو ایک خواب تھا جو اِس قدر پریشان کر گیا، اور یہ سب کچھ رات کے ایک چھوٹے سے وقفے میں رونما ہو جاتا ہے۔

یہ خواب کیسا خواب تھا جو میری نیند لے اُڑا
تمام رات جاگنے کی دے گیا مجھے سزا

جاناں! بس اِسی خیال کا آسرا لئے میں آج کی رات، تمہیں تمہاری نیند میں مخل ہونے کی جرات کر رہا ہوں۔ کہ تمہارے داغِ مفارقت دے جانے کے بعد میں بے طرح سے اکیلا پڑ گیا ہوں۔ کوئی بھی تو نہیں جس پہ اپنے دل کی کیفیت ظاہر کر سکوں۔ سارے جگری دوست راہیِ ملکِ عدم ہوئے، راجندر ورد تو پہلے ہی الوداع کہہ چکے تھے۔ اب پوری، اور شیام بھی اس جہانِ ہست و بود سے اُٹھ گئے۔ کہیں تو ہم کس سے کہیں اب اپنے دل کی بات۔ تم کہو گی کہ مدن تو تمہارے ساتھ اس طرح ہے جیسے چولی دامن کا ساتھ پھر وہ تو تمہارے ہمیشہ پاس رہتا ہے۔ تم بجا کہتی ہو۔ مگر مدن میں یاروں والی کوئی بات نہیں۔ اس کے ساتھ تو ہمیشہ سے ہی عزیز بھائی سا تعلق رہا ہے اُس سے سوزِ دل کا ذکر کیونکر کروں۔ ایک نہایت مہین سا فاصلہ ہے جس کو احساس کی کسوٹی پر ہی پرکھا جا سکتا ہے۔ دلداری و غم خواری بدرجہء اتم اُسمیں یقیناً ہے مگر وہ جذبہ مفقود ہے جس سے کوئی تہہ بہ تہہ، پرت بہ پرت کھل سکے۔ ماسوا اُس کے اور کوئی بھی تو نہیں ہے لیکن آج تمہارے سامنے وہ تمام گرہیں کھولنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

جاناں! جب تم حیات تھیں، تمہیں یاد ہو گا۔ کہ ہم دونو اِس نظریے پر اکثر تبادلہء خیال کیا کرتے تھے۔ کہ موت کے بعد زندگی کا کوئی امکان ہے یا پھر موت پر سب کچھ اختتام پر آ جاتا ہے یعنی ختم شد، THE END ہو جاتا ہے اور اس موضوع کے زیرِ اثر میں نے بہت سی کتب کا مطالعہ بھی کیا تھا جیسے لائف آفٹر ڈیتھ LIFE AFTER DEATH، لائف بی فور لائف LIFE BEFORE LIFE، اور لائف آفٹر لائف، آفٹر لائف LIFE AFTER LIFE AFTER LIFE، وغیرہ وغیرہ! ہر مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار طویل حوالہ جات، حادثات اور قصے کہانیوں کے ذرائع سے اپنی بات ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور اس بات پر زور دیا تھا کہ موت کے بعد زندگی ہے اور اس کے بعد بھی زندگی ہے میں یہاں آواگون کے عقیدے کے زیرِ اثر کوئی گفتگو نہیں کر رہا۔ یعنی کلوپٹرا اپنے برسوں بعد کی کسی زندگی میں ایک حبشی عورت کا جنم لے چکی تھی۔ اور ایک فٹ بال پلیئر اپنے کسی آئندہ جنم میں ایک اپاہج کی زندگی جیا تھا۔ اور بہت سے ایسے ہی کئی قصے اُن کتب میں اندراج تھے۔ اب جبکہ تم حیات نہیں رہیں اور سب کچھ اس موضوع پر یقینی طور سے جان بھی چکی ہو گی۔ مگر تمہاری مجبوری کہ تم اپنا یہ یقین عالمِ ارواح سے اس جسم و جاں کے جہاں تک پہنچانے کی اہل نہیں ہو۔ اس لئے ہمارے لئے یہ مسئلہ، یہ سوال وہیں کا وہیں ٹھہرا ہے کہ موت کے بعد زندگی کی کچھ اصلیت ہے بھی کہ نہیں۔

آج پھر وہی سوال (RETA PHILLIPS) ریٹا فلپس نے شیوار یسٹوران میں دورانِ لنچ یوگی سے کیا کہ موت کے بعد زندگی کا کوئی امکان ہے میں اِس کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کروں، میں نے کہا کہ جب میری شریکِ زندگی حیات تھیں، ہم اکثر اِس پر بحث کیا کرتے تھے۔ کون جانتا ہے کہ موت کے بعد زندگی ہے یا نہیں کچھ بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ جب یہی سوال اوشو OSHO سے کسی نے کیا تو اُس نے اس سوال کا جواب تو نہیں دیا بلکہ اِس کے سامنے ایک اور سوال کھڑا کر دیا، کیا موت سے پہلے زندگی ہے؟ اور اگر ہمیں یہ معلوم ہو بھی جائے کہ موت کے بعد کیا ہے تو کیا ہمیں اِس سے کچھ حاصل ہو گا؟ مزید یہ کہ اوشو نے اِس کے جواب میں ایک نہایت دلچسپ تصور پیش کیا۔ کہ

''جنت کے ایک ریسٹوران میں حضرت یسوع LORD CHRIST مہاتما بدھ LORD BUDDHA کنفیوشش CONFUCIUS اور لاؤتزو LAOTZU بیٹھے اِس سوال پر غور کر رہے تھے اس بحث میں مستغرق تھے کہ موت کے بعد زندگی ہے کہ نہیں ہے۔ کہ اتنے میں جنت کی ایک اپسرہ (حور) اپنے ایک ہاتھ میں کسی مشروب کی صراحی بغل میں تھامے اور دوسرے ہاتھ میں ایک جام لئے اُن کے گرد رقص کرتی، اپنی سحور

کسی اداؤں سے اُن کے قریب آئی اور اُن سے یوں گویا ہوئی ’’میں آپ کی گفتگو کچھ دیر سے سن رہی ہوں کہ آپ چاروں معزز دانشور اس بحث میں مبتلا ہو کر موت کے بعد زندگی ہے یا کہ نہیں ہے اور اسی بحث میں بہت دیر سے اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ آپ زندگی پر بحث کر رہے ہو اور میں اِدھر آپ کے پاس اس صراحی میں زندگی لئے آپ کو زندگی بھرا جام پلانے کی منتظر ہوں۔ اس صراحی کا مشروب جنت میں ہی کشید کیا گیا ہے۔ اسمیں زندگی ہے۔ آپ کے سامنے زندگی ہے اور آپ بحث میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آپ اس سے لطف اندوز کیوں نہیں ہوتے۔ اِس کو چکھتے کیوں نہیں۔ اس کو نوش کریں اس میں زندگی ہے۔ اِس کا ذائقہ چکھ تو لیجئے۔ اور خود کو اس کے نشے سے سرشار کریں۔ محض بحث سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔‘‘

اِتنا سنتے ہی مہاتما بدھ نے فوراً اپنی آنکھیں موند لیں اور کہا۔ ’’جنم دُکھ ہے اور موت بھی دُکھ ہے اور ان ہر دو دُکھوں کے درمیان زندگی کی کوئی صورت ہی نہیں ہے کہ وہ آنند کہلائے۔ میں اس مشروب کی جانب ایک نظر دیکھنا بھی پاپ سمجھتا ہوں۔ جس کو تم زندگی کا نام دے رہی ہو۔ اور مہاتما بدھ نے اس کی جانب اپنی پیٹھ کر دی۔ اپسرہ نے اپنی سحر انگیز نظروں سے حضرت یسوعؑ، کنفیوشش اور لاؤزوکی جانب دیکھا۔

حضرت یسوعؑ فرمانے لگے ’’زندگی کا جنم گناہ میں ہوتا ہے۔ اور تم ہمکو لبھانے کی کوشش کر رہی ہو، ہمیں لبھا رہی ہو۔ ہمکو بہکا رہی ہو، تمہارا تعلق یقیناً شیطان سے ہے۔ تم شیطان کی طرفدار ہو۔ جو یوں ہمیں ورغلا رہی ہو۔ میری نظروں سے دُور ہٹ جاؤ۔ اس صراحی کا مشروب ہمارے لئے حرام ہے‘‘ اور اُس سے اپنی آنکھیں پھیر لیں۔ مہاتما بدھ اور حضرت یسوعؑ کے خیالات سن کر کنفیوشش CONFUCIUS کو بُرا لگا۔ اُس نے کچھ ذرا انسانیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ’’لاؤ میں اِس مشروب کا ذائقہ چکھ لیتا ہوں۔ کیونکہ میرے پہلے دو ساتھی زندگی کے قطعی خلاف رہے ہیں کہ اُنہوں نے مشروب چکھے بغیر فیصلہ دے دیا۔ کنفیوشش نے اپسرہ کے ہاتھوں سے جام لیا اور اُسے ذرا سا چکھا۔ زبان پر لگتے ہی اُسے مشروب بے حد کڑوا لگا۔ اور اُس نے فوراً اپنا فیصلہ دے دیا ’’نہیں یہ بے حد کڑوا ہے۔ میرے دونوں ساتھی بالکل صحیح تھے۔ جو مشروب اس قدر کڑوا ہوگا وہ قطعی زندگی نہیں ہو سکتا۔ اتنا سنتے ہی لاؤزو نے فوراً کہا۔ جب تک مشروب کو اچھے ڈھنگ سے مکمل طور سے چکھتے نہیں اُسکو پیتے نہیں، ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے ذرا سا چکھنے سے فیصلہ سنا دینا مشروب سے سراسر زیادتی ہے۔ اُس نے اپسرہ کے ہاتھوں سے صراحی لی اور غٹ غٹ اُسکا سارا مشروب حلق میں لنڈیل لیا۔ اُسکو مشروب نہایت لذیذ لگا۔ شروع میں یقیناً ذرا کڑواہٹ محسوس ہوئی جو بعد ازاں اُسکو محسوس نہیں ہوئی۔ سارا مشروب پی لینے کے بعد لاؤزو کو عجب سرور محسوس ہوا۔ ایک نشہ سا، خمار سا اُس پر طاری ہو گیا وہ یکبارگی نشے میں سرشار جھوم اُٹھا۔ اور اپسرہ سے گویا ہوا تم سچ کہتی ہو کہ اس میں زندگی ہے۔ اس میں آنند ہی آنند ہے۔ میرے معزز دوستو! کسی بھی شے کو مکمل طور سے استعمال کیے بغیر فیصلہ سنا دینا غلط ہے سراسر ناانصافی ہے۔ اور یہی بت پرستوں کا طرزِ عمل ہے۔ لاؤزو ایک بُت پرست تھا اور تمام زندگی وہ اسی طور جیا۔ اِسی لئے ہمیں اُسکی تحریروں میں خدا کا ذکر نہیں ملتا۔ کیونکہ اُس کا تعلق ہمیشہ ابھی اور یہاں سے رہا ہے۔ اُس کے ہاں جنت اور جہنم کا بھی کوئی تصور نہیں ہے۔ لاؤزو سے کنفیوشش نے پوچھا۔ لوگ مجھ سے موت کے بعد زندگی کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ اس تعلق سے میں آپ سے جاننا چاہوں گا کیونکہ تم بزرگ ہو، دانشمند ہو اور پھر ایسے خطرناک راستوں پر جانا پسند بھی کرتے ہو۔ مجھے اس خیال کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔ کیا تمہیں اسکا اندازہ ہے۔ میرے بھائی جس طرح مشروب چکھے بغیر اُسمیں چھپی زندگی کا علم حاصل نہیں ہو سکتا اسی طرح بغیر مرے کوئی اور راستہ نہیں ہے اس کو جاننے کا، کہ تم موت کو جان سکو۔ اس کے لئے ہمیں اس راستے سے پہلے گزرنا یعنی مرنا ہوگا۔ جب ہی تو اِسکا علم ہو سکے گا۔ اِس سے قبل اس کے بارے میں سوچنا جہالت ہے بیوقوفی ہے۔ اِس وقت تم صرف جیو، ورنہ تم یہ موقع بھی کھو دوگے‘‘۔

اوشو OSHO کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ اور آنکھوں میں جھلملاتی شوخی میں لائف آفٹر ڈیتھ کا جواب جھلک رہا تھا۔ ریتا فلپس (RETA PHILLPS) یہ سب سنکر یوگی کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی اور کہنے لگی کسقدر خوبصورت ڈھنگ سے اوشو نے موت کے بعد زندگی ہے کہ نہیں کا جواب پیش کیا ہے۔

جاناں! اِسطرح وقت اور حالات کی صلیب پر لٹکے میں بھی عمر کے ماہ و سال کے احساس کے دریچوں سے جھانکتا ہوا ماضی اور مستقبل سے بچتے بچاتے جینے کی کوشش کرتا رہا۔ اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی زندگی ’’ابھی اور حال‘‘ میں جینے لگا ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تمہارے اِس جہاں سے رخصت ہو جانے کے بعد میرا کوئی بھی ہمدم محرم یا ہمنوا نہیں رہا۔ اور میں مقدر کے اندھیروں میں یک و تنہا بھٹکتا پھرا۔ جہاں سہاروں کا خیال بھی نہ آیا اور نہ ہمراہی کا تصور ہی رہا۔ ؎

رُکا تنہا، چلا تنہا، گرا تنہا، اُٹھا تنہا
شامِ غم کا ہجوم تھا اور تِرا محبوب بے آسرا تن و تنہا

زندگی کرتا رہا۔ گو دنیا میں جینے کے لئے حالات کی گردش سے سمجھوتہ کرنا بھی تو لازم تھا سو کر رہا ہوں۔

جاناں! تمہارے داغِ مفارقت دے جانے کے بعد میں نے جب جب نئے دن کا آغاز کیا۔ تو اکثر یہی سوچا کہ آج کس در پر دستک دوں۔ یا پھر تمہاری سوچوں میں گم تنہائی کی چادر اوڑھے یونہی دن گزار دوں۔ کیونکہ کئی دروا

ہونے کے باوجود استقبالیے نہیں ہوتے کہ کوئی بے دھڑک داخل ہو جائے اور ایسے گھر میں اگر تو بادکراہ داخلہ لے بھی لیا تو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی کہتا ہو ''آجایئے'' احساس جذبات سے عاری' پھر ایسے ماحول میں کوئی کیسے وقت گزار سکتا ہے بس ذرا سی گفت وشنید کے بعد اُٹھ جانا ہی مناسب ہے ورنہ بوریت اور اکتاہٹ کا احساس زہر بن جاتا ہے اور تم تو میری عادت سے بخوبی واقف ہو کہ میں مطالعہ میں وقت گزارنا زیادہ پسند کرتا ہوں بہ نسبت اِس قسم وقت خراشی سے۔ اور پھر میرے پاس وقت بھی کہاں جو اس طرح فضول گپ شپ میں گنوا دوں۔ کبھی کبھار کی بات جدا ہے اور وہ بھی خاص مدعو کرنے پر۔ جب تم حیات تھیں جب بھی کہاں میں زیادہ بیاہ شادی کی تقریبات میں حصہ لیا کرتا تھا۔ میں کتابوں اور قلم سے ہی رشتہ قائم رکھنا پسند کرتا ہوں۔ یہی میرا محبوب ترین مشغلہ رہا ہے۔ اسی طرح بُرس ہا برس بھٹکنے کے بعد ایک دن ایک خاتون دوست اور اُن کے شوہر نے کہہ ہی دیا کہ آپ کیوں اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ایک جگہ ٹِک کیوں نہیں جاتے اور عمر کا تقاضا بھی یہی ہے۔ بالائی منزل خالی پڑی ہے۔ وہاں کوئی آپ کو ڈسٹرب بھی نہیں کریگا آپ شوق سے وہاں لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ آپ کی بیٹی بھی آپ کے لئے فکرمند رہتی ہے اُس کا بھی یہی خیال ہے اُس نے کئی بار فون پر ہم سے کہا بھی ہے۔ وہ یہی چاہتی ہے کہ آپ ہمارے ہاں رہیں۔ اور پھر ہماری دیرینہ ہمسائیگی کا تقاضہ بھی تو یہی ہے۔ اور پھر میں اُن کے حسب منشا اُن کے پاس ہی ٹِک گیا ہوں۔ تمہارے چلے جانے کے کئی برسوں بعد ایسا ہوا ہے۔ ورنہ زندگی ابھی تک دربدری میں ہی گزار دی۔ پھر وہ موبائل فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ جیب سے نکالتے دوبارہ رونج گئی۔ دوسری جانب ویر چندجی ہیں۔ ابھی ابھی اُن کا ہی ذکر کر رہا تھا۔ وہ میرے لئے بے حد فکرمند رہتے ہیں۔ ''کہاں ہیں آپ'' ''میں بس میں بیٹھا آپ کے پاس ہی آ رہا ہوں'' ''کھانے کا کیا پروگرام ہے؟'' ''کھانا نہیں کھاؤں گا' لنچ میں مدن کے ساتھ کر رہا ہوں آج صبح سے ان کے ساتھ ہی ہوں'' اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔ پھر میں مدن کے ہمراہ لنچ کرنے کے بعد رشی اپارٹمنٹ آرام کے لیے چلا گیا۔ رشی اپارٹمنٹ کا نام اب پر آتے ہی دھڑکنوں میں توازن نہیں رہتا۔ اور پھر تم ان گنت یادیں' ان گنت قصے لئے ذہن کے پردوں پر لہرانے لگتی ہو۔ اور میں آن واحد میں تمہارے خیالوں میں کھو جاتا ہوں۔ تم' تمہارے سائے' تمہاری یادوں کے نقوش فلیٹ کے در و دیوار' عرش وفرش تمہارے ساتھ ہی جاگ اُٹھتے ہیں۔ زندہ ہو جاتے ہیں۔ جیسے تم کہیں گئی ہی نہ ہو۔ اور جب جب فلیٹ سے باہر لوٹ جانے کے لئے قدم اُٹھاتا ہوں' ہر دم بڑی حسرت بھری نظروں سے مُڑ مُڑ کر دیکھتا ہوں جیسے میں سوچ رہا ہوں کہ شاید پھر کبھی لوٹنا نصیب نہ ہو' اور زبان حال سے کہنے لگتا ہوں۔

کتنے قصے' کتنی یادیں نقش ہیں اِن دیواروں پر
چلتے چلتے دیکھ لیں مُڑ کر' کون یہاں پھر آئے گا

زندگی کا کیا بھروسہ کوئی لمحہ بھی آخری لمحہ ہو سکتا ہے۔ اسی لئے میں ایک ایک دن جی بھر کر جی رہا ہوں۔ برس ہا برس بیت گئے تمہیں جدا ہوئے' مگر یوں لگتا ہے جیسے تم ابھی بھی میرے پاس ہو' میرے ساتھ ہو' ایک سائے کی صورت میرے پاس' میرے سائے کی طرح ہو۔ مگر خاموش تمہارے لب کبھی نہیں ہلے' مگر تمہاری آنکھیں ہمیشہ کی طرح بولا کرتی ہیں۔ اور تم لبوں پر مسکراہٹیں بکھیرے محسوس ہوتی ہو۔

جاناں! یاد ہے جب تم حیات تھیں اور سخت بیمار تھیں' میں نے کہا تھا۔

جب چھوڑ کے جاؤ گی تنہا' بے جان رہیں گے ہم برسوں
اور یہ بھی کہا تھا جاناں! تم بن نہ جئیں گے ہم برسوں

ہم کہاں جی رہے ہیں سانس لینا زندہ ہونے کی علامت ضرور ہے مگر ہم برسوں سے اِس جسم کی گرتی ہوئی دیواریں تھامے ہیں۔ کہ تم اِتنے آدھے ادھورے کام چھوڑ کر عالم ارواح میں جا بیٹھیں کہ ایک ایک کام نپٹانے میں جگر لہو کرنا پڑتا ہے۔

سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں اپنی کوشش اور کاوش میں کس قدر کامیاب ہوا ہوں۔ کیا میں اپنی بڑی بیٹی نوتن کو اُس کی زندگی کے بتیس سال لوٹانے میں کامیاب ہو سکا ہوں جو اُس نے نوجوانی میں شوہر کی جدائی کے بعد یک وتنہا کارزار حیات میں بڑی بہادری' ہمت' خوش اسلوبی اور خوش خلقی سے بتائے ہیں۔ کیا میں چھوٹی بیٹی اور اکلوتے بیٹے کو اپنی مٹی' اپنے لوگ اور اپنے در و بام کی اہمیت کا احساس دلانے میں کامیاب ہو سکا ہوں؟ کیا میں اپنی زبان سے' قلم سے' قول سے' قرار سے یا کردار سے کوئی ایسی مثال قائم کرنے میں کامیاب ہو سکا ہوں جسے میرے بعد میری نوجوان نسلیں اپنانے میں فخر محسوس کریں۔۔۔۔شاید نہیں۔۔۔۔!

اب مگر مجھے محسوس ہونے لگا ہے جیسے تھکن مجھ پر غالب آ رہی ہے' جیسے اپنوں کی جدائی بوجھ بنتی جا رہی ہے۔ کبھی LORD CHRIST کی مانند شیطان سے نفرت کرتے ہوئے' کبھی LORD BUDDHA کی طرز پر زندگی کو ٹھکراتے ہوئے' کبھی CONFUCIUS کی پیروی میں قطرہ قطرہ زندگی سمیٹتے ہوئے' کبھی LAOTZU کی رہنمائی میں ایک ہی سانس اور ایک ہی وار میں زندگی کا زہر پیتے ہوئے اور پل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہاری باہنوں میں آنے کو من کرنے لگتا ہے۔ بھلا کب تک ایک تن تنہا شخص بھارت' امریکہ' کینیڈا' دبئی اور عالم ارواح میں بٹ کر اپنوں کی جدائی کا روگ سہتے ہوئے زیست سے لڑ سکتا ہے۔۔۔ کب تک۔۔۔ آخر کب تک؟؟؟ بقول شاعر

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت' درد سے بھر آئے نہ کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

☆

شور

احسان بن مجید (اٹک)

بڑی اماں بہت عرصے، بہت عرصے سے مراد پچھلے سات برسوں سے یہ دیکھ رہی تھی کہ گھر کی اکثر پرانی چیزیں سٹور میں منتقل کر دی گئی تھیں یا کباڑیے پر اونے پونے داموں فروخت کر دی گئی تھیں حتیٰ کہ شمع دان تک بھی اٹھا دی گئی تھی اور ان کی جگہ نئی چیزیں رکھ دی گئی تھیں۔ جب بھی کوئی پرانی چیز اپنی جگہ سے اٹھائی جاتی، بڑی اماں کے کلیجے میں جیسے سوراخ ہو جاتا پر دیکھتی رہتی، کسی سے کچھ نہ کہتی بس اس خالی جگہ پر اپنی نظروں سے جھاڑوں پھیرتی رہتی، ہر روز، اس جگہ نئی چیز رکھے تک۔۔۔ بات یہ بھی نہیں تھی کہ بڑی اماں کا بیٹا گستاخ یا نافرمان تھا، نہیں، بیٹے کی فرماں برداری کی وجہ ہی سے تو وہ اس کیلئے ہمہ وقت دامنِ دعا پسارے رکھتی تھی۔ بہو سیانی تھی جس نے بڑی اماں کے بیٹے جیسا رویہ اپنایا تھا۔ گھر میں جب بھی کوئی نئی چیز آتی، بہو بڑی اماں کے کمرے میں جا کر بتاتی اور پھر بغل میں بازو ڈال کر ہولے ہولے اس چیز کے پاس لے آتی۔ بڑی اماں پہلے نئی چیز دیکھتی پھر بہو کا چہرہ جس پر خوشی کی پرتیں چڑھی ہوتیں، ان پرتوں میں سے چند ایک بڑی اماں اپنے چہرے پر رکھ لیتی اور کہتی، بہت اچھی ہے، بہت خوبصورت ہے اللہ نصیب کرے اور پھر مسکرا دیتی۔ اس وقت بڑی اماں کا دانتوں خالی منہ یوں لگتا جیسے کوئی نونہال مسکرائے اور چہرے کی لکیروں میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ کبھی یہ چہرہ شاداب رہا ہوگا۔ گال تمتمائے ہوں گے، غم اور خوشی کے تاثرات یکدم چہرے پر نمایاں ہو جاتے ہوں گے لیکن اب چہرہ جذبات سے عاری، خوشی میسر ہو تو چند لمحے سکون کی نیند اور اگر کوئی غم یا پریشانی ہو تو آنکھوں سے یوں آنسو ٹپکتے جیسے کسی بوسیدہ دیوار کے سوراخوں سے پانی کے قطرے رس رہے ہوں۔ ایسا ہی ہوتا ہے جب سر کا سایہ اٹھ جائے، جوانی موم کی طرح پگھلنا شروع ہو جاتی ہے صندل کو گھن چاٹنے لگتا ہے زمانے کی نظریں سوئیاں بن کر جسم و جاں میں چھید نے کرنے لگتی ہیں۔ بڑی اماں کی عمر بھی کوئی پینتیس برس ہوگی جب سورج غروب ہوا تھا، تب سے آج تک سر سے آنچل نہیں ڈھلکنے دیا۔ کئی اجنبی لوگ جیسے آئے ویسے واپس چلے گئے، وہ تو ایک بار اس کے کان میں بھنک پڑی تھی، رشتے کیلئے آتے ہیں، اس کے اندر بھونچال سا آیا تھا، پیشانی پر سلوٹیں ابھری تھیں۔ اسے تو بس رہ رہ کر ایک خیال آتا۔ وہ جو چلا گیا، اٹھ گیا اس دنیا سے، سو گیا زمین اوڑھ کے، دے گیا ایک سہارا مجھے زندہ رہنے کیلئے، میرے آٹے کا بندوبست کر کے وہ جل ہوا، کمر اانسان تھا مجھ پر ہو کر گیا، کسی کا کچھ دینا نہ کسی کا کچھ لینا، دونوں کا پیار ایک دوسرے کے پاس امانت، پتہ نہیں لوگ امانت کو کیا سمجھتے ہیں کہ خیانت کر نے یا کرانے میں ذرا دیر نہیں لگاتے۔ پتہ نہیں انسان بھنورا کیوں بن جاتا ہے، بھنورا بھی اور بانورا بھی۔۔۔ وہ تو چاہتی تھی اسی سے زندگی کی صبح نصف النہار سے آگے بڑھ جائے، ڈھل جائے بھڑکتی جوانی، اوس پڑ جائے جذبوں پر، اتر آئے سر میں چاندی، پر کچھ بھی نہ ہوا، انسان کے چاہنے سے، خواہش کرنے سے کیا ہوتا ہے انتظار جیسا طاعون پھوٹتا ہے اور پھر ایک جسم کے کئی جنازے نکلتے ہیں، ہر سمت ایک سوگواری کا سماں ہوتا ہے۔ بعض لوگ اجڑ کر بھی آباد رہتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو آباد ہوتے ہوئے بھی اجڑے رہتے ہیں۔ بیابان، بنجر، کھوکھلی جڑوں والے درخت کی طرح جو چھونے سے کانپنے لگتا ہے۔

سردیوں کی لمبی راتوں میں جب وہ چار سالہ بیٹے کو لے کر بستر میں جاتی تو بیٹا ننھی منھی باتیں کرتے سو جاتا، پھر اس کی آنکھیں رات کے ساتھ نبرد آزما ہو جاتیں۔ ذہن میں چھوٹے بڑے دائرے بننے لگتے، نظروں کے سامنے ایک لمبا راستہ، ایسا راستہ جس کے اطراف میں اگر کہیں دو چار پھول اُگے ہیں تو ایک طویل مسافت خاردار جھاڑیوں کا سنگ رہتا ہے ایسے خار جو مسافر کے دامن سے الجھ کر جانے کیا باور کراتے، اسے یوں لگتا جیسے یہ راستے کی جھاڑیاں نہ ہوں بلکہ جھاڑیوں کا راستہ ہو، راستہ بہرحال راستہ ہوتا ہے، جیسا بھی ہو، مسافر کو اگر منزل تک پہنچنا ہے تو پھر پاؤں کے چھالے اذیت نہیں راحت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ رات کے جانے کس پہر جسم کا تنور دہک اٹھتا تو وہ بیٹے کی پیشانی اور گالوں پر بوسوں کی بارش کر دیتی لیکن جب روح آگ میں جھلس رہی ہو تو جسم بچاؤ، بچاؤ کا واویلا کرتا ہے اس کا جی چاہتا باہر صحن میں جا کر ٹھنڈے پانی کا گھڑا اپنے اوپر الٹ ڈالے نہیں، وہ اپنا آپ سمیٹتی، اپنے اندر بیٹھی جوان عورت کو پچکارتی، سمجھاتی اسے، کہتی تم مجھے کمزور کر رہی ہو، کبھی جھڑک بھی دیتی، تم میرا اپنڈا اکھٹا کرنے کے درپے ہو لیکن تم بے وقوف ہو، جاہل کہیں کی، میں پتھر ہوں اور پتھروں کے جذبات نہیں ہوتے، جہاں ایک بار رکھ دو حشر تک پڑے رہیں گے۔ موسلا دھار بارش ہو یا آگ برساتے دن، نہیں کیا فرق پڑتا ہے ہر پتھر انسان کا ٹھنڈا کب سہتا ہے کوئی سرکش پاؤں لہو لہان بھی کر دیتا ہے اس کے خلاف بھی کچھ لیکی سازشوں نے سر اٹھایا تھا، تیرو تفنگ سے لیس ایک سپاہی نے اس پر حملہ بولا تھا، وہ ثابت قدم رہی تھی اور یہی صبر آزما لمحات تھے جن سے وہ سرخرو گزری تھی۔ ایک ان دیکھا ہاتھ اس کے شانوں پر رہتا تھا جو اس کے اندر عزم و ہمت کا سیسہ انڈیلتا رہتا ہے کبھی یوں بھی ہوتا، دن کو کسی وقت، رات کے کسی لمحے، قدموں کی چاپ اسے سنائی پڑتی، لگتا کوئی آیا ہے لیکن کب، کدھر سے بغیر دستک۔۔۔ دستک تو پرائے دروازے

۔باقی پچھلی خواب میں۔

نانی خیر والی

دیپک کنول (ممبئی بھارت)

میں نے ٹھیک چودہ برس بعد جب اپنے گاؤں میں قدم رکھا تو میری حالت اُس کھوئے ہوئے بچے جیسے تھی جو سالوں بعد اپنی ماں کی گود میں پہونچ گیا ہو۔ میں اپنے گاؤں کی مٹی کی مہک کو سونگھتے ہوئے دیوانہ ہوئے جا رہا تھا۔ جب تازہ ہوا کے جھونکوں نے میرے گالوں کو چھوا تو مجھے لگا جیسے میں ہوا کے دوش پہ اڑا جا رہا ہوں۔ ہائے یہ کیسی دیوانگی تھی، یہ کیسا سرور و کیف تھا، جس نے مجھ پر وجد کی سی کیفیت طاری کر دی تھی۔ میں جذبات سے اسقدر مغلوب ہو گیا کہ میں نیچے جھکا اور ہاتھ میں تھوڑی سی مٹی اٹھا کر پہلے اسے اپنی آنکھوں سے لگا لیا اور پھر اسے چومنے لگا۔ یہ مٹی میرے گاؤں کی تھی جہاں میں جنما تھا، جہاں میں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ میرا یہ گاؤں حالانکہ اب گاؤں نہ رہا تھا بلکہ بہت بڑا قصبہ ہو گیا تھا جہاں اب نہ کوئی کچا مکان اور نہ ہی کوئی گھاس پھوس کی چھت دکھائی دے رہی تھی۔ سب کچھ بدل چکا تھا۔ وہ لہلہاتے کھیت، وہ قل قل کرتی ندیاں، وہ ہرے بھرے سیب اور اخروٹ کے باغ، وہ کھیل کود کے میدان، اُن سب کو امیری نگل چکی تھی۔ نہ وہ گلی کوچے نہ وہ چوبارے دکھائی دے رہے تھے جن سے یہ گاؤں پہچانا جاتا تھا۔ آج تو ہر طرف بنگلے ہی بنگلے منہ پھاڑے نظر آ رہے تھے جو چیخ چیخ کر یہاں کی خوشحالی اور آسودگی کا اعلان کر رہے تھے۔ بظاہر سب کچھ بدلا تھا۔ اگر کچھ بدلا نہ تھا تو وہ تھی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو جو آج بھی روح کو تازگی بخش رہی تھی۔ وہ مست و مدہوش کرنے والی ہواؤں کی نکہت جو بوجھل من اور تھکے ذہن کو فرحت بخشتی تھی اور گاؤں کے بیچ کھڑا وہ بوڑھا چنار جسے دیکھتے ہی مجھے نانی یاد آ گئی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں نانی اکثر ڈیرہ ڈال کر بیٹھی رہتی تھی۔ تب یہ گاؤں کا بوڑھا چنار عمر رسیدہ ہونے کے باوجود ہرا بھرا اور توانا نظر آتا تھا۔ میں جب اُس چنار کے قریب چلا گیا تو یہ دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا کہ چنار کا بدن چھلنی ہو چکا تھا۔ اُسکے تنے پر گولیوں کے بے شمار نشان تھے۔ اسکی ڈالیاں سوکھ چکی تھیں۔ پتے جھڑ چکے تھے، برگ زاری سے پہلے ہی اس پر خزاں چھا گیا تھا۔ چنار کے یہ زخم دیکھ کر میرے اپنے زخم آلا ہو گئے اور میں چنار کے تنے سے لپٹ کر رونے لگا۔ ان چودہ برسوں میں حالات نے وقت کے سینے پر کتنے بے رحم گھاؤ لگائے تھے۔ امن و سکون کی دیوی پر، دہشت کی عفریت نے کس قدر قہر توڑا تھا اسکا گواہ یہ بوڑھا چنار تھا۔ کیا نانی کا بدن بھی اسطرح زخموں سے چور چور ہو گا۔؟ یہ سوال مجھے پراگندہ و پریشان کئے جا رہا تھا۔

نانی کا اصل نام خورشی تھا مگر اس نام سے اُسے گاؤں کے بڑے بزرگ ہی جانتے تھے۔ ہمارے لئے تو وہ نانی خیر والی تھی۔ نانی کا اپنا ایک بہت بڑا کنبہ تھا۔ اُسکے ہوتے سوتے، اُسکے رشتے ناتے دار قرب و جوار کے گاؤں میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ماں بھی تھی اور ساس بھی۔ نانی بھی تھی اور دادی بھی، خالہ بھی تھی اور چاچی بھی وہ بہت سارے رشتوں کا محور بنی ہوئی تھی مگر اتنے سارے رشتوں میں بندھی ہونے کے باوجود نانی کے نام سے ہی مشہور تھی۔ وہ صرف اپنے رشتہ داروں کی ہی نانی نہیں تھی بلکہ وہ اس پورے گاؤں کی نانی تھی۔ نانی بھی ایسی ویسی نہیں بلکہ خیر والی نانی۔ یعنی سب کے لیے خیر مانگنے والی۔

نانی کے لیے سبھی اپنے تھے۔ کیا ہندو کیا مسلمان۔ گاؤں کے بیچ بہنے والی ندی کے کنارے یہ جو چنار کا پیڑ تھا یہ نانی کا مسکن ہوا کرتا تھا۔ نانی بے خانماں نہیں بلکہ در و دار والی تھی۔ اُسکا تو ایک حویلی جیسا گھر تھا جسمیں چودہ پندرہ کے قریب کمرے تھے پر نانی کو وہ گھر زندان کی طرح لگتا تھا۔ اُسے کھلی ہوا میں بیٹھنے کی عادت تھی۔ اُسے یہ چنار بہت پیارا لگتا تھا کیونکہ اس چنار کے ساتھ اسکے مرحوم شوہر کی یادیں جڑی ہوئی تھیں۔ وہ بھی اکثر اسی چنار کی ٹھنڈی چھاؤں میں آکے بیٹھ جاتا تھا۔ سامنے بہتی ہوئی ندی جو نہ جانے کب سے قل قل کرتی بہے جا رہی تھی۔ کتنا ہی مینہ برسے۔ کتنا بڑا طوفان کیوں نہ آئے اس خاموش ندی کو کسی نے کبھی بھی سرکش ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اسکے کنارے صدا اُسے تھامے رہتے تھے۔ اسی طرح چنار کا یہ پیڑ کتنے ہی تھکے ماندے مسافروں کو نہ صرف اپنی ٹھنڈی چھاؤں میں پناہ دیتا تھا بلکہ جاڑے میں اپنے پتوں کی آنچ سے ٹھٹھرے ہوئے بدن گرما دیتا تھا۔ نانی کو اس چنار کی چھاؤں میں بیٹھ کر ایک انوکھا سا کیف و سرور مل جایا کرتا تھا۔ یہیں پر نانی کی پنچائیت لگ جایا کرتی تھی۔ یہیں پر گاؤں کی تقدیر لکھی جاتی تھی اور کاتب تقدیر کا کردار نانی ادا کرتی تھی۔ نانی کا اس گاؤں میں طنطنہ تھا کہ اُسکی اجازت کے بنا گاؤں میں پتا بھی نہیں ہلتا تھا۔ وہ ہر کسی کے دکھ سکھ میں آگے آگے ہوتی تھی۔ کسی کو ایک ادنی سا بیل خریدنے جانا ہو تو سب سے پہلے وہ نانی کی چوکھٹ پر حاضر ہو جاتا تھا اور اُس کی اجازت لے کر ہی بیل خریدنے نکل جاتا تھا۔ یہ گاؤں والوں کا اندھو شواس تھا یا سچا عقیدہ کہ جس کام میں نانی کی دعائے خیر شامل ہوتی تھی وہ کام ہمیشہ پورا ہوتا تھا۔ وہ پورے گاؤں کی یہاں پر بیٹھ کر خبر رکھا کرتی تھی۔ کس کے یہاں کب کون جنا۔ کس کے گھر میں کب کون مرا۔ کس کے یہاں کب کس کی سگائی ہوئی، کب کس کی ڈولی اُٹھی ان سب باتوں کا علم نانی کو سب سے پہلے ہو جایا کرتا تھا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ نانی کے آشیرواد کے بنا ایک پتا بھی ادھر سے اُدھر ہو جائے۔ گاؤں کی کوری کنواریاں ہو یا سہاگنیں۔ وہ اپنے ماں باپ یا اپنے ساس سسر سے اتنا ڈرتی رہتی نہیں تھیں جتنی وہ نانی سے ڈری ڈری اور خوفزدہ رہا کرتی تھیں۔ نانی کا گاؤں میں دبدبہ ہی کچھ ایسا تھا کہ کیا چھوٹے کیا بڑے، سب نانی کی عزت و توقیر کیا کرتے تھے۔ وہ چاہے ہندو ہو یا مسلمان نانی کا حرف اول حرف آخر ہوا کرتا تھا کیا مجال کہ نانی کے سامنے سے گزرتے ہوئے کسی بالکی کے سر کا دوپٹہ

ڈھلک جائے یا کوئی لڑکی کسی لڑکے سے ہنسی ٹھٹھول کرتی ہوئی نظر آئے، سمجھو قیامت آ گئی جب بھی کوئی چھیل چھبیلی اُسکے سامنے سے گزرتی تھی تو اللہ میاں کی گائے بن کے نکل جایا کرتی تھی۔ کسی کے قدم ذرا سے بہکے نہیں کہ نانی کی لاٹھی سر پر برس جاتی تھی۔ نانی دیکھنے میں تو کڑی سے لگتی تھی مگر اُس میں دم خم ایسا تھا کہ بڑے بڑے چکادری اُسکے آگے پانی بھرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اُسکی ایک دھاڑ میں اچھے اچھوں کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ وہ اس گاؤں کی خیر خواہ تھی۔ وہ یہاں کے لوگوں کا بھلا چاہتی تھی اسلئے وہ ہر آئی جائی چھوکری کو یہی سمجھاتی پھرتی تھی کہ شرم و حیا عورت کا زیور ہے۔ جو اس زیور کو اُتار کے پھینک دے سمجھو وہ نہ دین کی رہی نہ دنیا کی۔ لڑکیاں بھی نانی کی باتوں کو گرہ میں باندھ کے رکھ لیا کرتی تھیں کیونکہ نانی نے بڑی دنیا دیکھی تھی۔ اسکے پاس اتنی بڑی زندگی کا تجربہ تھا اور وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ اسی تجربے کی بنا پر کہہ رہی تھی۔ نانی تدبر، دانش مندی اور ذہانت کا ایک جیتا جاگتا پیکر تھی۔

ایک بار بشیرے کی بیوی حلیمہ جو پیٹ سے تھی درد زہ سے تڑپنے لگی۔ ان دنوں آس پاس میں نہ کوئی اسپتال تھا اور نہ ہی کوئی دائی جنائی دستیاب تھی۔ ویسے بھی دایہ گیری کے پیشے کو اُس زمانے میں اچھی نظر سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ دائی گیری کا کام گاؤں کی بڑی بوڑھیاں ہی انجام دیتی تھی۔ اس گاؤں میں ایک نانی ہی تو تھی جو دائی جنائی کا کام بھی کیا کرتی تھی۔ جب حلیمہ درد کی شدت سے بے حال ہونے لگی تو اُسکا مرد سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔ حلیمہ جب بال نوچتے نوچتے چت ہو گئی تو عین اُسی وقت فرضی بوا اپنی لاٹھی ہانکتے ہوئے گھر میں نازل ہوئی۔ فرضی بوا جس کے منہ میں نہ دانت نہ پیٹ میں آنت پھر بھی وہ اپنے آپ کو جوان جہان سمجھتی تھی۔ کوئی اُسے بڑی بی کہہ کر بلاتا تھا تو وہ آپے سے باہر ہو جاتی تھی۔ ''ہائے تیرا ستیاناس۔ منہ میں دانت نہیں تو کیا میں بوڑھی ہو گئی؟ یہ تو برا ہوا اس نزلے زکام کا جس نے میرے دانتوں کو نگل ڈالا، ورنہ میں بھی کوئی بچا عدلی نظر آتی۔ خبردار جو آئندہ کسی نے مجھے بڑی بی کہہ کر بلایا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا'' اگل بغل میں بیٹھے لوگ فرضی بوا کی اس لن ترانی پر اپنی ہنسی روک نہ پاتے تھے۔

فرضی بوا زبان کی ہی کڑوی نہیں تھیں بلکہ اُسکا دل بھی کالا تھا۔ کسی کی خوشی اُس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ دوسروں کی غیبت کر کے ہی اُسکے من کو سکون ملتا تھا۔ خود را فضیحت دیگر ا نصیحت کے مصداق خود تو لگائی بجھائی سے ہی فرصت نہیں پاتی تھی پر دوسروں کو درس دیتے نہیں تھکتی تھی۔ خود تو ایک بار بھی سجدے میں نہیں گری پر دوسروں کو نماز نہ پڑھنے پر قتل خوار کر دیتی تھی۔ خود کسی منگتا فقیر کو ایک پھوٹی کوڑی تک نہ دیتی تھی پر دوسروں کو زکوۃ نہ دینے پر ڈانٹ دیا کرتی تھی۔ دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی اُسے بہت پرانی عادت تھی۔ کسی کے گھر میں ذرا سا قضیہ کیا ہوا کہ فرضی بوا پہنچ گئی پنچایت لگانے۔

رضانا کی اچھی خاصی گھر گرہستی بوا کے کارن ٹوٹ گئی۔ نہ جانے اُسنے رضانا کے کان میں کیا پھونک دیا کہ وہ اپنی بیوی جلہ سے ایسا متنفر ہو گیا کہ ایک مہینے کے بعد اُس سے خلع لے لیا۔ بوا کی من کی مراد پوری ہوئی۔ وہ اصل میں جلہ کو اپنے رنڈوے بھتیجے کے نکاح میں لینا چاہتی تھی۔ یہ عقدہ تب کھلا جب وہ جلہ کو اپنے بھتیجے کے حق میں ہموار کرنے لگی۔ ایسی بچا بچا کٹنی تھی وہ کہ جہاں جاتی تھی وہاں آگ لگا کر آتی تھی۔ لوگ اس عمر میں اپنی آخرت سنوارنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ایک وہ تھی جو جیسے آب حیات پی کر آئی تھی۔ جب دیکھو کہیں نہ کہیں بھس میں چنگاری ڈالنے کی تاک میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اب یہ گاؤں والوں کی بزدلی تھی یا انکی شرافت کہ کوئی بھی اس چنچل خود فرضی بوا کے منہ میں لگام ڈالنے کی ہمت نہیں کر پاتا تھا۔ دراصل شرافت اور مروت ابھی تک زندہ تھی۔ گاؤں والوں کے دیدوں کا پانی ابھی تک ڈھلا نہیں تھا۔

حلیمہ زندگی اور موت کی کشمکش سے گزر رہی تھی ایسے میں فرضی بوا بھلا دور کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ اتنی عجلت میں دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ اگر جلدی سے حلیمہ کے پاس نہ پہونچی تو کہیں یہ چلتی پھرتی دنیا رک نہ جائے۔ کہیں حلیمہ کی سانسوں کی ڈور تھم نہ جائے۔ کوئی سامنے آکے کھڑا ہو جاتا تھا تو وہ اُسے لاٹھی سے پرے ہٹاتے ہوئے برا سا منہ بنا کر آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اسکا دم پھولا ہوا تھا۔ پوپلا منہ ایسے چل رہا تھا جیسے منہ میں انگارے بھرے پڑے ہوں۔ وہ گرتے پڑتے جب حلیمہ کے کمرے تک پہونچی تو حلیمہ اُس وقت بے سدھ پڑی تھی۔ فرضی بوا نے حلیمہ کو ادھر اُدھر ہلایا ڈلایا۔ جب بے جان جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی تو وہ پیش از مرگ ہی واویلا کرنے لگی۔ اُسے واویلا کرتے دیکھ کر گھر میں کہرام مچ گیا۔ پاس پڑوسی شور سن کر گھروں سے نکل آئے اور بشیر کو حوصلہ دینے لگے۔ بشیرا جو بچے کا منہ دیکھنے کے لئے کب سے ترس رہا تھا، بوا کو روتے پیٹتے دیکھ کر اُس پر تو بجلی گری اور وہ ایسے ٹوٹ کے گرا کہ پاس پڑوسی حلیمہ کو بھول کر اُسے ہوش میں لانے لگے۔ فرضی بوا کو نہ تو بشیرا کی کوئی فکر تھی اور نہ حلیمہ کے جانے کا کوئی افسوس۔ وہ تو بس پاس پڑوسیوں کے پیچھے پڑی تھی'' ارے یہیں پر سارے کیوں مرے پڑے ہو۔؟ کوئی اوپر جا کر سورہ یاسین تو پڑھ کر آؤ۔ کم سے کم نصیبوں جلی کی موت کی سختی تو کم ہو جائے۔'' وہ چیختی چلاتی رہی مگر اُسکی آواز کسی نے نہ سنی۔ ہر کوئی بد حواسی کے عالم میں ادھر سے اُدھر بھاگا پھر رہا تھا۔

گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ گھر والوں نے حلیمہ کو مردہ قرار دیا تھا اور پاس پڑوسی آ کر کفن کی تیاریوں میں لگے تھے کہ کسی نے نانی کو خبر کر دی۔ نانی بھاگی بھاگی چلی آئی۔ حلیمہ کی نبض ٹٹولی۔ وہ اگل بگل میں کھڑے لوگوں پر برس پڑی اور انہیں کمرے سے باہر بھگا دیا اور پھر کمرہ اندر سے بند کر دیا۔ بشیرا باہر کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا۔ نانی کو دیکھ کر من میں ایک موہوم سی اُمید جاگی۔ اس امید و بیم کے عالم میں بس من میں یہ کھٹکا رہا کہ پتہ نہیں کب دروازہ کھل جائے اور کب نانی

کف افسوس مل کر نکل جائے پر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بہت دیر تک ایک پر اسرار خاموشی چھائی رہی اور پھر اچانک کمرے کے اندر اور باہر عورتوں کی سرگرمی تیز ہوگئی۔کوئی گرم پانی کی بالٹی لے کر جارہی ہے کوئی تیل گرم کرنے کے لیے کچن کی طرف دوڑ رہی ہے۔ جتنے بھی مرد تھے سب باہر دم سادھے بیٹھے تھے۔بشیرا اکے بیچ یتیموں سی صورت بنائے ہیرآ تے جاتے کو دیکھ رہا تھا۔فرضی بوا بھی ایک کونے میں چلی بھنی کو تبصرہ بھیج رہی تھی۔'' بڑی آئی مسیحائن کہ۔ساری زندگی کبھی ایک وقت کی نماز نہیں پڑھی، آ گئی مردوں میں جان پھونکنے والی۔'' وہ بڑبڑا ئے جارہی تھی کہ اچانک کسی نوزائیدہ کی چیخ فضا میں گونجی۔باہر جتنے بھی مرد بیٹھے تھے وہ یہ چیخ سن کر ایسے اُچھل پڑے جیسے یہ چیخ اُ نکے لئے زندگی کی نوید لے کر آ گئی ہو۔حلیمہ نہ صرف بچ گئی تھی بلکہ اُس نے ایک گول مٹول بیٹے کو بھی جنم دیا تھا اور نانی کی بروقت مداخلت سے زچہ اور بچہ حیات پا گئے تھے۔بشیرا خوشی سے پاگل ہوکر نانی کے قدموں میں گرا اور جذبات سے مغلوب ہو کر اُسکے ہاتھوں کو چومنے لگا۔فرضی بوا اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔اُس نے اچھی خاصی حلیمہ کو مردہ قرار دیا تھا۔اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود وہ اپنی شکست تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھی اسلئے وہ غصے سے اپنی لاٹھی زمین پر مارتے ہوئے بڑبڑ کرتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔اس واقعے نے فرضی بوا کی بچی کھچی ساکھ بھی ختم کردی تھی جب کہ نانی کی عزت اور عظمت اور بڑھ گئی تھی۔نانی صحیح معنوں میں ایک مسیحا کی طرح تھی جسے یہاں کے دکھ درد مٹانے کے لئے خدا نے پیدا کیا تھا۔

نانی کے خوف و دہشت کے باوجود اس گاؤں میں کچھ اس طرح کے واقعات بھی رونما ہوئے جنہوں نے اس گاؤں کی ساکھ پر بٹہ لگا دیا۔سب سے بڑا واقعہ شبری کا تھا۔شبری اسی گاؤں کے ایک ٹھیک اور عزت دار باپ نیل کنٹھ کی بیٹی تھی جو شکل سے بڑی بھولی اور رکھ رکھاو سے بڑی سیدھی سادھی لگتی تھی۔ ہوا یوں کہ پاس کے گاؤں میں امرتسر کے ایک منیاری چھوٹے لال کی دکان تھی جہاں صبح شام عورتوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔چھوٹے لال کی دوکان پر عورتوں کے حسن و آرائش سے 'جڑی ساری چیزیں' مناسب داموں پر دستیاب تھیں۔وہ خود تو بڑا ٹھیک اور ایماندار تھا اور اُسکی نظر بھی صاف تھی مگر اُسکے چھورے بابو لال کی آنکھیں البڑ اور شوخ حسیناؤں کو دیکھ کر چھپنے لگتی تھیں۔اُنکا تھل تھل کرتا، گدرایا بدن دیکھ کر اُسکے منہ سے رال ٹپکنے لگتی تھی۔اُسکی حالت اُس پیاسے جیسے ہوتی تھی جسنے بڑے دنوں بعد پانی کا چھل چھلاتا چشمہ دیکھ لیا ہو۔بابو لال چہرے مہرے سے برا تو نہیں تھا پر نظر بڑی خراب تھی۔شبری بھی اُسکی دوکان سے کبھی شیشہ کنگی، کبھی سرمہ کاجل اٹھا کر لاتی تھی۔وہ کمبخت دنیا کی اولاد اُدھار کے راستے اُسے شیشے میں اُتارتا جا رہا تھا اور وہ اُسکے دام میں پھنستی چلی جارہی تھی۔اُسکی جگہ کوئی اور ہوتی تو اُسکی چند یا پر بال نہ چھوڑتی اور بعد میں اُسے ٹھینگا دکھاتی پر شبری تھی بڑی بھولی۔وہ دل کے ہاتھوں لٹ گئی۔وہ کہتے ہیں نا کہ پریت نہ جانے جات کجات۔شبری کو پتہ نہیں چلا کہ بابو لال سرمہ بیچتے بیچتے کب آنکھوں کے راستے اُسکے دل میں اتر گیا۔شبری اُسکے پیار میں پاگل ہوگئی۔رام جی کی گائے جیسے دکھنے والی شبری ایک دن بابو لال کے ساتھ بھاگ گئی۔ جب یہ خبر گاؤں میں پھیل گئی تو گاؤں میں کہرام مچ گیا۔کوئی کشمیری بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ ایک امرتسر کا چھورا اُن کے گاؤں کی چھوری کو لے کر بھاگ جائے۔ یہ تو سیدھے سیدھے اُنکی عزت پر ہاتھ ڈالنے والی بات تھی۔ شبری نے پورے گاؤں کے منہ پر کالک پوت دی تھی۔نانی تو اس خبر سے ایسی ٹوٹی کہ دو دن تک اُسکے منہ میں اناج کا ایک دانہ نہ گیا۔ایسا لگ رہا تھا جیسے نیل کنٹھ کی بیٹی نہ بھاگی ہو بلکہ نانی کی اپنی بیٹی بھاگی ہو۔نانی کو منانے کے لیے سارا گاؤں اُسکے گرد اکٹھا ہوا پر نانی نے پانی تک نہ پیا۔وہ تو بس اپنے آپ کو کوستی رہی کہ آخر اُسکے ہوتے ہوئے ایسا کیسے ہوگیا۔ایک لڑکی اس گاؤں کے ننگ و ناموس کو ٹھینگا دکھا کر یوں کیسے نکل گئی۔گاؤں کے کبرو جوان شبری کے عاشق بابو لال کے خون کے پیاسے تھے۔آخر امرتسر کا ایک منیاری والا اُن کی عزت پر اسطرح ڈاکہ کیسے ڈال سکتا ہے۔ پولیس نے خطرے کو بھانپ لیا تھا اسلئے اُنہوں نے سب سے پہلے چھوٹے لال کو گاؤں والوں کے عتاب سے بچانے کے لئے اُسے گرفتار کرکے حوالات میں ڈال دیا تاکہ لوگوں کا غم و غصہ کچھ کم ہو جائے۔ساتھ ہی بابو لال کی تلاش میں پولیس جگہ جگہ چھاپے مارتی رہی۔آخر پولیس کی مشقت دو دن کے بعد رنگ لائی۔بابو لال شبری کے ہمراہ جواہر ٹنل کے پاس پکڑا گیا۔وہ شبری کو لے کر امرتسر بھاگنے کی کوشش میں تھا۔ بابو لال کو مصلحتاً قاضی گنڈ کے پولیس اسٹیشن میں رکھا گیا کیونکہ اُسے دیکھ کر گاؤں والے مشتعل ہو سکتے تھے۔شبری کو پولیس اپنے ساتھ بڈگام لے آئی۔اُنہوں نے اُسے ماں باپ کے سپرد کرنے کی بجائے نانی کو سونپ دیا۔نانی نے شبری کو دیکھا تو اُسکا چہرہ پہلے غصے سے تمتما اُٹھا پھر وہ کراہت سے اُسے یوں گھورنے لگی جیسے وہ ایک جیتی جاگتی لڑکی نہ ہو بلکہ سڑے ہوئے پھل کی ٹوکری ہو جسے اگر جلدی سے باہر نہ پھینک دیا گیا تو فضا مکدر ہو جائے گی۔پورے ماحول میں سڑاند پھیل جائے گی۔شبری کی جان سولی پر اٹکی ہوئی تھی۔دل خوف و ہراس سے ڈوبا جا رہا تھا۔وہ تو بس اس انتظار میں تھی کہ پتہ نہیں کس پل نانی کا ہاتھ اشارے کے لئے اٹھے اور گاؤں والے اُس پر قہر بن کر ٹوٹیں۔نانی نے بڑی حقارت سے اُسکی طرف دیکھا اور پھر اُسکے منہ پر تھوکتے ہوئے بولی۔'' جی کرتا ہے کہ میں تجھے زندہ زمین میں گاڑ دوں کیونکہ تو اس گاؤں کی رسوائی کا باعث بنی ہے۔تو نے اس گاؤں کے تقدس کو پامال کیا ہے۔تو نے میری برسوں کی عبادت پر پانی پھیر دیا ہے۔میں نے آج تک کسی کو بد دعا نہیں دی ہے پر آج میں تمہیں یہ بد دعا دیتی ہوں کہ تو نے جسطرح اپنے ماں باپ کو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رکھا خدا کرے کہ تو بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہ جائے۔''

شبری خوب روئی دھوئی، چیخی چلائی۔ نانی کے پاؤں پکڑ کر گڑ گڑا کر اُس سے معافی مانگی، پر نانی کا دل نہ پسیجا۔ اُسے اس صدمے نے پتھر کر دیا تھا۔ آخر تھک ہار کر وہ اُٹھ کے اپنے ماں باپ کے ساتھ چلی گئی۔ چھوٹے لال بھی کچھ دن کے بعد اپنی دکان بیچ باچ کر واپس امرتسر لوٹ گیا۔ بیٹے کی ایک چھوٹی سی بھول نے اُسکی زندگی غارت کر کے رکھ دی تھی۔ اُسکی اچھی بھلی ساکھ مٹی میں ملا کر رکھ دی تھی۔ اُسے کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ چھوڑا تھا۔

اس واقعے کے ٹھیک چھ مہینے بعد گاؤں میں چیچک پھیل گئی۔ شبری بھی اس بیماری کی زد میں آ گئی۔ کچھ علاج میں دیر سویر ہونے کی وجہ سے اور کچھ بیماری کے بارے میں زیادہ معلومات نہ ہونے کے باعث شبری کے چہرے پر چیچک کے دانے نکل آئے۔ نانی کی بددعا کام کر گئی تھی۔ جب وہ بستر چھوڑ کی اُٹھی تو اپنی بھیانک صورت دیکھ کر وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ اُسکا خوبرو چہرہ بڑا بدصورت ہو گیا تھا۔ اس صدمے نے اُسے اندر ہی اندر اسطرح توڑ کے رکھ دیا کہ وہ اندر ہی اندر گھٹتی رہی اور اس گھٹن نے ڈیڑھ سال کے اندر اُسکی جان لے لی۔

مجھے یاد ہے کہ میں جب صبح صبح کاندھے پر کتابوں کا بستہ ڈالے اسکول کی طرف بھاگنے لگتا تھا تو نانی مجھے اسی پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے چوکڑی مار کر بیٹھی ہوئی نظر آتی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اشارے سے مجھے اپنے پاس بلاتی اور مجھ سے پوچھتی۔ ''اسکول جا رہے ہو کیا؟'' میں اثبات میں سر ہلا دیتا۔ وہ جیب میں ہاتھ ڈالکر ایک اخروٹ نکال کر میری طرف بڑھا کر کہتی۔ ''جا خیر سے جانا اور خیر سے آنا۔''

وہ سب کے لئے خیر کی متمنی تھی۔ جو بھی اُسکے سامنے سے گزرتا تھا وہ اُس کے لئے خیر کی دعا کرتی تھی۔ شاید دوسروں کے لئے خیر مانگتے مانگتے اُسکا نام خیر والی نانی پڑ گیا تھا۔ وہ پتہ نہیں کس دنیا کی مخلوق تھی۔ اُسے اپنے سے زیادہ دوسروں کی فکر ستاتی رہتی تھی۔ آجکل کے زمانے میں ایسے لوگ کہاں ملیں گے جنہیں دوسروں کی اتنی چنتا ہو۔ نانی تو فرشتوں کی سیرت اور ولیوں کی صفت لے کر پیدا ہوئی تھی۔ جبھی تو اُسکو اس گاؤں کے بھی بچے بالے اپنے لگتے تھے۔

ایک بار میں نے گل فراش کے باغ سے چوری چھپے دو خوبانیاں توڑیں۔ پتہ نہیں کریم مالی نے مجھے کہاں سے خوبانیاں توڑتے ہوئے دیکھا۔ وہ ہاتھ میں ڈنڈا لے کر میرے پیچھے بھاگا۔ میں چیختا چلاتا نانی کی گود میں جا کر چھپ گیا۔ نانی نے کریم مالی کو جب اپنی اور آتے دیکھا تو وہ غضبناک ہو کر کھڑی ہو گئی اور اُسکی طرف جارحانہ انداز سے بڑھتے ہوئے بولی۔

''تیرا بیڑا غرق ہو۔ کیوں اس بچے کو تم نے اتنا دوڑایا؟''

''اسنے باغ سے خوبانیاں توڑیں ہیں'' کریم مالی نے بیزاری سے کہا۔

''ہائے ہائے دو خوبانیاں ہی توڑیں ہیں نا۔ تیرا کلیجہ کاٹ کے تو نہیں لے گیا۔ ارے کمبخت کیوں دو خوبانیوں کے پیچھے اپنی جان ہلکان کئے جا رہے ہو۔ ارے جس کا یہ باغ ہے وہ تو یہاں آج تک جھانکنے بھی نہیں آیا۔ ایک تم ہو کر خوامخواہ میں اپنا خون جلا رہے ہو۔ وہ کہتے ہیں نا تیلی کا تیل جلے مشعلچی کا دل جلے۔ جا اپنی خیر منا۔ آگے سے کسی بھی معصوم کی چھاتی پر اسطرح سوار مت ہونا۔ خدا غارت کر دے گا تمہیں۔ دیکھو تو اس معصوم کا دوڑا دوڑا کے کیا حال کر دیا تم نے۔ جا اب کھڑے کھڑے دیدے پھاڑ کے کیا دیکھ رہے ہو۔ نانی کو پہلے نہیں دیکھا کیا۔ جا دفع ہو جا یہاں سے۔''

کریم مالی بڑبڑاتا ہوا نکل گیا۔ میں ابھی تک ڈرا اور سہما ہوا نانی کے پیچھے کھڑا تھا۔ نانی نے جیب میں ہاتھ ڈالکر مجھے ایک اخروٹ نکال کر دیا اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی۔ ''بچہ چوری کرنا گناہ ہے۔ جو چوری کرتا ہے قیامت کے دن فرشتے اُسکے ہاتھ کاٹ دیتے ہیں''

یہ نانی کی باتوں کا اثر تھا یا میرے کمزور دل کا قصور کہ اُس دن کے بعد میں نے کبھی بھی پرائے مال پر نظر نہیں ڈالی۔ ہر بار قیامت والی بات مجھے ڈراتی رہتی تھی۔

پھر ایک دن ایسا بھی آ گیا جب اس گاؤں کی صدیوں پرانی تاریخ بدل گئی۔ گاؤں دین دھرم کے نام پر بٹ کے رہ گیا۔ پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ نانی مسلمان ہے اور میں ہندو ہوں۔ جب وادی کے حالات خراب ہو گئے اور اقلیتی فرقے کا چل چلاؤ شروع ہو گیا تو میرے گھر والوں نے بھی اُدھر کا رُخ کر لیا۔ میں نے ماں کو جب کپڑے لتے باندھتے دیکھا تو میں نے بڑی حیرت اور معصومیت سے پوچھا ''ماں ہم کہاں جا رہے ہیں''

ماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ''ہم یہ گاؤں چھوڑ کے جا رہے ہیں۔'' میں پہلے اس خبر سے شاق ہوا اور پھر میں نے غصہ ہو کر کہا۔ ''میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں یہیں نانی کے پاس رہوں گا۔'' یہ کہکر میں روتا ہوا نانی کے پاس چلا گیا۔ میں نانی کے پہلو میں منہ چھپا کر روتے روتے بولا۔ ''میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں یہیں تمہارے پاس رہوں گا۔'' نانی کچھ نہ بولی۔ وہ پتھر بنی بیٹھی رہی۔ میں اُسکے سامنے روتا بلکتا رہا، پھر بھی وہ کچھ نہیں بولی۔ میں حیران و پریشان تھا کہ آخر یہ نانی کو کیا ہو گیا وہ کچھ بول کیوں نہیں رہی ہے۔ اب کے مجھے نانی پر بھی غصہ آ گیا اور میں اپنی برہمی کا اظہار کر کے وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔

اگلے روز ہم گاؤں چھوڑ کر چلے گئے۔ جانے سے پہلے میں نانی کے پاس دوڑ کر گیا۔ نانی نے مجھے گلے سے لگایا اور مجھے ایک اخروٹ دے کر وہ وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔ میں بہت دیر تک کھڑا نانی کی طرف دیکھتا رہا کہ شاید وہ آگے جا کے رک جائے گی اور مجھے خیر سے جانے اور خیر سے آنے کی دعا دیکر چلی جائے گی پر یہ دیکھ کر میرا دل ٹوٹ کے رہ گیا کہ اُسنے ایک بار بھی پلٹ کر میری طرف نہیں دیکھا اور وہ آگے چل کر کہیں سرمئی غبار میں گم ہو کر رہ گئی۔

آج پورے چودہ برس کے بعد میں اپنے گھر اپنے گاؤں لوٹا تھا۔

ساتی وقت کی مٹی میں۔

فراز

نوید سروش

(میر پور خاص)

اگر خوف کی کوئی آواز یا تصویر ہوتی تو آج رات اس گھپ اندھیرے میں ساجدہ اور لیاز کے چہروں پر دیکھی اور ان کے جسموں سے سنی جا سکتی تھی۔ دونوں نیم کے درختوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ یہ دونوں درخت اتنے قریب تھے کہ ذرا اوپر جانے کے بعد ان کی چھوٹی بڑی پھیلی ہوئی شاخوں کو الگ الگ کرنا ناممکن سا تھا بالکل اسی طرح ساجدہ اور لیاز ایک دوسرے سے ایسے چپکے ہوئے تھے کہ انہیں الگ الگ کر کے دیکھنا مشکل تھا۔ لیاز نے ساجدہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا ''میں نے سارا انتظام کر لیا ہے بس کل کا دن تمہاری جدائی میں گزرے گا پھر ہم کبھی جدا نہیں ہوں گے''۔۔۔ ساجدہ نے لیاز کے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا ''آہستہ بولیں کہیں یہ رات، ہوا اور درخت ہماری باتیں نہ سن لیں اور پھر۔۔۔۔۔؟

جھینگر اور مینڈکوں کی آوازوں کے ساتھ دونوں سرگوشی کے انداز میں باتیں کرتے اور ان کے خاموش ہونے پر خود بھی خوف سے چپ ہو جاتے۔ لیاز نے کہا ''کل رات تم دو بجے پرانی حویلی کے مزار کے پچھلے حصے میں آ جانا میں تمہیں وہاں ملوں گا۔ حمید موٹر سائیکل پر ہمیں بڑی سڑک تک چھوڑے گا وہاں میں نے ایک ٹیکسی کا انتظام کیا ہوا ہے جو حیدرآباد تک لے جائے گی اور ہم پھر صبح پانچ بجے ٹرین میں سوار ہو کر شام سے پہلے ملتان پہنچ جائیں گے''۔۔۔ ''ملتان! ہم کس کے گھر جائیں گے''۔ ''ملتان کے قریب ایک گاؤں میں حمید کے ایک دوست کے گھر ڈیرا ڈالیں گے' پھر آگے اللہ مالک ہے''۔۔۔ ''اگر ہماری اس حرکت کا کسی کو پہلے پتہ چل گیا تو''؟۔۔۔ ''چل گیا تو' جب دیکھا جائے گا''۔۔۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد لیاز نے سرگوشی کے انداز میں کہا ''کیا تمہیں ناہید باجی پر یقین ہے کہ وہ ہمارا ساتھ دیں گی''۔۔۔ ''مجھے اپنے سے زیادہ ان پر یقین ہے کیا تمہیں یاد نہیں کہ میرے گھر تمہارے رشتے کی بات کس نے کی تھی اور دیکھو اس وقت بھی اپنا آرام' گھر اور بچہ چھوڑ کر ہماری چوکی داری کر رہی ہیں''۔ ساجدہ یہ کہتے ہوئے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اور گردن اِدھر اُدھر گھمانے لگی جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہو۔ پھر بڑی آہستگی سے کہا کہ ''لیاز تمہیں تو سب معلوم ہے کہ ناہید باجی بہت دکھی ہیں۔ ان کے سامنے ان کے محبت کرنے والے شوہر کو مار ڈالا اور اب بوڑھی ماں اور بچے کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں''۔ یہ کہتے ہوئے ساجدہ آب دیدہ ہو گئی۔ لیاز نے اُسے اپنی بانہوں میں مزید سمیٹ لیا۔ ہوا کی سرسراہٹ بار بار انہیں ماحول سے ہوشیار رہنے کی اطلاع دیتی رہی۔

''میرے پاس اتنی رقم ہے کہ ہم ایک ڈیڑھ ماہ آرام سے گزار لیں گے۔ بس تم اپنے دو جوڑے ساتھ لے لینا اور کچھ نہیں''۔ لیاز نے کچھ نہیں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ناہید باجی نے زبردستی پانچ سو روپے دیے ہیں کہ رکھ لو کام آئیں گے وہ کہہ رہی تھیں کہ تمہارے والدین راضی نہ ہوئے تو تمہیں اختیار ہے کہ جو تم چاہو کرو تم بالغ ہو' سمجھ دار ہو اور میٹرک پاس ہو اور اپنی مرضی سے جینے کا حق رکھتی ہو۔ لڑکا بھی ہر لحاظ سے مناسب ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم دونوں خوش رہو گے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو''۔۔۔ ''اچھا تو تم بالغ ہو اور سمجھ دار بھی ہو مجھے تو علم ہی نہیں تھا اور دیکھو ناہید باجی نے میرے اچھا ہونے کی تصدیق بھی کر دی ہے''۔ لیاز نے شرارتی انداز اپنایا۔ اور دونوں دبی دبی سی ہنسی ہنسنے لگے۔۔۔۔ ''اچھا اب میں چلتی ہوں خاصی دیر ہو گئی ہے بے چاری ناہید باجی بھی تھک گئی ہوں گی میں انشاء اللہ کل پہنچ جاؤں گی' تم اپنا خیال رکھنا''۔۔۔۔ ''تم بھی اپنا خیال رکھنا میں تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔ دل تو چاہتا ہے کہ آج ہم جدا ہی نہ ہوں'' لیاز نے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے رومانوی لہجے میں کہا۔۔۔ ''نہیں نہیں مجھے اب جانے دو گاؤں کے کسی آدمی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا''۔۔۔ ''ارے ساجدہ جی اب یہ گاؤں کہاں رہا ہے۔ جب سے گیس بجلی اور سڑکیں بنی ہیں ایک چھوٹا سا شہر بن گیا ہے''۔۔۔۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو شاید یہی وجہ ہے کہ میں بھی ہمت کر کے تم سے ملنے چلی آئی ہوں''۔۔۔

ساجدہ حسبِ معمول صبح جلدی اٹھی اور گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ آج اس پر عجیب سا خوف طاری تھا۔ اُسے لمحہ لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ کسی کے آواز دینے پر چونک اٹھتی' کبھی کام کرتے کرتے گم سم ہو جاتی اور پھر ہڑبڑا کر اپنے وجود کو ٹٹولتی تو اُسے اپنے اندر خوف کی ایک لہر محسوس ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو نارمل رکھنے کے لیے ہر جتن کر رہی تھی کہ کہیں ماں باپ اور بھائی بہن کو شک نہ ہو جائے۔ وہ شدت سے رات کا انتظار کر رہی تھی۔

''باجی میں صبح سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔۔۔ دیکھیں میں کیسی ٹھنڈی ہو رہی ہوں''۔ ساجدہ نے ناہید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔ ''تم فکر مت کرو میں شام تک تمہارے ساتھ ہوں''۔ ناہید نے اپنا بچہ ساجدہ کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔ ''باجی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے پتا نہیں کیا ہو''۔۔۔ ''ڈرو نہیں جاؤ اپنا کام کرو''۔

ساجدہ بجھی بجھی سی بے دلی کے ساتھ گھر کے کام میں لگ گئی۔ دوپہر کا کھانا ناہید نے سب گھر والوں کے ساتھ کھایا۔ کھانے کے بعد ساجدہ کمرے میں جا کر بے سدھ پڑ گئی خوف اُس پر بارش کی طرح برس رہا تھا اور وہ اپنے آپ کو ناکامی اور بدنامی کی دلدل میں دھنستا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ ساجدہ کے کانوں میں اپنے ماں باپ اور ناہید کی سرگوشیاں دھماکے کر رہی تھی۔ ایک کڑک دار آواز نے اُس کے بدن میں کپکپی سی پیدا کر دی۔ ساجدہ کے والد غصیلے انداز میں چیخ رہے تھے کہ "اب لیاز نے اس گھر کی طرف نظر بھی کی تو اُس کے ٹکڑے کر دیں گے"۔ ساجدہ کی ماں نے بھی اپنے شوہر کا ساتھ دیتے ہوئے کہا "نہ اُس کی ذات برادری اور نہ پلّے میں کچھ اور چلا ہے میری بیٹی کا ہاتھ مانگنے"۔ کچھ دیر بعد ناہید ساجدہ کے پاس کمرے میں خاموش بیٹھی رہی۔ ساجدہ نے ناہید کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھتے ہوئے کہا "باجی دیکھو دل کیسے دھک دھک کر رہا ہے کہیں یہ پھٹ نہ جائے"۔۔۔ "خود کو سنبھالو میں رات کو چکر لگاؤں گی تمہارے کپڑوں اور چادر کی تھیلی میں رات گھر جاتے وقت لیتی جاؤں گی۔ تم پچھلے دروازے سے نکلنا میں تمہیں وہاں ملوں گی اور بس"۔۔۔ "باجی رات کو ضرور آنا مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے"۔۔۔ "تم فکر مت کرو میں ضرور آؤں گی"۔

ساجدہ کے لیے آج کی شام کسی قیامت سے کم نہیں تھی وہ اپنے والدین کا سامنا کرنے سے گریز کر رہی تھی۔ اس کے لیے ایک ایک لمحہ کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اس بے چینی اور خوف کو کم کرنے کی غرض سے دو ایک چکر پڑوس میں بھی لگا کر آئی تھی مگر اُسے سکون نہیں مل رہا تھا۔ وہ شدت سے ناہید باجی اور رات تین بجے کا انتظار کر رہی تھی۔۔۔ نو بجے کے بعد اُسے گھر کے صحن میں ناہید باجی کی آواز کے ساتھ ابا کی آواز یں سنائی دینے لگیں۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی اور قریب جا کر سننے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اُسے سخت تشویش ہوئی کہ ناہید باجی ابا سے کیا باتیں کر رہی ہیں۔ کہیں ناہید باجی۔۔۔؟؟ "نہیں نہیں مجھے ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ ساجدہ ابھی انھی خیالات میں تھی کہ ناہید کمرے میں داخل ہوئی۔ ساجدہ کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سوجھ رہی تھیں۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اُس کا نازک صاف بدن پسینے سے شرابور تھا۔۔۔ ناہید ساجدہ کے سرھانے بیٹھ گئی اور اپنا ہاتھ اُس کی پیشانی پر رکھ دیا۔ پیشانی بُری طرح تپ رہی تھی۔ ناہید نے اُس کے گالوں سے آنسو صاف کیے اور کہا "اپنا حال دیکھا ہے ہمت کرو"۔۔۔ "ناہید باجی مجھے یہ بات پریشان کر رہی ہے کہ میرے یوں چلے جانے سے گھر کی عزت خاک میں مل جائے گی یہ لوگ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ سوچتی ہوں۔۔۔؟؟ اپنی محبت کو گھر کی عزت پر قربان کر دوں"۔۔۔ ساجدہ نے جذباتی انداز میں کہا "یہ تو اچھی بات ہے" ناہید نے لقمہ دیا۔ "ناہید باجی میرے سامنے اُس جاہل بدصورت بڈھے کا چہرہ آ جاتا ہے۔ جس سے بابا میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ یا اللہ مجھ پر اپنا کرم کر۔ میں کس امتحان میں ہوں۔۔۔ میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی"۔ ساجدہ آنسوؤں سے تر چہرہ ناہید کی گود میں رکھ دیتی ہے۔۔۔ ناہید اُس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نرمی سے کہتی ہے "ہمیں گھر کی عزت کا خیال رکھنا چاہیے۔ میری شادی میں جہاں میری محبت اور ضد شامل تھی وہاں میں نے والدین کی رضا مندی کا بھی انتظار کیا تھا"۔۔۔ "ناہید باجی میں مر تو سکتی ہوں مگر اُس بڈھے۔۔۔ میں ضرور جاؤں گی۔ میں لیاز سے وعدہ کر چکی ہوں"۔۔۔ ناہید نے اُسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا کہ "چپ ہو جاؤ چاچی اور راشدہ اسی طرف آ رہی ہیں۔ میں تمہاری تھیلی لے جا رہی ہوں"۔

ناہید کو دروازے کی طرف جاتا دیکھ کر ساجدہ کے والد دروازے بند کرنے کی غرض سے آگے بڑھے اور کہا "بیٹی میں تمھیں چھوڑ آؤں"۔۔۔ "نہیں چاچا جی چار قدم پر تو گھر ہے اور آج تو سرکاری بلب بھی جل رہا ہے بس آپ دروازہ بند کر لیں"۔ ناہید نے آخری جملے پر زور دے کر کہا اور گھر کی طرف چل دی"۔

ماں باپ اور بھائی صحن میں چارپائیوں پر سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔ کمرے میں ساجدہ کے ساتھ راشدہ تھی۔ آج ساجدہ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ دیوار پر لگی گھڑی کی ٹِک ٹِک اُس کے کانوں کے پردے پھاڑے ڈال رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بے ترتیب تیز دھڑکنوں کو توازن میں رکھنے کی کوشش کرتی اُسے کبھی یہ محسوس ہونے لگتا کہ اس کے دل کی تیز دھڑکنوں سے برابر میں سوئی ہوئی بہن نہ جاگ جائے۔ اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو دو بج رہے تھے۔ وہ اٹھی اور دبے قدموں باہر آئی۔ بھائی کے چہرے کو بھیگی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد باپ کی چارپائی کی طرف آئی وہ باپ کی پیر چھونا چاہتی تھی مگر ہمت نہ ہوئی۔۔۔ ماں کے سرہانے بیٹھ گئی۔ وہ بمشکل ہچکیوں کو روک سکی۔ اُس نے کپکپاتے ہاتھوں سے ماں کے بالوں پر ہاتھ پھیرا چہرے کو پیار سے چھوا اور کمرے میں لوٹ گئی۔ کمرے میں اپنی بہن کو دیکھا اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ اُسے کچھ چہ چہاہٹ سنائی دی۔ وہ خوف سے کانپ گئی ہر طرف سناٹے جیسی خاموشی تھی مگر اُس میں ایک قیامت کا شور تھا ساجدہ نے چلنے کا ارادہ کیا اُسے اپنے سامنے ماں باپ بھائی بہن کے مسکراتے باتیں کرتے چہرے نظر آنے لگے پھر یہی چہرے روتے غصے سے لال پیلے اور شرمو ندامت سے جھکے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ وہ کچھ لمحے سوچنے کے بعد تیزی سے اندر اسٹور میں گئی اور ایک گولی چلنے کی زور دار آواز رات کی تاریکی میں پھیل کر خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

پُشتنی نواب

گلزار جاوید (راولپنڈی)

ماحول ایک دم سراسیمہ' پُر اسرار بلکہ ہیبت ناک شکل اختیار کر گیا تھا۔ سردی میں گرمی اور گرمی میں سردی کی آمیزش نے جس کی ایسی کیفیت طاری کر دی تھی جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ کھڑکیاں' دروازے' روشن دان' پنکھے' پردے' جھاڑ فانوس اور سامانِ آرائش پنگوڑے میں پڑے شیر خوار بچے کی مانند اس قدر شدت سے اِدھر اُدھر جھول جھلک رہے تھے جیسے بڑی طاقت کا طوفان یا زلزلہ آ کر گذر گیا ہو۔ جیسے سمندر بپھر گئے ہوں۔ جیسے دریاؤں نے شہروں کا رخ کر لیا ہو۔ جیسے زمین پھٹ گئی ہو۔ جیسے آسمان سر پر آ رہا ہو۔ جیسے بجلی کڑک کر زمین سے ہم آغوش ہو گئی ہو۔ جیسے آتش فشاؤں کے دہانے کھل گئے ہوں۔ جیسے کسی ویران و سنسان اسٹیشن پر کھڑے بے کس و بے بس مسافر کی ٹرین چھوٹ گئی ہو۔ جیسے آپریشن ٹیبل پر لیٹے مریض کا سینہ چاک کرنے والے ڈاکٹر کو فرشتۂ اجل نے آ لیا ہو۔ جیسے کسی بھٹکے ہوئے مسافر کی جنگل بیاباں میں متاعِ حیات لٹ گئی ہو۔ جیسے سہاگ رات میں کسی سہاگن کا سہاگ چھن گیا ہو۔ جیسے کسی بیوہ کے جگر گوشے کو نیزے پر رکھ دیا ہو۔ جیسے قیامت کی گھڑی آن پہنچی ہو۔ جیسے میدانِ حشر سج گیا ہو۔

تشویش' تشکیک' غصہ' انتقام' منہ زوری' سرکشی' گھٹن' بے بسی' بے کسی' شوریدہ سری' حرماں' ملال' بد دلی' بے کلی کے لاوے نے ایک برادری' ایک انجمن' ایک گروہ اور ایک خاندان کی مانند باہم یکجائی کے ساتھ حملہ آور ہونے کی ٹھان لی۔ حسد' رقابت اور انتقام کے کیڑے نے نہایت چابکدستی سے دماغ کی اندھیری کوٹھری کے پٹ کھول کر ان تمام راستوں کو وا کر دیا جو ہر طرف' ہر سمت' اور ہر زاویے سے بندگلی کی اور جا کر گھٹا ٹوپ اندھیرے پر اختتام پذیر ہوا کرتے ہیں۔

آمادۂ فساد قوتوں نے بظاہر میدانِ جنگ آراستہ کر لیا تھا۔ دیر اگر تھی تو صرف ہوی کے سالار کی جانب سے سرخ جھنڈا لہرانے کی۔ کسی بھی وقت' کسی بھی لمحے انسانیت کی شکست اور درندگی کی فتح یقینی دکھائی دے رہی تھی۔ قبل اس کے انسانیت کو شرمندگی کا سامنا ہو' قبل اس کے حق' باطل کے روبرو شرمسار ہو' قبل اس کے آدمی کا انسانیت سے اعتبار اٹھ جائے' قبل اس کے بندے کا اپنے رب پر یقین متزلزل ہو جائے' ماما کی حیات بخش انگلیوں کے لمس نے چند ساعتوں میں مسیحائی کا وہ کرشمہ نمودار کر دیا کہ دماغ کی اندھیری کوٹھری کے تمام بلب ایک' ایک کر کے تیزی کے ساتھ روشن ہونے لگے۔ دھیرے دھیرے' آہستہ آہستہ' ہولے ہولے' مدھم مدھم' خراماں خراماں' نواب مرزا شوکت بیگ کی آنکھیں مندنے لگیں۔

''کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قبل' ہمارے ادارے کے اغراض و مقاصد اور قواعد و ضوابط کا مطالعہ نہایت ضروری ہوا کرتا ہے۔ بظاہر اس سے ایک زندگی منسلک ہوتی ہے! حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی ایک گھر' ایک کنبہ' کبھی پورا خاندان اس فیصلے کی زد میں آ جاتا ہے جو کسی طرح کی جلد بازی اور جذبات کی رو میں بہہ کر کیا جاتا ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ ایک سے زائد بار اچھی طرح خود بھی غور و فکر کر لیں اور اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی مشورہ فرمالیں۔ بسا اوقات لوگ عجلت میں فیصلہ کر تو لیتے ہیں۔ مگر نبھاہ نہیں پاتے۔ اس طرح ایک معصوم زندگی جس کا وجود پہلے ہی گناہ کی گالی سے گھائل ہوتا ہے' مزید پاش پاش ہو جاتا ہے۔'' ادارے کے منتظم سے فارم وصول کرتے ہوئے بیگم نواب مرزا حشمت بیگ نے مختصر جملہ ''آپ درست فرما رہے ہیں'' ادا کر کے فارم کا مطالعہ شروع کر دیا۔

''دیکھئے جناب!'' بیگم نواب مرزا حشمت بیگ کے اکلوتے صاحبزادے نواب مرزا شوکت بیگ نے فارم پر اچٹتی نظر ڈالنے کے بعد ادارے کے منتظم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ علم نہیں ہے کہ آپ کتنے عرصے سے اس ذمہ داری پر متمکن ہیں۔ البتہ! گمان ضرور ہے کہ آپ کو اس ادارے کا انتظام سنبھالے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا'' سر کی جنبش سے ادارے کے منتظم نے نواب مرزا شوکت بیگ کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے۔ ''جی ہاں' جی ہاں' درست فرمایا آپ نے! میں کوئی ڈیڑھ یا غالباً پونے دو برس سے یہاں ہوں۔'' اس دوران منتظم کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں مسلسل حساب لگانے میں مشغول رہیں۔ ''آپ سے قبل جو صاحب یہاں تعینات تھے' بڑا اچھا سا نام تھا ان کا'' حافظے پر زور دیتے ہوئے ''شاکر صاحب'' منتظم کے لقمہ دینے پر نواب مرزا شوکت بیگ کی مشکل آسان ہوئی تو وہ گفتگو کے سلسلے کو دوبارہ آگے بڑھانے میں کامیاب ہو سکے۔ ''آپ نے درست فرمایا' شاکر صاحب۔ شاکر صاحب سے پہلے بھی جو صاحب یہاں ہوا کرتے تھے۔'' ''عبد الغفور صاحب'' ''جی جی درست فرمایا۔'' منتظم کا جملہ درمیان سے اُچک کر نواب مرزا شوکت بیگ نے ایک مرتبہ پھر گفتگو کا سرا وہیں سے پکڑنے کی کوشش کی جہاں سے ایک یا غالباً دو مرتبہ چھوٹ چکا تھا۔

''مناسب تو نہیں لگتا'' بیگم نواب مرزا حشمت بیگ نے بیٹے کا کاندھا دباتے ہوئے خاموش رہنے کی تاکید کر کے بولنا شروع کیا۔ ''دراصل آپ کے ادارے کے بانی چیئرمین چوہدری صبغت اللہ صاحب ہمارے خاندانی دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔'' ''جی جی' ماشاءاللہ!'' ادارے کے منتظم نے پہلو بدلتے ہوئے نیازمندانہ رویہ اختیار کیا۔ ''جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے قریب دس سال پہلے چوہدری صاحب نے اس ادارے کی بنیاد بے ثمری اور

بے حیائی کے کٹھن سے اس جہاں میں آنے والے بچوں کے تحفظ کی غرض سے ڈالی تھی۔'' بے شرمی اور بے حیائی کا جملہ ادا کرتے ہوئے بیگم نواب مرزا حشمت بیگ کی آواز دھیمی اور نظریں نیچی ہوگئی تھیں۔ ''درست بالکل درست فرما رہی ہیں آپ!'' منتظم کی کواہی کو داد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے بیگم نواب مرزا حشمت بیگ پھر سے گویا ہوئیں۔ ''چوہدری صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ نواب صاحب ادارے کی سرپرستی کا بار اٹھائیں مگر نواب صاحب نے چوہدری صاحب کے بار بار اصرار کے جواب میں اپنی مصروفیت کا عذر پیش کر کے چوہدری صاحب سے معذرت کر لی تھی۔ البتہ!'' کرسی میں پہلو بدل کر چشمہ درست کرتے ہوئے ''دامے درمے' سخنے' نواب صاحب ہر وقت اور ہر طرح سے چوہدری صاحب کے ہمرکاب رہے۔''

نواب مرزا حشمت بیگ کا ادارے سے دیرینہ تعلق اور اُن کی خدمات سے باخبری کے بعد ادارے کے منتظم نے زیادہ تفصیل میں جانے اور مستقبل کی بابت اُن کا پروگرام جاننے کی قطعی کوشش نہ کی۔ وگرنہ عام حالات میں' ان کا طریقہ کار خاصا پیچیدہ' طویل اور صبرآزما ہوا کرتا ہے۔ نو نوابم اور مطلوبہ فارم بیگم نواب مرزا حشمت بیگ اور ان کے بیٹے نواب مرزا شوکت بیگ کی جانب بڑھاتے ہوئے منتظم نے تو جمع کی بابت دریافت کو ضروری جانا۔ مہمانوں کی جانب سے شکریہ کے بعد منتظم نے نہ صرف بیگم نواب مرزا حشمت بیگ اور ان کے صاحبزادے نواب مرزا شوکت بیگ کو کھڑے ہو کر گرمجوشی سے رخصت کیا بلکہ دروازے تک خدا حافظ کہنے بھی آیا۔

جتنے منہ اتنی باتیں والا محاورہ بیگم نواب مرزا حشمت بیگ کے خاندان پر قطعی صادق نہ آتا تھا۔ بڑے لوگوں میں' ایک دوسرے کے گھر بلاسبب آنا جانا یوں بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ شہر میں' ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں کے گھر ہیں ہی کتنے؟ ڈبل گنتی تک مشکل سے پہنچتے ہوں گے! اِکّے دُکّے کنبے' خاندان اور برادری کو پہلے تقسیم کے جن نے اِدھر اُدھر لا پٹخا بعد میں کچھ اپنے مشاغل اور مصروفیات کے باعث منظر سے غائب ہوتے گئے۔ نئی نسل کا جہاں تک سوال ہے انہیں ڈالرُ پونڈ' اور یورو کی چکاچوند نے کہیں کا نہ رکھا۔

بات اختلاف کی ہے تو وہ دیواروں سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ جس گھر میں کبھی کسی نے برتن کھڑکنے کی آواز نہ سنی ہو اُس میں اختلاف کی آواز کیونکر کسی کے کانوں میں پڑ سکتی ہے۔ جہازجیسے گھر میں ملازمین کی فوج ظفر موج کے علاوہ گنتی کے تین افراد بیگم نواب مرزا حشمت بیگ' اکلوتے بیٹے نواب مرزا شوکت بیگ اور ان کی دلہن بیگم عزت آرا نے تمام پہلوؤں پر ایک دوسرے سے کھل کر بات کی۔ ایک دوسرے کا نقطہ نظر سننے کے بعد تینوں افراد اس نتیجے پر پہنچے۔ خاندان کے وقار' حشمت اور جاہ وجلال کی روایت ہر قیمت پر برقرار رہنا چاہیے۔ کم ازکم ناک نقشہ' رنگ روپ' اور قد وقامت کو ہر حال میں اوّلیت دینا چاہیے۔ مال دولت' عزت آبرو' حسب نسب' خدا کے فضل سے پہلے ہی وافر مقدار میں موجود ہے۔

یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ نواب مرز فراست بیگ بننے سے قبل صاحبزادے کس نام سے جانے جاتے تھے۔ اس کی شاید ضرورت بھی نہ تھی۔ جس چیز کی ضرورت تھی اُس کا بندوبست بیگم نواب مرزا حشمت بیگ نے سب سے پہلے کرنا مناسب جانا۔ سکول میں داخلے سے قبل' ایک عالم دین اور ایک ماہر ٹیوٹر کا انتظام لازمی تھا۔ کئی پشتوں سے نوابی پس منظر کے حامل خاندان کے بچے کا اعلیٰ عادات و اطوار' نشست وبرخاست اور لب ولہجے کا حامل ہونا ضروری تھا۔ ماسٹر صاحب اور مولوی صاحب کی شبانہ روز کاوشوں کے ساتھ گھر کے تینوں افراد نے تمام مصروفیات ترک کرکے نواب مرز فراست بیگ کی تعلیم و تربیت میں اس قدر دلچسپی لینا شروع کی کہ چند ماہ کے بعد ہی نواب مرز فراست بیگ' ہمیں کی جگہ ہم' تو اور تم کی جگہ آپ بولنے لگے۔ گو کہ ان کی خوراک ابھی بھی نسبتاً زیادہ تھی۔ وہ ایک وقت میں کئی کئی چپاتیاں' پھل فروٹ اور مٹھائی وغیرہ پر نہایت تیزی سے ہاتھ صاف کر جاتے۔ اساتذہ اور اہل خانہ کی توجہ کے باعث نوالہ چباتے وقت وہ اس بات کا خیال ضرور رکھنے لگے تھے کہ کسی قسم کی آواز منہ سے باہر ہرگز نہ آئے۔ چائے' پانی اور دیگر مشروبات پیتے وقت بھی انہیں تاکید تھی کہ منہ سے شوں شڑپ کی آواز ہرگز باہر نہ آئے۔

سکول میں داخلے کے وقت نواب مرز فراست بیگ ہر لحاظ سے نواب خاندان کا چشم وچراغ نظر آنے لگے تھے۔ امرا اور رؤسا کے گھرانوں کے بچے جہاں تعلیم حاصل کیا کرتے ہیں وہاں ویسے بھی زبان وبیان کی باریکیاں انگریزی زبان سے مشروط ہوا کرتی ہیں لہٰذا نواب مرزا فراست بیگ کو سکول کے اندر بھی ایڈجسٹ کرنے میں قطعی دشواری کا سامنا نہ ہوا۔ سکول کی تعلیم کے ساتھ شام کی تعلیم وتربیت کھیل کود اور صحت مند تفریحی مشاغل' والدین اور دادی کی شفقت نے مرزا فراست بیگ کو نیا رنگ وروپ' نئی اٹھان اور نئی وجاہت سے آراستہ کر دیا تھا۔

سکول کی حد تک نواب مرزا شوکت بیگ اور نواب مرزا فراست بیگ کے رشتے کی بابت کسی کو کچھ علم نہ تھا۔ البتہ! خاندان کے قریبی عزیزوں اور دور پار کے رشتے داروں کو نئے تعلق اور نئے بندھن کی بابت تمام معلومات وقت کے ساتھ پہنچ رہی تھیں۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی حوالے سے نئے تعلق اور نئے بندھن کی بابت' اپنے فہم اور مزاج کے مطابق اشتیاق ضرور تھا۔

ایک مرتبہ بیگم نواب مرزا حشمت بیگ کے پھوپھیرے بھائی کے بیٹے نواب مرزا وجاہت بیگ اپنی بیگم اور بچوں کے ہمراہ بڑی بیٹی کی گودبھرائی کی رسم میں مدعو کرنے کی غرض سے نواب شوکت مرزا کے گھر تشریف لائے تو ان کی بیگم اور بچوں نے نواب مرز فراست بیگ کے عادات واطوار کو چبھتی نظروں سے

دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے اشاراتی گفتگو کے ذریعے نواب مرزا فراست بیگ کا تمسخر اڑانے کی کوشش کی جس کا بیگم نواب حشمت بیگ نے اس حد تک برا منایا کہ وعدے کے باوجود نواب مرزا وجاہت بیگ کے گھر اُن کی بیٹی کی رسم کو دھرائی میں نہ گئیں۔ کچھ اسی طرح کی صورت حال کا سامنا بیگم نواب مرزا شوکت بیگ کو اس وقت ہوا جب وہ اپنی خالہ زادکی رسم حنا میں تشریف لے گئی تھیں۔ ہر کوئی کن انکھیوں سے نواب مرزا فراست بیگ کو دیکھ کر زبان پر تو قابو رکھتا مگر آنکھوں اور چہرے کی رنگت پر کسی کو اختیار رہا کرتا ہے۔

یہ اُس وقت کی باتیں ہیں جب نواب مرزا فراست بیگ کا شمار بچوں میں ہوا کرتا تھا۔ اور ان کے چہرے مہرے اور بود وباش میں ان کا ماضی کہیں نہ کہیں چھلک ضرور آتا تھا۔ یعنی ایچ میں داخل ہوتے ہی نواب مرزا فراست بیگ کی شخصیت نئے روپ اور نئے بانک پن سے آراستہ ہو چکی تھی۔ آہستہ آہستہ پرانے لوگ بھی جہان فانی سے بڑی تعداد میں رخصت ہو چکے تھے۔ جو باقی بچے تھے انھیں وقت اور حالات کی تیز رفتاری نے ماضی سے ہمرشتہ ہونے کے لائق نہ چھوڑا تھا۔ اب جو کچھ تھا' جیسا تھا سب کے لیے حقیقی اور پائیدار تھا۔

وقت جس تیز رفتاری سے گزر رہا تھا' موسم اور مزاج اُس سے بھی زیادہ برق رفتاری سے منہ زور اور بے لگام ہو رہے تھے۔ جو باتیں اور عادات گئے وقتوں میں شان کے خلاف تصور کی جاتی تھیں' آج وہی حیثیت اور امارت کی نشانی گردانی جاتی ہیں۔ تہوار' تہذیب' تمدن اور روایات کے نام پر جس طرح نمود ونمائش' بے شرمی اور بے حیائی گھر کر رہی ہے اُسے دیکھ کر دل کانپ' کانپ جاتا ہے۔

کسی بھی واقعے کے ایک پہلو کو اگر مدِ نظر رکھا جائے تو اس کے نتائج سے نا انصافی کا امکان ہے۔ آج کے واقعے کی نسبت کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے ہمیں اُن چودہ برسوں کا تفصیلی مطالعہ کرنا ہوگا۔ جس میں نواب مرزا فراست بیگ نے پرورش پائی اور ان کی تربیت انجام کو پہنچی۔

چونکہ' بیگم نواب مرزا حشمت بیگ' ان کے بیٹے اور بہو کو اسی وقت ہوشیار ہو جانا چاہیے تھا جب آج سے سات یا آٹھ سال قبل نواب مرزا فراست بیگ نے باغ سے پھول توڑنے پر منع کرنے کے بعد مالی کو تھپڑ دے مارا تھا۔ واقعہ وہ بھی باعثِ تشویش تھا جب سکول میں لڑائی کے دوران نواب مرزا فراست بیگ کی ہاکی لگنے سے ایک لڑکے کا سر' خونم خون ہو چکا تھا۔ روک تھام اس واقعے کی بھی ہونا چاہیے تھی جب ملازمہ نے نواب مرزا فراست بیگ کے کمرے سے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس دریافت کی تھی۔ بڑ بونگ اُس وقت بھی مچنا چاہیے تھی جب نواب مرزا فراست بیگ نے اُسی نوجوان ملازمہ سے دست درازی کی کوشش کی تھی۔ قصہ وہ بھی دبا دیا گیا تھا جب کالج کی ایک لڑکی کو نواب مرزا فراست بیگ نے نامۂ عشق ارسال کیا تھا۔ لاپرواہی موٹر کار اور بائیک کے آئے روز ہونے والی ایکسی ڈنٹس کی جانب سے بھی برتی گئی تھی۔ بے جا ڈھیل' آدھی آدھی رات کو گھر سے باہر رہنے کی نسبت بھی دے دی گئی تھی۔ عدم توجہ کمپیوٹر' ای میلز اور طرح طرح کے موبائل فونز کے بے محابا استعمال کی بابت بھی تسلسل سے جاری تھی۔ لا انتہائی جیب خرچ سے تغافل بھی امارت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔

ایسی صورت حال میں اگر اپنا بیٹا بھی باپ سے اچانک بڑی رقم کا مطالبہ کر بیٹھے تو تعجب ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ منہ زور گھوڑے اور اڑیل ٹٹو کو راہِ راست پر لانے کے لیے بڑی برداشت' مہارت اور ہنر مندی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ایک دن' ایک وقت یا ایک لمحے میں پرانی عادتوں میں تبدیلی کی توقع سادہ لوحی کے سوا کس زمرے میں شمار کی جا سکتی ہے۔

نواب مرزا فراست بیگ اپنی مرضی سے اس گھر میں آئے تھے نہ ان کی عادتوں کے بگاڑ کی ذمہ داری اکیلے ان پر ڈالی جا سکتی تھی۔ ایک روپے سے لیکر ایک لاکھ تک کی ڈھیل ملنے والے نوجوان کو ہی اتنی جرأت اور حوصلہ ہو سکتا ہے کہ وہ بیک وقت باپ سے لاکھوں کی رقم کا یک مشت مطالبہ کر دے۔ جو شخص ایک روپے کے سفر کو ایک لاکھ روپے تک ڈھیل دے سکتا ہے' اُسے اس سے آگے کے مطالبات ماننے کی سوجھ بوجھ بھی ہونا چاہیے۔

''بیٹا! پیسہ نام ہے اس کیفیت اور احساس کا جس سے آپ جب چاہیں' جہاں چاہیں اپنی ضرورت اور آسائش کی ہر چیز اپنی دسترس میں لا سکیں۔ پیسہ نام ہے عزت کا' شہرت کا' حیثیت و مرتبے کا۔ پیسہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسے ہر وقت بے دریغ یا بے حساب لٹایا جائے۔ اس طرح' قارون کا خزانہ لٹانے والے بھی فقیروں کی صف میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔''

باپ کی نصیحت کا بیٹے پر مثبت اثر ہونے کے بجائے جلتی پر تیل ثابت ہوا۔ ''مجھے آپ کے فرسودہ فلسفے کی ضرورت ہرگز نہیں ہے۔ ضرورت ہے پیسے کی جو مجھے ہر قیمت پر چاہیے'' ۔ ''اگر نہ دوں تو کیا کر لو گے۔۔۔۔؟'' دھیرے دھیرے باپ کی برداشت بھی جواب دے رہی تھی۔ ''میں ۔۔۔ میں ۔۔۔ سب کچھ ۔۔۔ کر سکتا ہوں ۔۔۔'' چبا چبا کر جملے ادا کرتا ہوا آستین چڑھا کر باپ کی جانب بڑھنے لگتا ہے۔

''امی ۔۔۔ امی ۔۔۔ امی جان ۔۔۔'' بیٹے اور حلق کا پورا زور لگاتے ہوئے ''جی ۔۔۔ جی بیٹا ۔۔۔'' بیگم نواب مرزا حشمت بیگ خزاں رسیدہ بیٹے کو قیمتی دوپٹے سے ڈھانپتے ہوئے کسی قدر اونچی آواز میں جواب دیتی ہوئی مہمان خانے میں داخل ہوئیں تو بیٹے اور پوتے کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا ۔۔۔ ''خدا خیر کرے ۔۔۔۔'' ۔ ''جس گھر میں اس قبیل کے حرامی بستے ہوں' وہاں خیریت کیونکر ہو سکتی ہے ۔۔۔''

زندگی میں پہلی بار بیٹے کے منہ سے گالی وہ بھی کسی غیر کے لیے نہیں' ان کے اپنے پوتے کے لیے' بیگم نواب مرزا حشمت بیگ کے حواس گم کرنے کے لیے کافی تھی۔"میاں۔۔۔۔! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔۔۔۔!" صورت حال کی نزاکت کو سنبھالنے کی کوشش میں بیگم نواب مرزا حشمت بیگ کی زبان سے جملے اٹک اٹک کر ادا ہو رہے تھے۔"میں نے آپ سے عرض کیا ہے نا۔۔۔۔!" زچ ہو کر دانت پیستے ہوئے"جس گھر میں اس طرح کے حرام خور موجود ہوں۔۔۔۔وہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔۔۔۔کچھ بھی۔۔۔۔!

بیگم نواب مرزا حشمت بیگ صورت حال کو قابو کرنے کی بابت ذہن یکسو کرنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ ان کے سر پر پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ ہتھوڑا آن پڑا۔"دوسروں کو حرامی کہنے والے' اصل میں خود حرامی ہوا کرتے ہیں۔۔۔۔!

قبل اس کے بیٹے کے ہاتھوں باپ کا گریبان تار تار ہو۔قبل اس کے باپ کے ہاتھوں بیٹے کی جان کو لالے پڑیں' قبل اس کے اخلاق' تہذیب' شائستگی اور برداشت کو نواب خاندان سے ہمیشہ کے لیے دیس نکالا دیا جائے۔گھر کے سارے ملازمین جو اب تک سراسیمہ ہو کر کونوں کھدروں میں چھپے ہوئے تھے۔نواب مرزا فراست بیگ کو پکڑ کر زبردستی گھر سے باہر لے گئے۔بیگم نواب مرزا حشمت بیگ اور ان کے صاحبزادے نواب مرزا شوکت بیگ صدمے کی حالت میں گم سم کھڑے اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔

چند لمحوں بعد حواس بحال ہوئے اور بیگم نواب مرزا حشمت بیگ نے آگے بڑھ کر بیٹے کو سینے سے لگا کر پیار کیا تو نواب مرزا شوکت بیگ جیسا پختہ عمر اور پختہ کار شخص' بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔والدہ نے ایک ہاتھ سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بیٹے کو دوسری کرسی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر نواب مرزا شوکت بیگ زندگی میں پہلی بار' چھکڑا مار کر ماں کی گود میں سر رکھ کر زمین پر بیٹھ گئے۔روتے بھی جاتے تھے اور بار بار یہ جملہ دہرائے جاتے تھے۔۔۔۔

"حرامی۔۔۔۔آخر کو۔۔۔۔حرامی نکلا۔۔۔۔"

بیٹے کے منہ سے بار بار اس طرح کے نازیبا الفاظ سن کر بیگم نواب مرزا شوکت بیگ آبدیدہ ہو گئیں۔ان کی آنکھوں سے بیٹے کی پیروی میں ساون بھادوں کی جھڑی ٹپ ٹپ برسنے لگی۔بیگم نواب مرزا حشمت بیگ ایک سرد گرم چشیدہ خاتون تھیں۔بڑے سے بڑے طوفان بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے تھے۔مگر بیٹے کی کیفیت دیکھ کر ان کے لیے خود پر ضبط رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔

چند لمحے جذبات کے تلاطم میں ڈبکیاں کھانے کے بعد انھوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے ایک ہاتھ سے باریک باری سر کا دوپٹہ اور عینک درست کی اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے بیٹے کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے آہستگی سے صرف اتنا کہا"نا بیٹا۔۔۔۔نا۔۔۔۔اس طرح نہیں کہتے۔۔۔۔!" آواز کی رفتار کو جانچنے کی کوشش میں بیگم نواب مرزا حشمت بیگ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کچھ توقف کے بعد دل و دماغ کو یکسو کرتے ہوئے پھر سے گویا ہوئیں۔

"کائنات میں پیدا ہونے والے تمام ناجائز بچے۔۔۔۔ایک سے نہیں ہوتے۔۔۔۔کچھ۔۔۔۔کچھ تو۔۔۔۔کبھی کبھی۔۔۔۔!" نواب مرزا شوکت بیگ چونک کر ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور والدہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے صبری سے' جملہ مکمل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔۔۔۔بیگم نواب مرزا شوکت بیگ کی زبان ہزار کوشش کے باوجود ادھورا جملہ مکمل کرنے پر قادر نہ تھی۔۔۔۔نواب مرزا شوکت بیگ اک ٹک والدہ کی ساکت آنکھوں میں۔۔۔۔ان کے نامکمل جملے کا بقیہ حصہ تلاش کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔۔۔۔!!!

بقیہ شور

پڑ دی جاتی ہے،،وہ سہمتی، ڈھانپے ہوئے سر کو مزید ڈھانپتی، یوں جیسے سچ مچ کوئی آیا ہو، وہ اٹھتی اور چاپ کے پیچھے ہو لیتی۔۔ذرا خوف نہیں آتا اسے، چاپ تمام گھر گھومتی، وہ بھی ساتھ، اور پھر ڈیوڑھی میں دروازے کے پاس خاموش ہو جاتی اور وہ ڈیوڑھی سے یوں واپس لوٹتی جیسے کسی مہمان کو رخصت کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد چند دن نڈھالی میں گزر جاتے۔ بیٹا پوچھتا تو بات ٹال جاتی، کیا بتاتی اسے، کون آتا ہے کون آیا ہے۔

پچھلے وقتوں میں بھی اس نے ایک دکھ اٹھایا تھا جب پرانا گھر مسمار کیا جا رہا تھا اور اس کی جگہ نیا گھر بنا تھا، اسوقت بھی اسے لگا تھا جیسے پرانے گھر کی اینٹیں نہیں اس کے اعضا بکھر رہے ہوں۔ نیا گھر بن گیا، پرانی چیزیں کھسکنے لگیں، نئی آنے لگیں، وہ اس وقت بھی خاموش رہی، کھٹکنے والا کھٹک رہا تھا، اپنی خواہش کی تکمیل ہوتے دیکھ کر ایک آسودگی اس کے چہرے پر آ کر رک گئی تھی۔ کتنی بار اس کی خاموشی سے آواز ابھری تھی'"اس تردد کی کیا ضرورت تھی، زندگی میں سکون ہو تو جھونپڑی بھی محل ہوتی ہے" لیکن اب، اب یہ بات اس کی برداشت سے باہر ہو چلی تھی، یہ پرانی چیزیں کون لایا تھا، وہ جو اس گھر کا مالک تھا، اب بھی ہے پھر اس کا خیال اسے پاؤں چلنے لگا۔ سب کچھ نظروں میں گھوم گیا، دل بھر آیا تو اس نے بیٹے کو آواز دی۔ بہو اور بیٹا لپکے۔

تمہارے گھر میں سب چیزیں نئی ہیں! اس نے دونوں کے چہرے دیکھے دونوں کھل اٹھے تھے، تازہ گلاب کی طرح۔۔

جی اماں!

لیکن اب بھی تمہارے گھر میں ایک پرانی چیز موجود ہے، اس کا کیا کرو گے! لہجہ سوالیہ تھا۔ اس کے اندر ایک شور برپا تھا۔ ایک پرانی چیز! دونوں نے گردن گھما کر ایک دوسرے کو دیکھا، چہرے اتر گئے، یوں جیسے بڑی اماں کا سوال بھنورا بن کر تازہ گلاب کا رس چوس گیا ہو۔

ہاں۔۔۔تقریباً ستر سال پرانی۔

خوابیدہ نسلیں

سُرورانبالوی (راولپنڈی)

تعجب کیا جو اپنے گھر میں بھی مہمان لگتے ہیں　　ہم اپنے آپ کو خود بے سروسامان لگتے ہیں
یہ خوابیدہ نسلیں سنگیں چٹانوں سے جو لپٹی ہیں　　مجھے گزرے زمانوں کے یہ سب اِنسان لگتے ہیں
یہاں سنگِ ملامت بھی اور حرفِ ندامت بھی　　یہ شہر بے اماں ہے ہر قدم بہتان لگتے ہیں
نہ بچے مُسکراتے ہیں نہ پنچھی چہچہاتے ہیں　　مجھے تو بستیوں سے کوچ کے سامان لگتے ہیں
مدارِ زیست کی ہم کونسی منزل پہ آ پہنچے　　کہ اب تو صُورتِ پیکاں ترے احسان لگتے ہیں
جنونِ شوق تو اُن گھاٹیوں سے بھی گزر جائے　　خطا عقل وخرد کے جس جگہ اوسان لگتے ہیں
کسی کی بددُعا ہے یا کسی آسیب کا سایہ　　مکیں ہوتے ہوئے بھی اب تو گھر سُنسان لگتے ہیں
سرُورانبالوی اُن سے ہی دل میں روشنی ہوگی　　کہ جن کے در کے مہروماں بھی دربان لگتے ہیں

○

ملک زادہ جاوید (نوئیڈا بھارت)

کسی سے پیار اور الفت نہیں ہے　　ہمیں اپنے سے ہی فرصت نہیں ہے
ترے آنسو کو جو کردے ستارہ　　ہر اک جذبے میں وہ طاقت نہیں ہے
ہوا محسوس اُسکو دفن کر کے　　سروں پہ اب ہمارے چھت نہیں ہے
مرے بچے ہیں کتنے نیک سیرت　　وراثت میں بھی کوئی لت نہیں ہے
سبھی آزاد ہیں میرے وطن میں　　اصولوں کی یہاں قیمت نہیں ہے
پلٹ کر آئیں گے سارے پرندے　　کہ اب موسم میں وہ شدت نہیں ہے
بہت ہے سادگی جاوید گھر میں　　نمائش کے لئے دولت نہیں ہے

○

پروفیسر زُہیر کنجاہی (راولپنڈی)

پڑا ہوں گھر کے کونے میں کسی مجبور کی صورت　　غریب و بےنوا ہوں آج اِک محصور کی صورت
خُدایا! مُجھ کو بھی بے درد لوگوں سے رہائی دے　　مَیں پابندِ سلاسل ہوں وہی مقہور کی صورت
منافق لوگ مجھ کو راستی سے باز رکھتے ہیں　　مگر ایمان ہے میرا سرمدؒ و منصورؒ کی صورت
اگر محرومیوں نے پست کر ڈالا تو کیا غم ہے　　کہ پھر اِک بار اُبھروں گا مَیں اوجِ طور کی صورت
یہی ہے جُرم میرا مُجرم سے پرہیز کرتا ہوں　　اگر چہ ہے مری اوقات اِک مزدور کی صورت
غریبوں کی حکومت اے زُہیر آئی نہ آئے گی　　نہ ہو ہلکان رورو کر کسی مجبور کی صورت

○

ربّ نواز مائل (کویت)

کہانی میں ہر موڑ پر کچھ یوں تھا پھر — جو اُنت اُس کا سب راستوں سے رہا پھر
یہاں حُسنِ تخلیق ہے سب اِسی سے — کہ کچھ تازہ آیا کہ کچھ کم' بنا پھر
تری آنکھیں کب سے وہی کہہ رہی ہیں — وہ جس سے کہ ناتا جُڑے پیار کا پھر
تو کیا آفتاب ایسے بھی ڈوبتے ہیں — کہ پچ کتنا تھا نُور میں اور وہ گیا پھر

○

پرویز مظفر (برمنگھم)

پہچان بنانے میں لگے رہتے ہیں — لوگ ایوان بنانے میں لگے رہتے ہیں
ہم نے تجھ کو ہی تراشا عمر بھر — تجھے میری جان بنانے میں لگے رہتے ہیں
ان کو پرواہ نہیں کوئی مرے یا کہ جیئے — خود کو ذی شان بنانے میں لگے رہتے ہیں
ہم کو تنہائی جو ڈستی ہے تو دیواروں پہ — آنکھ اور کان بنانے میں لگے رہتے ہیں
اُن کو انسانوں سے نسبت ہی نہیں ہے پرویزؔ — اور انسان بنانے میں لگے رہتے ہیں

○

کرشن پرویزؔ (روپڑ، بھارت)

جب نہ بیٹا گھر تھا آیا دیر تک — ماں نے گھر بھر کو جگایا دیر تک
سچا پکا ہے یہ قدرت کا اصول — دھوپ رہتی ہے نہ سایہ دیر تک
رازِ دل آنکھوں نے اُن سے کہہ دیا — ہم نے اشکوں کو چھپایا دیر تک
ایک مدت ہو گئی ان کو گئے — دل نہ اُن کو بھول پایا دیر تک
زیست میں جب بھی بڑھیں تاریکیاں — ہم نے اپنا دل جلایا دیر تک
چڑھتی ڈھلتی دھوپ کی مانند ہے — کب کہاں ٹھہری ہے مایا دیر تک
وہ نہیں پرویزؔ آئے تھے مگر — دل کا آنگن تھا سجایا دیر تک

○

سیّدانور جاوید ہاشمی (کراچی)

خدا کے فضل سے جو زندگی گزار دی ہے
بہ صد شعور و بہ صد آگہی گزار دی ہے

کسی کو دولتِ دنیا کسی کو غم بخشے
ہمارے سامنے سے شاعری گزار دی ہے

نیا ہزاریہ لے کر پرانا سال گیا
جسے گزارنا تھا ہاں وہی گزار دی ہے

وہ اور ہوں گے جنھیں وقت کا پتا نہ چلے
یہاں تو ہم نے میاں اِک صدی گزار دی ہے

یہ دل چٹان کی صورت تو آنکھیں صحرا تھیں
کرم یہ کم نہیں اُس نے ندی گزار دی ہے

○

سعید رحمانی (کٹک بھارت)

اپنے حصے میں فقط سنگ و خزف ہوتے ہیں
زخم کھانا ہے جنھیں میری طرف ہوتے ہیں

اپنی حق بات پہ پڑتی ہے جبینوں پہ شکن
اپنے سینے ہی مظالم کے ہدف ہوتے ہیں

جن کی کرتے ہیں پذیرائی سرِ بزم یہاں
ان کی تنقید کے ہم لوگ ہدف ہوتے ہیں

سچ کے مقتل میں کھڑا دیکھ کے دل والوں کو
منحرف لوگ بھی پھر شاملِ صف ہوتے ہیں

تم مری غزلوں کے باطن میں اتر کے دیکھو
ان کی گہرائی میں معنی کے صدف ہوتے ہیں

جن کی صحبت سے شرف ملتا ہے ذرے کو سعیدؔ
کتنے پاکیزہ وہ اصحابِ کہف ہوتے ہیں

○

فیصل عظیم (کنیڈا)

کہاں وہ حسنِ مضطرب کہاں یہ دید کی ہوس
نہ اپنا حلقۂ نگار کار گر، نہ دل قفس

وہ سر سے لے کے پاؤں تک چھلک گیا قدم قدم
یہاں وہ تشنگی، وہ جام ٹوٹتے رہے، کہ بس!

کہاں کہاں سے میں نظر کے جال پھینکتا رہا
کہاں وہ شعلۂ جواں! کہاں یہ دامِ خاک و خس

کوئی بھی نام ہو ترا، کوئی بھی روپ ہو ترا
ہے رنگِ حسن ایک ہی، نظر نظر، نفس نفس

مجھے بتا وہ راز بھی کہ حسن و عشق ایک ہوں
جو تو ہے آتشِ نظر تو آئینہ مری ہوس

تو بادلِ شباب رنگ، میرا امتحاں نہ بن
بہت ہوئی گرج چمک، بس اب تو ٹوٹ کر برس

○

حصیر نوری (کراچی)

اس درجہ غم زدہ تھا کہ خوشیوں سے ڈر گیا
کہنا تھا جو وہ ذہن سے میرے اتر گیا

دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہ تھا
نادان بن کے جانے وہ کیسے گزر گیا

آیا تھا تیرے در پہ میں اپنی تلاش میں
خود سے ملے بغیر ہی میں اپنے گھر گیا

کیوں التوا میں رکھا ہے کوئی تو کچھ کہے
ہمدردیاں خریدنے والا کدھر گیا

غم اوڑھ کر بھی میں رہا دائم مگر وہ شخص
خوشیوں کے سارے رنگ پہن کر بکھر گیا

وہ کیا چراغ کوئی جلائے گا دوستو
جو آپ اپنے دل کے اندھیروں سے بھر گیا

وہ اہلِ دل ہے آج بھی زندہ مگر حصیر
راہِ وفا میں جان سے اپنی گزر گیا

○

شاہد عزیز (آرے بہار بھارت)

بے نام ان خلاؤں میں کوئی خلا بھی ہے
گم نام ان صداؤں میں کوئی ملا بھی ہے

ویسے تو سارے بحر و بر ایک کر دیئے
لیکن جزیرہ کو یہاں لاپتہ بھی ہے

میں جانتا ہوں وقت مرے ساتھ ہے ابھی
لیکن وہ میرے نام شاید خفا بھی ہے

اس دشت بے کراں میں کسے ڈھونڈتے ہو تم
بے نام و بے نشاں کوئی دوسرا بھی ہے

میرے ہی آس پاس وہ رہتا ہے ہر گھڑی
شاہد ہمارے ساتھ کوئی گم شدہ بھی ہے

○

صابر عظیم آبادی (کراچی)

راستہ خود ہی بنانا ہے مجھے
کام کچھ کر کے دکھانا ہے مجھے

راہ مت روکئے جانا ہے مجھے
اپنے وعدے کو نبھانا ہے مجھے

ظلمتِ شب کو مٹانے کے لیے
اک دیا اور جلانا ہے مجھے

بند باندھا ہے اسی مقصد سے
شہر والوں کو بچانا ہے مجھے

بے ہنر لوگوں کو آدابِ ہنر
وقت سے پہلے سکھانا ہے مجھے

غنچۂ درد ذرا اور چٹک
تیری خوشبو میں نہانا ہے مجھے

اس نئی نسل کو ہر قیمت پہ
نیک رستوں پہ چلانا ہے مجھے

پیار کا دے کے کھلونا صابر
روتے بچوں کو ہنسانا ہے مجھے

○

عذرا پروین (لکھنؤ بھارت)

مشتری کر کے سنہرا نہیں ہونے دیتا
عشق ہو جاؤں تو زہرہ نہیں ہونے دیتا

باغ تو دور وہ صحرا نہیں ہونے دیتا
مجھ پہ اک رنگ وہ گہرا نہیں ہونے دیتا

اسکی موسیقی کی چادر سے جو باہر نکلوں
اندھا کر دیتا ہے بہرہ نہیں ہونے دیتا

ریت کا ڈھیر تو کر دیتا ہے گا ہے گا ہے
میرا ساحر مجھے صحرا نہیں ہونے دیتا

اپنے آگے وہ مکمل نہیں کرتا مجھکو
جسم ہی رکھتا ہے چہرہ نہیں ہونے دیتا

اسکی مرضی وہ مجھے مارے یا زندہ رکھے
یہ یقیں مجھ میں اندھیرا نہیں ہونے دیتا

○

ڈاکٹر شاہد رحمٰن (فیصل آباد)

رابطہ قائم رہے تو اچھا رہتا ہے
ورنہ ہر اک رشتہ کچا رہتا ہے

بھولی بسری یاد کوئی جب آجائے
کئی دنوں تک موسم بھیگا رہتا ہے

ایک تو اُس کی باتیں ذرا انوکھی ہیں
دوسرے وہ کچھ الجھا الجھا رہتا ہے

صحراؤں میں پیاس سلگتی رہتی ہے
وہ بادل دریا پہ برستا رہتا ہے

پیار محبت اور وفا کے جذبوں کا
ہر دور میں سودا ہوتا رہتا ہے

کبھی کبھی تو مجھ کو ایسا لگتا ہے
میرے ساتھ کوئی مجھ ایسا رہتا ہے

کرنے کو کچھ کام ابھی بھی باقی ہیں
وقت ہے کہ تیز گزرتا رہتا ہے

مجھ پر اُس کا یہ احسان کافی ہے
کبھی کبھی وہ آکر ملتا رہتا ہے

○

ڈاکٹر جواز جعفری (لاہور)

جونہی اک آگ سی روشن ہوئی پڑاؤ کے ساتھ
مری کہانی بھی کو دے اٹھی الاؤ کے ساتھ

اے شہر چارہ گراں! دردمند ہیں ترے لوگ
کہ جی رہے ہیں سبھی اپنے اپنے گھاؤ کے ساتھ

نشے میں جھومتے دریا' تجھے خبر بھی ہے؟
کہ کتنے شہر تھے جو کٹ گئے کٹاؤ کے ساتھ

نظر شناس! کبھی تو نے یہ بھی دیکھا ہے؟
میں تجھ کو تکتا ہوں کیوں اسقدر لگاؤ کے ساتھ

کبھی نہ آئے مرے نخلِ اختیار پہ پھول
سو کارِ حرف کیا عمر بھر دباؤ کے ساتھ

خلاء کے بحر میں بیڑے ہیں کہکشاؤں کے
رواں دواں ہیں کہیں ہم بھی اس بہاؤ کے ساتھ

وہ کل ملا تھا سرِ راہ' ایک عمر کے بعد
مگر ملا کسی انجانے رکھ رکھاؤ کے ساتھ

جواز جعفری ہم کس نگر میں آ پہنچے
ہر ایک آنکھ ہمیں دیکھتی ہے تاؤ کے ساتھ

○

شہاب صفدر (ڈیرہ اسمٰعیل خان)

(والدِ مرحوم کی یاد میں)

تم کوچ کرو جان مری جاتی رہے گی
تا عمر گھڑی ہجر کی تڑپاتی رہے گی

تُو نوکِ زباں ہو گا بہر دم کسی عنواں
ہر سانس کہانی تری دہراتی رہے گی

رشتہ ہی کچھ ایسا ہے دوبارہ سرِ منظر
تو آئے نہ آئے تری یاد آتی رہے گی

بچے کی طرح دوڑوں گا روتا ترے پیچھے
دنیا مجھے اسباب سے بہلاتی رہے گی

لپٹائے گا اب کون مجھے چھاتی سے اپنی
اس غم سے شربار مری چھاتی رہے گی

سرِ دُھنتا رہوں گا میں ہر اک گیت کی دُھن پر
خلقت ترے ایثار کے گُن گاتی رہے گی

مجھ کو ہے سجانا ترے خوابوں سے نشیمن
بجلی تو فلک پر یونہی لہراتی رہے گی

دُوری سہی مجھ کو ہے یقیں زیست کی رہ پر
دمسازی کی آواز تری آتی رہے گی

آنکھیں چمک اُٹھتی تھیں جسے پا کے وہ تصویر
افسوس شہابؔ آنکھ دُھندلاتی رہے گی

مہندر پرتاپ چاندؔ (انبالہ، بھارت)

گئے دِنوں کی رفاقت میں کس طرح بھولوں؟
شکستِ ربط کا الزام کس کے سر پہ دھروں؟

تمام دن رہے احساس بے بسی کا مجھے
تمام رات جدائی کے خواب دیکھا کروں!

بس ایک شاخِ شجر خشک ڈال ہوں اب تو
تری نگاہ جو پڑ جائے پھر سے جی اُٹھوں!

یہ اور بات کہ اب تم کو یہ قبول نہیں
تمہیں نے چاہا تھا تا عمر ساتھ ساتھ رہوں

جو حق تھا تجھ پہ میرا وقت نے وہ چھین لیا
گلہ جو تجھ سے کروں اب تو کس بنا پہ کروں؟

متاعِ زیست ہیں یہ بے ثمر تمنائیں
یہی بجا ہے انہیں کو گلے لگا کے جیوں

تمہارے جتنے مصائب ہیں، میرے نام لکھو
میں اپنی ساری دعائیں تمہارے نام کروں

بھرے جہاں میں جو میرا ہی انتخاب کیا
تری نظر کو نہ کیوں بار بار سجدہ کروں؟

ذرا بھی جس میں ہو رحم و کرم کی آمیزش
کبھی نہ چاندؔ! میں ایسی عطا قبول کروں

لیاقت علی عاصم (کراچی)

دور افتادہ چمن سے تری خوشبو آئی
یاد آئی کہ وطن سے تری خوشبو آئی

ہر نفس تازہ ہوئی روحِ مسافت مجھ میں
ہر قدم اپنی تھکن سے تری خوشبو آئی

رات کے آخری لمحے میں ترے رنگ بجھے
صبح کی پہلی کرن سے تری خوشبو آئی

شاخ تھی یا تری پازیب ہوا میں رقصاں
غنچہ چٹکا تھا کہ چھن سے تری خوشبو آئی

طائرِ بوسۂ لب نے وہ بھری دل میں اُڑان
دیر تک کُنجِ دہن سے تری خوشبو آئی

آرزو نے عجب انداز سے بستر کھولا
رات ایک ایک شکن سے تری خوشبو آئی

دائم آباد یہ کیفیت احساسِ بہار
خار تو خار چبھن سے تری خوشبو آئی

عبداللہ سلیم (لاہور)

جس حال میں ہوں فرقت ہی تو ہے فرقت ہی فقط انجام نہیں
ہر شام کی آخر صبح ہوتی بے صبح تو کوئی شام نہیں

جینے کے فسانے رہنے دو، جینا ہی انوکھا کام نہیں
مرنا بھی اہم ہو جاتا ہے لیکن یہ مذاق عام نہیں

پیتا ہی رہا پیتا ہی رہے پینے کا سلیقہ کیا جانے
وہ رند کہ جس کے ہاتھوں میں پندارِ خودی کا جام نہیں

مرتا ہوں کہ دنیا والوں کو جینے کا سلیقہ آ جائے
اے دل والو کچھ تم ہی کہو کیا میری تمنا خام نہیں!

جی ہاتھ سے جاتا ہے جائے، اے کاش ابھی وہ آ جائیں
یہ حالت بھی کیا حالت ہے جی بھی ہے مگر آرام نہیں

فرقت کی فسردہ مجلسیں ہوں یا وصل کی رنگیں شامیں ہوں
دل ہے کہ تڑپتا رہتا ہے اس دل کو کہیں آرام نہیں

اک تیرے بچھڑنے سے تنہا کچھ میں ہی نہیں ہوں آشفتہ
وہ رنگِ جبیں صبح نہیں وہ نکہتِ زلف شام نہیں

کھلتی ہوں مسرت کی کلیاں، جلتے ہوں چراغ امیدوں کے
وہ صبح ہماری صبح نہیں وہ شام ہماری شام نہیں

''کل صبح سہی کل شام سہی'' وعدہ ہے سلیم انوکھا سا
جب شام ہوئی تو صبح نہیں جب صبح ہوئی تو شام نہیں

○

شارق عدیل (انجا بھارت)

اتر رہا تھا سمندر سراب کے اندر
بچھڑ کے خود سے ملا جب میں خواب کے اندر

رگیں کھنچیں تو بدن خواب کی طرح ٹوٹا
خلا کا زعم بھرا تھا حباب کے اندر

عجب جنون مری انگلیوں میں جاگا ہے
کہ خون ڈھونڈ رہی ہیں گلاب کے اندر

میں ماہ و سال کے کب تک حساب لکھتا رہوں
اسیر پوری صدی ہے عذاب کے اندر

حریف چہرے پہ تھو کے جلال اتر جائے
عجب تھی بوئے انا بوتراب کے اندر

نظر کو فیض ملا تو لبوں پہ مہر لگی
فرات یوں بھی ملی ہے سراب کے اندر

○

رعنا پروین (اسلام آباد)

حریمِ دل سے کوئی ستارا اتر کے جانے کدھر گیا ہے
گزرتے لمحوں خیال کرنا اشارا کوئی وہ کر گیا ہے

کرو گے جیسا ملے گا ویسا کہاوتیں ہیں بڑی پرانی
میری گلی سے کوئی سیانا یہ بات کہہ کر گزر گیا ہے

نہ جاؤ صورت پہ آئینے کی نظر کا دھوکا بہت بُرا ہے
بس اسکو چاہو جو خامشی سے دلوں کے اندر اتر گیا ہے

ازل سے رشتہ ہے آسماں سے وہیں سے آئے ہیں سب جہاں میں
فلک سے آئی ندا بھی جس کو وہ چھوڑ کر سب ادھر گیا ہے

یہ رشتے ناطے ہیں کچے دھاگے محبتوں کے کہا میں نہیں ہیں
جو بڑھ کے تارِ نظر کو چھو لے وہ چاہتوں سے نکھر گیا ہے

خزاں رسیدہ اداس جھونکو گزر کے آئے ہو کس چمن سے
کہ ڈھونڈنے کو پرانی خوشبو نجانے دل کس نگر گیا ہے

غالب ثنائی

ڈاکٹر سید تقی عابدی (غالب کی نعتیہ غزل کا اجمالی تجزیہ)

غالب کے فارسی دیوان میں شامل یہ (9) شعر کی نعتیہ غزل پر بہت کچھ لکھے جانے کے باوجود ابھی گفتگو کی گنجائش باقی ہے۔ یہ سچ ہے کہ دریا کے شیریں پانی کو پورے طور پر سمیٹا تو نہیں جا سکتا لیکن ہر صاحبِ فکر اپنی ہمت اور قدرت کی تشنگی کے مطابق اس کو اپنے ظرف میں اتنا تو کھینچ سکتا ہے کہ اُس کی پیاس بجھ سکے۔

غالب کا نعتیہ کلام اُردو دیوان میں فارسی کلام کی نسبت اتنا کم رنگ ہے کہ اس پر بے رنگ ہونے کا گمان ہوتا ہے جب کہ فارسی دیوان میں نعتیہ مضامین کے مختلف موضوعات پر رنگ برنگ نقش نظر آتے ہیں۔ شاید اسی لیے غالب نے کہا تھا =

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہای رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اُردو کے بے رنگِ من است

اُردو میں لے دے کے غالب کے پاس ایک آدھ نعتیہ شعر ملتا ہے پھر بھی اس ایک نعتیہ شعر میں جو مقطع کا شعر ہے نعتیہ موضوعات رحمت' شفاعت' معراج' بخشش یقین کے ساتھ ساتھ شاعرانہ تعلی کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے

اُس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

غالب کے فارسی کلام میں نعتیہ اشعار کی تعداد لگ بھگ ساڑھے چھ سو اشعار ہے جو سات نعتوں معراج ناموں اور ایک نعتیہ غزل پر مشتمل ہے۔ ہم اس تحریر میں صرف نعتیہ غزل کو ہی اپنا محورِ سخن بنائیں گے اگر چہ ہم نے غالب کے نعتیہ کلام پر تفصیلی ریویو اپنی زیرِ طبع کتاب = غالب عاشقِ محمد ﷺ و آلِ محمد ﷺ میں کیا ہے۔ اس مضمون میں پہلے ہر شعر کا لفظی مفہوم اور معنوی ترجمہ ہوگا پھر ہر شعر کے ادبی محاسن کے علاوہ تخیل کی گہرائی اور گیرائی کے نادر نکات بیان کیے جائیں گے جو غالب کا خاص فن ہے۔ شعر شاعر کی علمیت' قوتِ تخیل اور قدرتِ فن کا مظہر ہوتا ہے۔ غالب کی نعتوں سے ان کی قرآن اور احادیث سے آگاہی اسلامی تاریخ اور اسلامی فلسفہ سے آشنائی اور فارسی شاعری پر مہارت ظاہر ہوتی ہے۔ غالب نے بھی دوسرے عمدہ نعت گو شعرا کی طرح نعت گوئی میں "باخدا دیوانہ باش و با محمد ﷺ ہوشیار" کی روش اختیار کی یہی نہیں بلکہ تخیل کی گہرائی میں دقیق بینی اور حرمت شعاری کے ساتھ عبد و معبودیت کے فرق کو مبہم نہیں کیا کیوں کہ عرفی شیرازی کا شعر نہ صرف ان کی نظروں کے سامنے تھا بلکہ ان کی فکر یا انچ کا نقیب بھی رہا۔ ع

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

غالب کی یہ نو (9) شعر کی غزل مردف ہے اور اس کی ردیف "محمد ست" ہے۔ اگر چہ اس نورانی ردیف سے مصرعہ میں غضب کا اجالا پیدا ہو گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس اجالے میں عمدہ مضامین کو ڈھونڈ لینے اس لئے ہر شاعر کے بس کی بات نہیں کہ اس روشنی سے عقل اور فکر کی آنکھیں مند ہو جاتی ہیں۔ اس غزل کا ایک حسن یہ بھی ہے کہ اس میں دس (10) قافیے ہیں اور کسی قافیہ کی تکرار نہیں اگر چہ قافیہ پیمائی ذوق کا پسندیدہ مشغلہ تھا اور غالب نے کبھی اس راستہ کو نہیں اپنایا اور قافیے سے شعر نہیں بنایا بلکہ اُن کے شعر میں قافیے نے خود اپنی جگہ بنائی جو ان کے کمالِ فن کی دلیل ہے۔ اس غزل میں آٹھ بار اللہ تعالیٰ کے ناموں میں پانچ بار حق اور ایک ایک بار کردگار' یزداں اور ذات پاک استعمال ہوا جو مصرعوں اور مضمون کی رعایت سے رکھا گیا۔

شعر (1) حق جلوہ گر ز طرز بیان محمد ست
آرے کلامِ حق بزبانِ محمد ست

ترجمہ) حق ظاہر ہوا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے انداز بیان سے ہاں حق کا کلام محمد ﷺ کی زبان سے جاری ہوا۔

تشریح و محاسن) خدا کی معرفت اور دینِ اسلام حضرت محمد ﷺ کی گفتگو ہی سے ظاہر ہوئے اور بے شک قرآن کریم اور احادیث قدسی کو ہم نے محمد ﷺ کی زبان ہی سے سنا۔ مصرعہ اول میں ترکیب 'طرز بیان" غالب کا منفرد 'طرز بیان" ہے اور یہی پورے شعر کی جان بھی ہے۔ مسلمانوں سے ہٹ کر قریش کے کفار اور مکہ و مدینہ کے مشرکین بھی اس بات کے قائل تھے کہ پیغمبر اکرم ﷺ سچے' صادق اور امین تھے۔ ان کی زبان سے کبھی غلط یا جھوٹ بیان ادا نہ ہوا۔ یہی محمد ﷺ کے لہجہ کا اثر بھی تھا کہ جو شخص بھی انھیں سنتا تھا وہ دل سے ان کی صداقت کا قائل ہو جاتا اسی لیے قرآن کریم اور احادیث قدسی کو جب لوگوں نے آپ کی زبان مبارک سے سنا تو بلا کسی تامل اور شک کے فوراً قبول کیا اور ان کو من و عن محفوظ کیا۔

مختصر الفاظ میں اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے خدا کو دینِ خدا کو اور کلامِ خدا کو محمد ﷺ کے ذریعہ سے پہچانا۔ غالب نے اس شعر میں سورہ النجم کی آیت تین اور چار سے استفادہ کیا کہ اور نہ اپنی خواہش سے منہ سے بات نکالتے ہیں یہ تو حکم خدا کہتے ہیں جو بھیجا جاتا ہے۔ اس شعر میں صنعت مراعات النظیر کی دو مثالیں ہیں یعنی بیان' زبان' اور کلام کو ایک جگہ جمع کیا گیا ہے جو ایک دوسرے سے مناسبت رکھتے ہیں۔ حق' کلامِ حق اور محمد ﷺ کو بھی ایک ہی جگہ نظم کیا گیا ہے۔ اس شعر میں صنعت تلمیح ہے جس میں حق سے مراد ہوا لحق حق تعالیٰ اور کلامِ حق سے مراد قرآن مجید ہے۔ پورا شعر صنعت تعلیق میں ہے صنعت مسجع متوازی میں دونوں قافیے "بیان اور زبان" ہیں جو ہم وزن ہم عدد اور حروف روی میں برابر ہیں۔

شعر (2) آئینہ دار پرتو مہر ست ماہتاب
شانِ حق آشکار ز شانِ محمد ست

ترجمہ) جس طرح چاند سورج کی روشنی کا مظہر (آئینہ دار) ہے اُسی طرح خدا کی شان بھی محمد ﷺ کی شان سے ظاہر ہوتی ہے

تشریح و محاسن) جیسا ہم سب جانتے ہیں چاند کا اُجالا سورج کی روشنی کی بدولت ہے یعنی رات کے وقت ہم جو روشن چاند کو دیکھتے ہیں اُس کی روشنی اُسے چھپے ہوئے سورج کی بدولت ہے جسے ہم دیکھ نہیں پاتے۔ چاند سورج کی روشنی کا آئینہ ہے اِسی طرح سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ خدا کی شان و شوکت کے مظہر ہیں۔ ہم نے محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان اور عظمت میں اللہ تعالیٰ کی شان و شوکت کی جھلک دیکھی ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر یہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان اور منزلت ہے جس کی وجہ سے ہم اللہ تعالیٰ کی شان و شوکت کو محسوس کر سکے۔ اس شعر کی ادبی خوبی یہ ہے کہ اس میں خوب صورت تشبیہ کی بنیاد پر پورا شعر تعمیر کیا گیا ہے۔ ذات اقدس کو سورج جس کی روشنی اور گرمی ذاتی ہے اور ذات محمدی مرتبت ﷺ کو چاند جس کی روشنی اکتسابی ہے پیش کیا گیا ہے۔ اس شعر میں غالب نے کم از کم تین قرآنی آیات جو آنحضرت ﷺ کی شان میں نازل ہوئیں ہیں اس کی روشنی کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں روشنی نور اور رسالت آپ سے منسوب ہیں۔ سورہ الاحزاب آیت 45 اور 46 جس کا ترجمہ ہے اے نبی ﷺ ہم نے آپ کو گواہ بنا کر خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا آپ خدا کے حکم سے خدا کی طرف بلانے والے چمکتے چراغ ہو۔ سورہ المائدہ کی پندرھویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور روشن کتاب آئی۔ سورہ النساء کی آیت (174) میں ارشاد ہوتا ہے۔ اے لوگو بے شک اللہ کی جانب سے تمہاری طرف روشن دلیل اور روشن نور آیا۔ صنعت مراعات النظیر میں مہر (سورج) ماہتاب (چودھویں کا چاند) پرتو (عکس) آئینہ شامل ہیں۔ صنعت لف و نشر مرتب بھی اس شعر میں موجود ہیں۔ مہر اور ماہتاب مصرعہ اول اور اسی ترتیب سے ہیں جس طرح سے حق تعالیٰ اور محمد ﷺ مصرعہ ثانی ہیں۔ صنعت تکرار میں شان کی تکرار نے شعر کی غنایت، روانی، شگفتگی کے علاوہ اس کے معیار کو بلند کر دیا ہے۔ یہ شعر بھی صنعت تعلیل میں ہے جس میں پہلے مصرعہ کی محکم دلیل نے دوسرے مصرعہ کو معتبر بنا دیا یعنی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان بھی بلند اور ارفع اِس لئے رہی کہ اللہ جل شانہٗ ہے۔ یہ شعر بھی نعتیہ مضمون کا عالی شعر ہے جو بہت سادہ ہوتے ہوئے بھی گہرے مطالب کا ترجمان ہے

شعر(3) تیر قضا ہر آینہ در ترکش حق ست
اما کشاد آں ز کمان محمد ست

ترجمہ) تقدیر کا تیر بے شک حق تعالیٰ کے ترکش میں ہے لیکن وہ محمد ﷺ کی کمان ہی سے چھوٹتا ہے

تشریح و محاسن) بے شک کاتب تقدیر حق تعالیٰ ہی ہے لیکن تقدیر پر عمل حضرت محمد ﷺ کے وسیلے سے ہوتا ہے یعنی بگڑی ہوئی تقدیریں حضور ﷺ کے دست مبارک ہی سے بن جاتی ہیں۔ یعنی حضور ﷺ کی رضا مندی حق تعالیٰ کی رضا مندی ہے۔ اس شعر میں غالب نے دو قرآنی آیات کے مطالب نظم کیے ہیں۔'' جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ (سورہ الفتح آیت 10) جو خاک آپ نے پھینکی وہ آپ نے نہ پھینکی وہ اللہ نے پھینکی (سورہ الانفال آیت 17) یہ شعر مطلب اور بیان کے لحاظ سے عمدہ ترین شعر ہے اور یہ سہل ممتنع میں شمار ہو سکتا ہے۔ تیر قضا، ترکش حق اور کمان محمد ﷺ عمدہ اور نادر ترکیبیں ہیں۔ یہ شعر بلاغت کے لحاظ سے کم ترین الفاظ میں کثیر معنی کا نقیب ہے چناں چہ اس طرز بیان سے غالب کے مصرعہ کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور اس شعر میں صنعت مراعات النظیر کے تحت تیر، ترکش اور کمان آتے ہیں۔

شعر(4) دانی اگر بمعنی لولاک وا رسی
خود ہر چہ حق ست از ان محمد ست

ترجمہ) اگر تو لولاک کے معنی سمجھ لے تو تجھے معلوم ہوگا جو کچھ خدا کا ہے وہ سب محمد ﷺ ہی کا ہے

تشریح و محاسن) اگر تو حدیث قدسی ''لولاک لما خلقت الافلاک" کے معنی جان لے (اے محمد ﷺ اگر تم نہ ہوتے تو میں کائنات کو پیدا نہ کرتا) یعنی یہ کائنات کے باعث تخلیق محمد ﷺ ہیں۔ پھر تجھ کو معلوم ہو جائے گا کہ خدا کی اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ سب محمد ﷺ ہی کے طفیل سے ہے مصرعہ اول میں صنعت تلمیح اور تضمین ہے لولاک سے مراد حدیث قدسی لولاک ہے۔ اس میں صنعت تعلیل ہے یعنی حضور ﷺ کے صدقے میں کائنات بنی ہے تو یقیناً جو کچھ کائنات میں ہے وہ سب محمد ﷺ کی وجہ سے ہے یہ شعر بھی نعت کے کلیدی موضوعاتی مضامین میں شامل ہے

شعر(5) ہر کس قسم بدانچہ عزیز ست می خورد
سوگند کردگار بجان محمد ست

ترجمہ) ہر کوئی اُس کی قسم کھاتا ہے جو اُسے پیارا ہوتا ہے اِسی لیے خدا تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی جان کی قسم کھائی ہے۔

تشریح و محاسن) غالب نے یک عقلی اور منطقی معروضہ اور تجربہ پیش کیا ہے کہ ہر شخص اپنی بات معتبر ثابت کرنے کے لیے اپنی پسندیدہ چیز کی قسم کھاتا ہے اِسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے زیادہ محبوب بندے حضرت محمد ﷺ کی جان کی قسم کھائی ہے۔ غالب کے اس شعر کا مرکزی نقطہ محبت اور حب ہے جو نعت کے موضوعات کا بھی مرکزی نقطہ ہے۔ یہاں غالب سورہ الحجر کی آیت (72) کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ (ترجمہ) آپ کی جان کی قسم بے شک یہ لوگ اپنے نشہ میں بہک رہے ہیں۔ اس شعر میں محاورہ ''قسم می خورد'' کے استعمال نے شعریت میں اضافہ کیا ہے یہ شعر صنعت تضمین میں بھی ہے۔

شعر(6) واعظ حدیث سایہ طوبیٰ فروگذار
کاین جا سخن ز سرو روان محمد ست

ترجمہ) اے واعظ طوبیٰ کے سایہ کی بات چھوڑ دے کیوں کہ اب یہاں

حضرت محمد ﷺ کے سرو رواں کا ذکر ہو رہا ہے

تشریح و محاسن) طوبیٰ جنت کا وہ بلند درخت ہے جس کے سایہ میں جنتی رہیں گے۔ غالب نے اس مضمون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ اے واعظ یہ طوبیٰ کی لن ترانی کو چھوڑ دے اب ہمیں طوبیٰ کے سایہ کی ضرورت اس لئے نہیں کہ اب ہمارے درمیان سرو محمد مصطفیٰ ﷺ بلند قامت موجود ہے جس کا سایہ رحمت طوبیٰ سے زیادہ آرام بخش ہے اب ہم رحمت العالمین کے سایہ میں رہیں گے۔ یہاں یہ بھی ابہام ہے کہ حضور ﷺ کی ذات اقدس اور بلند مرتبت شخصیت کا سایا دنیا اور آخرت دونوں جگہ ہے۔ غالب نے اس شعر میں صنعت تلمیح یعنی سایا طوبیٰ سے شعر میں رنگ بھرا ہے اس میں صنعت تقابل اور صنعت استتباع بھی موجود ہیں۔ طوبیٰ چونکہ بلند ترین بہشتی درخت ہے اس کی نسبت سرو قد حضور ﷺ سے دی گئی ہے جس میں صنعت رجوع کا پہلو ہے صنعت مراعات النظیر میں طوبیٰ' سایہ' سرو' کے ساتھ واعظ' حدیث اور سخن نظر آتے ہیں۔ ان صنعتوں کے علاوہ اس میں صنعت مبالغہ کا عنصر بھی موجود ہے۔ اگرچہ غالب صنعت گر نہیں لیکن لاشعوری طور پر یہ صنعتیں ان کے کلام میں اس قدر زیادہ تعداد میں نظر آتی ہیں جس کی وجہ غالب کی زبان پر مہارت اور ضائع اور بدائع سے واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔

شعر(7) بنگر دو نیمہ گشتن ماہ تمام را

کاں نیمہ جنبشی ز بنان محمدست

ترجمہ) تو ذرا پورے چاند کو دو ٹکڑے ہوا دیکھ جو حضور ﷺ کی انگلیوں کے اک معمولی اشارے کا نتیجہ ہے

تشریح و محاسن) غالب نے معجزہ شق القمر کو بیان کرنے میں صناعی سے کام لیا ہے یعنی یہاں قدرت مصطفیٰ ﷺ کا دکھانا مقصود ہے جن کی انگلی کی معمولی حرکت سے چاند کے دو ٹکڑے ہوئے تھے۔ غالب ایک عظیم شاعر ہے اور ان کا فن ہر لفظ کی مصرعہ میں نشست سے ظاہر ہے۔ مشہور ہے کہ بڑا شاعر ہر چھوٹے لفظ کو بھی بڑے اہتمام سے ایسے مخصوص مقام پر جڑ دیتا ہے جیسے جوہری نگینہ کو۔ اس شعر میں چاند کی نسبت سے لفظ ''بنگر'' (دیکھ) رکھا ہے اس کے علاوہ اس شعر میں نادر اور اچھوتا قافیہ ''بنان'' بھی عظمت فن کی دلیل ہے۔ یہ شعر صنعت تلمیح میں ہے جہاں معجزہ شق القمر کا ذکر ہے۔ صنعت اشتقاق میں دو نیمہ اور نیمہ جنبشی شامل ہیں۔

شعر(8) ور خود ز نقش مہر نبوت سخن رود

آں نیز نامور ز نشان محمدست

ترجمہ) اگر مہر نبوت (جو حضور ﷺ کی پشت پر پیدائشی نشان تھا) کی بات ہو تو یہ جاننا چاہیے کہ وہ حضور ﷺ کی نسبت سے ارفع اور معتبر ہوئی۔

تشریح و محاسن) مہر نبوت کا اعتبار اور اس کی وقعت حضور ﷺ کے جسم اقدس کی نسبت سے ہی ہے۔ یہ شعر صنعت تلمیح میں ہے۔ اس شعر کی اصل خوبصورتی صنعت ایہام ہے۔ یہاں مہر کے معنی وہ دفتری مہر بھی لی جا سکتی ہے جو منصب دار یا عہدہ دار استعمال کرتے ہیں چنانچہ منصب نبوت کی مہر یا نبوت کو حضور ﷺ کی ذات سے زینت ملی نہ کہ نبوت سے حضور ﷺ کو۔ یعنی انبیاؤں میں حضور ﷺ سا عظیم المرتبت نبی پیدا نہ ہوا۔ اس شعر میں نقش' نشان' مہر' صنعت مراعات النظیر میں ہے۔

شعر(9) غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم

کاں ذات پاک مرتبہ دان محمدست

ترجمہ) غالب نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ثنا کو حق تعالیٰ پر چھوڑ دیا اس لیے کہ وہ صرف محمد ﷺ کے مقام اور مرتبہ سے واقف ہے۔ یہ غالب کی معروف مقطعوں میں شمار ہوتا ہے اس شعر میں شاعر کے عجز و انکسار کے ساتھ حضور ﷺ کی بلند قامت کا ذکر بھی ہے جس کا احاطہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ بقول جامی

لا یمکن الثنا کما کان حقہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(بعض لوگوں نے غلطی سے اس شعر کو مولوی عبدالعزیز محدث دہلوی کا شعر لکھا ہے یہ شعر ان کی بیاض کے منتخب اشعار میں شامل ہے لیکن ان کا نہیں) غالب کے مقطع کی طرح عجز و انکساری کے مضمون کو اردو اور فارسی کے شعرا نے نت نئے طریقوں سے باندھا ہے۔ جیسا کہ فخر الدین گرگانی نے لکھا کہ میں اس لئے نعت کہہ سکا کہ اس میں میری مدد حق تعالیٰ نے کی۔

کنون گویم ثناہائے پیمبر ﷺ

کہ یار است سوئے یزداں ست راہبر

یا نظیری کہتا ہے

نعت مصطفیٰ ﷺ نامیست تمام

کز یں معنی بہ یزداں ختم کلام

غالب کے اس مضمون کو تین سو سال قبل سعد اللہ پانی پتی نے یوں باندھا

خدا نعت محمد ﷺ داند و بس

نیا ید کار یزداں از دگر کس

اخیر میں ہم یہ کہتے ہیں کہ غالب کی نعت کی ایک انفرادی کیفیت یہ بھی ہے کہ اس کے تمام تر اشعار نعت کے کلیدی موضوعات اور مرکزی اہمیت کے مضامین رکھتے ہیں۔ یہاں ثانوی مضامین یعنی سراپا' فراق مدینہ' مطالب دینوی کا ذکر نہیں۔ تمام تر نعتیہ غزل میں حضور ﷺ کی تجلیل اور تعریف کر کے بڑے ہی خوبصورت انداز میں اس وظیفہ عشق کو حق تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کی مدح اور ثنا تو صرف وہی کر سکتا ہے جو ان کے مرتبہ اور مقام سے آگاہ ہے۔

خواجہ ہمام تبریزی نے سچ کہا ہے۔

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب

ہنوز نام تو بردن کمال بے ادبی است

حنیف نجمی (چھتیس گڑھ بھارت)

سمجھ کر سوچ کر نقشہ بنانا چاہیے تھا ۔۔۔ یہ گھر جیسا ہے کیا ایسا بنانا چاہیے تھا
میں چلتا ہوں تو سر لگتا ہے میرا آسماں سے ۔۔۔ اسے تھوڑا سا اور اونچا بنانا چاہیے تھا
بجھانی تھی اگر سچ مچ ہماری پیاس اس کو ۔۔۔ تو عالم سب کا سب دریا بنانا چاہیے تھا
جسے دیکھو اتر جاتا ہے پار آناً فاناً ۔۔۔ وہ دریا ہے تو کچھ گہرا بنانا چاہیے تھا
بنا سکتے نہ تھے خود کو اگر ان کی طرح ہم ۔۔۔ تو ان کو اپنے ہی جیسا بنانا چاہیے تھا
مصور تیری فن کاری پہ میں قربان لیکن ۔۔۔ میں جیسا ہوں مجھے ویسا بنانا چاہیے تھا
اسے دیکھا تھا جب پہلے پہل تم نے تو نجمی ۔۔۔ کوئی مصرع تو برجستہ بنانا چاہیے تھا

○

طالب انصاری (دہ کینٹ)

بجز وہم و گماں کچھ بھی نہیں ہے ۔۔۔ حقیقت میں یہاں کچھ بھی نہیں ہے
تری میری حکایت کے علاوہ ۔۔۔ درونِ داستاں کچھ بھی نہیں ہے
مری پرواز کی وسعت کے آگے ۔۔۔ محیطِ آسماں کچھ بھی نہیں ہے
انا دیوار کی صورت ہے ورنہ ۔۔۔ ہمارے درمیاں کچھ بھی نہیں ہے
مری ویرانیاں دیکھو تو سمجھو ۔۔۔ کہ دشتِ بے کراں کچھ بھی نہیں ہے
چراغوں کو بجھانے کا نتیجہ ۔۔۔ دھواں ہے اور دھواں کچھ بھی نہیں ہے
کئی پردے ہٹانے پر بھی طالب ۔۔۔ نہاں ہے سب عیاں کچھ بھی نہیں ہے

○

سید تحسین گیلانی (بورے والا)

وقت سانسیں پھانک کر پیاسا رہا ۔۔۔ اِس مسافر کا سفر پیاسا رہا!
جب حدودِ جسم سے نکلا تو پھر ۔۔۔ میں سمندر چاٹ کر پیاسا رہا
آسماں نے تشنگی تقسیم کی ! ۔۔۔ بارشوں میں بھی شجر پیاسا رہا
میں نے کتنی خاک کو نگلا مگر ۔۔۔ زندگی کا یہ بھنور پیاسا رہا
اُس نے دی خیرات مجھکو بددُعا ۔۔۔ پھر میں یارو در بدر پیاسا رہا
اِس سکوتِ ذہن میں تشنہ نہ تھا ۔۔۔ خود سے نکلا ۔ تو ۔ اُدھر پیاسا رہا

○

غالب ثنائی

ڈاکٹر سید تقی عابدی (غالب کی نعتیہ غزل کا اجمالی تجزیہ)

غالب کے فارسی دیوان میں شامل یہ (9) شعر کی نعتیہ غزل پر بہت کچھ لکھے جانے کے باوجود ابھی گفتگو کی گنجائش باقی ہے۔ یہ سچ ہے کہ دریا کے شیریں پانی کو پورے طور پر سمیٹا تو نہیں جا سکتا لیکن ہر صاحب فکر اپنی ہمت اور قدرت کی تشنگی کے مطابق اس کو اپنے ظرف میں اتنا تو کھینچ سکتا ہے کہ اس کی پیاس بجھ سکے۔

غالب کا نعتیہ کلام اُردو دیوان میں فارسی کلام کی نسبت اتنا کم رنگ ہے کہ اس پر بے رنگ ہونے کا گمان ہوتا ہے جب کہ فارسی دیوان میں نعتیہ مضامین کے مختلف موضوعات پر رنگ برنگ نقش نظر آتے ہیں۔ شاید اسی لیے غالب نے کہا تھا =

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہای رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اُردو کہ بے رنگ من است

اُردو میں لے دے کے غالب کے پاس ایک آدھ نعتیہ شعر ملتا ہے پھر بھی اس ایک نعتیہ شعر میں جو مقطع کا شعر ہے نعتیہ موضوعات رحمت، شفاعت، معراج، بخشش یقین کے ساتھ ساتھ شاعرانہ تعلّی کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے

اُس کی امامت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

غالب کے فارسی کلام میں نعتیہ اشعار کی تعداد لگ بھگ ساڑے چھ سو اشعار ہے جو سات نعتوں معراج ناموں اور ایک نعتیہ غزل پر مشتمل ہے۔ ہم اس تحریر میں صرف نعتیہ غزل کو ہی اپنا محور سخن بنائیں گے اگرچہ ہم نے غالب کے نعتیہ کلام پر تفصیلی ریویو اپنی زیر طبع کتاب = غالب عاشق محمد ﷺ و آل محمد ﷺ میں کیا ہے۔ اس مضمون میں پہلے ہر شعر کا لفظی مفہوم اور معنوی ترجمہ ہوگا پھر ہر شعر کے ادبی محاسن کے علاوہ تخیل کی گہرائی اور گیرائی کے نادر نکات بیان کئے جائیں گے جو غالب کا خاص فن ہے۔ شعر شاعری علمیت، قوت تخیل اور قدرت فن کا مظہر ہوتا ہے۔ غالب کی نعتوں سے ان کی قرآن اور احادیث سے آگاہی اسلامی تاریخ اور اسلامی فلسفہ سے آشنائی اور فارسی شاعری پر مہارت ظاہر ہوتی ہے۔ غالب نے بھی دوسرے عمدہ نعت گو شعرا کی طرح نعت گوئی میں ''باخدا دیوانہ باش و با محمد ﷺ ہوشیار'' کی روش اختیار کی یہی نہیں بلکہ تخیل کی گہرائی میں دقیق بینی اور حرمت شعاری کے ساتھ عبد و معبودیت کے فرق کو مبہم نہیں کیا کیوں کہ عرفی شیرازی کا شعر نہ صرف ان کی نظروں کے سامنے تھا بلکہ ان کی فکر یا اپج کا نقیب بھی رہا۔ ع

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحر است
آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را

غالب کی یہ نو (9) شعر کی غزل مردف ہے اور اس کی ردیف ''محمد ست'' ہے۔ اگرچہ اس نورانی ردیف سے مصرعہ میں غضب کا اجالا پیدا ہو گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس اجالے میں عمدہ مضامین کو ڈھونڈ لینے اس لئے ہر شاعر کے بس کی بات نہیں کہ اس روشنی سے عقل اور فکر کی آنکھیں مند ہو جاتی ہیں۔ اس غزل کا ایک حسن یہ بھی ہے کہ اس میں دس (10) قافیے ہیں اور کسی قافیہ کی تکرار نہیں اگرچہ قافیہ پیمائی ذوق کا پسندیدہ مشغلہ تھا اور غالب نے بھی اس راستے کو نہیں اپنایا اور قافیے سے شعر نہیں بنایا بلکہ اُن کے شعر میں قافیے نے خود اپنی جگہ بنائی جو ان کے کمال فن کی دلیل ہے۔ اس غزل میں آٹھ بار اللہ تعالیٰ کے ناموں میں پانچ بار حق اور ایک ایک بار کردگار، یزداں اور ذات پاک استعمال ہوا جو مصرعوں اور مضمون کی رعایت سے رکھا گیا۔

شعر (1) حق جلوہ گر ز طرز بیان محمد ست
آرے کلام حق بزبان محمد ست

ترجمہ) حق ظاہر ہوا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے انداز بیان سے ہاں حق کا کلام محمد ﷺ کی زبان سے جاری ہوا۔

تشریح و محاسن) خدا کی معرفت اور دین اسلام حضرت محمد ﷺ کی گفتگو ہی سے ظاہر ہوئے اور بے شک قرآن کریم اور احادیث قدسی کو ہم نے محمد ﷺ کی زبان ہی سے سنا۔ مصرعہ اول میں ترکیب ''طرز بیان'' غالب کا منفرد ''طرز بیان'' ہے اور یہی پورے شعر کی جان بھی ہے۔ مسلمانوں سے ہٹ کر قریش کے کفار اور مکہ و مدینہ کے مشرکین بھی اس بات کے قائل تھے کہ پیغمبر اکرم ﷺ سچے صادق اور امین تھے۔ ان کی زبان سے کبھی غلط یا جھوٹ بیان ادا نہ ہوا۔ یہی محمد ﷺ کے لہجہ کا اثر بھی تھا کہ جو شخص بھی انہیں سنتا تھا وہ دل سے ان کی صداقت کا قائل ہو جاتا اسی لیے قرآن کریم اور احادیث قدسی کو جب لوگوں نے آپ کی زبان مبارک سے سنا تو بلا کسی تامل اور شک کے فوراً قبول کیا اور ان کو من و عن محفوظ کیا۔

مختصر الفاظ میں اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے خدا کو دین خدا کو اور کلام خدا کو محمد ﷺ کے ذریعہ سے پہچانا۔ غالب نے اس شعر میں سورہ النجم کی آیت تین اور چار سے استفادہ کیا کہ ''اور نہ اپنی خواہش سے منہ سے بات نکالتے ہیں یہ تو حکم خدا کہتے ہیں جو بھیجا جاتا ہے۔'' اس شعر میں صنعت مراعات النظیر کی دو مثالیں ہیں یعنی بیان، زبان، اور کلام کو ایک جگہ جمع کیا گیا ہے جو ایک دوسرے سے مناسبت رکھتے ہیں۔ حق، کلام حق اور محمد ﷺ کو بھی ایک ہی جگہ نظم کیا گیا ہے۔ اس شعر میں صنعت تلمیح ہے جس میں حق سے مراد ہو الحق حق تعالیٰ اور کلام حق سے مراد قرآن مجید ہے۔ پورا شعر صنعت تعلیق میں ہے صنعت مسجع متوازی میں دونوں قافیے ''بیان اور زبان'' ہیں جو ہم وزن ہم عدد اور حروف روی میں برابر ہیں۔

شعر (2) آئینہ دار پرتو مہر ست ماہتاب
شان حق آشکار ز شان محمد ست

ترجمہ) جس طرح چاند سورج کی روشنی کا مظہر (آئینہ دار) ہے اُسی طرح خدا کی شان بھی محمد ﷺ کی شان سے ظاہر ہوتی ہے

تشریح و محاسن) جیسا ہم سب جانتے ہیں چاند کا اُجالا سورج کی روشنی کی بدولت ہے یعنی رات کے وقت ہم جو روشن چاند کو دیکھتے ہیں اُس کی روشنی اُسے چھپے ہوئے سورج کی بدولت ہے جسے ہم دیکھ نہیں پاتے۔ چاند سورج کی روشنی کا آئینہ ہے اِسی طرح سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ خدا کی شان و شوکت کے مظہر ہیں۔ ہم نے محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان و عظمت میں اللہ تعالیٰ کی شان و شوکت کی جھلک دیکھی ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر یہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان اور منزلت ہے جس کی وجہ سے ہم اللہ تعالیٰ کی شان و شوکت کو محسوس کر سکے۔ اس شعر کی ادبی خوبی یہ ہے کہ اس میں خوب صورت تشبیہ کی بنیاد پر پورا شعر تعمیر کیا گیا ہے۔ ذات اقدس کو سورج جس کی روشنی اور گرمی ذاتی ہے اور ذات محمد مرتبت ﷺ کو چاند جس کی روشنی اکتسابی ہے پیش کیا گیا ہے۔ اس شعر میں غالب نے کم از کم تین قرآنی آیات جو آنحضرت ﷺ کی شان میں نازل ہوئیں ہیں اس کی روشنی کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں روشنی نور اور رسالت آپ سے منسوب ہیں۔ سورہ الاحزاب آیت 45 اور 46 جس کا ترجمہ ہے۔ اے نبی ﷺ ہم نے آپ کو گواہ بنا کر خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا آپ خدا کے حکم سے خدا کی طرف بلانے والے چمکتے چراغ ہو۔ سورہ المائدہ کی پندرھویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور روشن کتاب آئی۔ سورہ النساء کی آیت (174) میں ارشاد ہوتا ہے۔ اے لوگو بے شک اللہ کی جانب سے تمہاری طرف روشن دلیل اور روشن نور آیا۔ صنعت مراعات النظیر میں مہر (سورج) ماہتاب (چودھویں کا چاند) پرتو ی (عکس) آئینہ شامل ہیں۔ صنعت لف و نشر مرتب بھی اس شعر میں موجود ہیں۔ مہر اور ماہتاب مصرعہ اول اور اسی ترتیب سے ہیں جس طرح سے حق تعالیٰ اور محمد ﷺ مصرعہ ثانی ہیں۔ صنعت تکرار میں شان کی تکرار نے شعر کی غنائیت، روانی، شگفتگی کے علاوہ اس کے معیار کو بلند کر دیا ہے۔ یہ شعر بھی صنعت تعلیل میں ہے جس میں پہلے مصرعہ کی محکم دلیل نے دوسرے مصرعہ کو معتبر بنا دیا یعنی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان بھی بلند اور ارفع اِس لئے رہی کہ اللہ جل شانہٗ ہے۔ یہ شعر بھی نعتیہ مضمون کا عالی شعر ہے جو بہت سادہ ہوتے ہوئے بھی عمیق مطالب کا ترجمان ہے

شعر (3) تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق ست

اما کشاد آں ز کمان محمد ست

ترجمہ) تقدیر کا تیر بے شک حق تعالیٰ کے ترکش میں ہے لیکن وہ محمد ﷺ کی کمان ہی سے چھوٹتا ہے

تشریح و محاسن) بے شک کاتب تقدیر حق تعالیٰ ہی ہے لیکن تقدیر پر عمل حضرت محمد ﷺ کے وسیلے سے ہوتا ہے یعنی بگڑی ہوئی تقدیریں حضور ﷺ کے دستِ مبارک ہی سے بن جاتی ہیں۔ یعنی حضور ﷺ کی رضا مندی حق تعالیٰ کی رضا مندی ہے۔ اس شعر میں غالب نے دو قرآنی آیات کے مطالب نظم کیے ہیں۔ ”جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ (سورہ الفتح آیت 10) جو خاک آپ نے پھینکی وہ آپ نے نہ پھینکی وہ اللہ نے پھینکی (سورہ الانفال آیت 17) یہ شعر مطلب اور بیان کے لحاظ سے عمدہ ترین شعر ہے اور یہ سہل ممتنع میں شمار ہو سکتا ہے۔ تیر قضا، ترکش حق اور کمان محمد ﷺ عمدہ اور نادر ترکیبیں ہیں۔ یہ شعر بلاغت کے لحاظ سے کم ترین الفاظ میں کثیر معنی کا نقیب ہے چناں چہ اس طرز بیان سے غالب کے مصرعہ کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور اس شعر میں صنعت مراعات النظیر کے تحت تیر، ترکش اور کمان آتے ہیں۔

شعر (4) دانی اگر بہ معنی لولاک وا رسی

خود ہر چہ حق ست از اں محمد ست

ترجمہ) اگر تو لولاک کے معنی سمجھ لے تو تجھے معلوم ہوگا جو کچھ خدا کا ہے وہ سب محمد ﷺ ہی کا ہے

تشریح و محاسن) اگر تو حدیث قدسی ”لولاک لما خلقت الافلاک“ کے معنی جان لے (اے محمد ﷺ اگر تم نہ ہوتے تو میں کائنات کو پیدا نہ کرتا) یعنی یہ کائنات کے باعث تخلیق محمد ﷺ ہیں۔ پھر تجھ کو معلوم ہو جائے گا کہ خدا کی اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ سب محمد ﷺ ہی کے طفیل سے ہے مصرعہ اول میں صنعت تلمیح اور تضمین ہے۔ لولاک سے مراد حدیث قدسی لولاک ہے۔ اس میں صنعت تعلیل ہے یعنی حضور ﷺ کے صدقے میں کائنات بنی ہے تو یقیناً جو کچھ کائنات میں ہے وہ سب محمد ﷺ کی وجہ سے ہے۔ یہ شعر بھی نعت کے کلیدی موضوعاتی مضامین میں شامل ہے۔

شعر (5) ہر کس قسم بدانچہ عزیز ست می خورد

سوگند کردگار بجان محمد ست

ترجمہ) ہر کوئی اُس کی قسم کھاتا ہے جو اُسے پیارا ہوتا ہے اِسی لیے خدا تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی جان کی قسم کھائی ہے۔

تشریح و محاسن) غالب نے یک عقلی اور منطقی معروضہ اور تجربہ پیش کیا ہے کہ ہر شخص اپنی بات معتبر ثابت کرنے کے لیے اپنی پسندیدہ چیز کی قسم کھاتا ہے اِسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے زیادہ محبوب بندے حضرت محمد ﷺ کی جان کی قسم کھائی ہے۔ غالب کے اس شعر کا مرکزی نقطہ محبت اور حب ہے جو نعت کے موضوعات کا بھی مرکزی نقطہ ہے۔ یہاں غالب سورہ الحجر کی آیت (72) کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ (ترجمہ) آپ کی جان کی قسم بے شک یہ لوگ اپنے نشہ میں بہک رہے ہیں۔ اس شعر میں محاورہ ”قسم می خورد“ کے استعمال نے شعریت میں اضافہ کیا ہے یہ شعر صنعت تضمین میں بھی ہے۔

شعر (6) واعظ حدیث سایۂ طوبیٰ فرو گذار

کاین جا سخن ز سرو روان محمد ست

ترجمہ) اے واعظ طوبیٰ کے سایہ کی بات چھوڑ دے کیوں کہ اب یہاں

اقبالِ جرم

جمیل احمد عدیل (بورے والا)

تلاشِ تسخیر، کفارہ اور تمنا بے تاب کے بعد محمد سعید شیخ کی پانچویں تصنیف ''اقبالِ جرم'' میں ایک ناولٹ اور چھ افسانے شامل ہیں۔ میری اس مختصر سی تجزیاتی تحریر کا اختصاص صرف ان کے ناولٹ ''اقبالِ جرم'' کے حوالے سے ہے۔

یوسف اس ناولٹ کا مرکزی کردار ہے، جس پر الزام ہے کہ اس نے دیرینہ عداوت کی بنا پر ایک شخص سراج کو قتل کر دیا ہے۔ اس کا جرم چونکہ عدالتوں میں ثابت ہو جاتا ہے لہٰذا اسے سزائے موت ہو جاتی ہے۔ پورا ناولٹ اس مرکزی کردار کے گرد گردش کرتا ہے کہ یوسف اپنے آپ کو بے گناہ یقین کرتا ہے اور وہ دورانِ قید شدید ذہنی اور جسمانی کرب میں مبتلا رہتا ہے لیکن آخری لمحوں میں جب اسے سٹریچر پر ڈال کر پھانسی گھاٹ تک پہنچایا ہوتا ہے تو وہ اپنے ''جرم'' کا اعتراف کر لیتا ہے، یوں اس کے مسمار ہونے والے بدن میں ایک غیر معمولی توانائی کی لہر پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی ذات کے ذروں کو آنِ واحد میں جمع کرتا ہے اور طرفہ العین میں یکسا ہو جاتا ہے۔ پھر بغیر کسی خارجی سہارے کے اپنے قدموں پر خود چل کر پھانسی کے تختے پر جا کھڑا ہوتا ہے۔ اس پورے ناولٹ کا سارا تجسس اس سوال میں پنہاں ہے کہ اگر یوسف نے واقعی سراج کو قتل کیا تھا تو وہ اپنی ذات، محبوبہ، ماں، وکیل، عدالت، جیلر، خدا ـ کسی کے بھی سامنے یہ تسلیم کیوں نہیں کرتا کہ وہ قاتل ہے؟ اور اگر یوسف نے قتل نہیں کیا تھا تو پھر وہ کون سا معجزہ رونما ہوتا ہے کہ موت کے پھندے کو سامنے پا کر یہ اقرار کر لیتا ہے کہ میں قاتل ہوں؟ کیا واقعی یوسف گناہگار تھا؟ محمد سعید شیخ ایک کامیاب فکشن رائٹر ہیں اسلیئے انہوں نے اس بیانیے میں اس سوال کا کہیں سیدھا سادہ جواب نہیں دیا۔ جو کچھ بھی ہے بین السطور ہے۔ وہ بین السطور کیا ہے؟ جی محترم قارئین! اسی بین السطور ایک بڑا ناولٹ، ایک وسیع اور عمیق دریا کی مانند موجزن ہے۔ سوالات، موضوعات، امکانات اور تصورات و نظریات سے لبالب بھرا ہوا دریا۔

''اقبالِ جرم'' کو محض مدرسانہ انداز میں اس کی کرافٹ اور اسلوب کے تناظر میں ڈھلے ڈھلائے نتائج کے ساتھ پیش کر دینا ناانصافی ہوگی۔ میری نظر میں اس ناولٹ کا بڑا پن اس کے سوالات اور موضوعات ہیں۔ سعید صاحب کے الفاظ میں دورانِ مطالعہ مذکورہ ''سوالات میرے دماغ میں صلیبوں کی طرح گڑتے چلے گئے۔'' فی الاصل بڑا سوال ہی بڑے موضوع کو جنم دیتا ہے اور بڑا موضوع ایک رفیع الشان فن پارے کو۔ کیونکہ خالق نے آج تک کسی سائل کے دماغ میں ایسا سوال ہی نہیں ڈالا، جس کا جواب بھی ساتھ ارسال نہ کیا ہو۔ سوال اور جواب ایک ہی لفافے میں ملفوف ہوتے ہیں، بس یہ نظام ہے، سوال پہلے باہر آئے گا، جواب بعد میں۔ جواب کے آنے سے پہلے اور سوال کے بعد کا درمیانی عرصہ اسی دورانیے کی بازیافت تنقید کا منصب ہے۔ میں نقادی اس اعلیٰ تعریف پر شاید پورا نہ اتر سکوں، لیکن ''اقبالِ جرم'' کے مطالعے نے یہ کہانی مجھ سے ازسرِنو تخلیق کروائی ہے۔ اس کہانی کے ہر سیاہ لفظ کے عقب میں سوال کا قمقمہ روشن ہے، میں تو اپنے سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے مکرب عمل میں سے گزرتا رہا ہوں۔ تخلیق نو یا بازآفرینی کی تعذیب میں وہ ڈکھ اپنی جگہ جو قاری کو کردار بنا کر ہر اُس اذیت سے دوچار کرتا ہے، جس میں سے اولاً کردار گزر رہا ہے، ثانیاً لکھاری خود گزر رہا ہے۔ اندرے مرائے کے الفاظ میں ''ناول کسی فرد کی زندگی کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہم اس کو اس طرح جاننے لگتے ہیں کہ جس طرح ہم اپنے آپ کو جانتے ہیں۔'' خود سعید شیخ اس پُرالم کیفیت کا مکمل ادراک رکھتے ہیں۔

''میں جب کسی کردار، واقعہ یا خیال سے متاثر ہوتا ہوں تو اس کی گرفت میں آ جاتا ہوں ــــ میں بے رنگ، بے شناخت، بے چہرہ ہو کر خواب کی حالت میں پہنچ جاتا ہوں۔ مجھ سے اپنا آپ پہچانا نہیں جاتا ــــ کوئی دیکھے تو مجھے اس کی نظروں میں کوئی پہچان نہیں ملتی ــــ پھر میں خود اس کردار میں منتقل ہو جاتا ہوں۔ اس کے دُکھ میرے دُکھ اس کے سُکھ میرے سُکھ بن جاتے ہیں۔ میں اس کی خوشیوں میں ہنستا (اور) اس کے غموں میں روتا ہوں۔ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتا ہوں اور خود ہی اپنا مسیحا بن کر اپنے زخموں کو بھرتا ہوں۔ میرا اور اس کردار کا فرق مٹ جاتا ہے۔

سعید صاحب نے جس فرق کے مٹ جانے کی بات کی ہے اسے بازیچۂ اطفال نہ خیال کیجئے گا۔ موت سعید شیخ کا مرغوب موضوع ہے۔ قاری پر اگر ان کا تخلیق کردہ کردار یا واقعہ طاری ہوتا ہے تو اسے میری طرح جیتے جی ''موتو قبل ان تموتو'' کا قیامت زر منظر اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھنا ہی نہیں پڑے گا بلکہ اس کا حصہ بننا پڑے گا۔ اسلیئے میں تو یہی کہوں گا کمزور دل کے مالک ''اقبالِ جرم'' کی کہانی کو شعلۂ بار بار بارش سے اپنے آئینۂ ابصار کو محفوظ معنوں ہی رکھیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوگا۔

ایک توضیح ناگزیر ہے کہ قاری پُر اسرار، سنسنی خیزی، سراسیمگی اور پُرخوف تجسس تو مہماتی اور جاسوسی ناول بھی طاری کر دیتے ہیں، لیکن ''اقبالِ جرم'' ایک خالص ادبی ناول ہے۔ یہاں جستجو دانشورانہ ہے، یہاں تڑپ صوفیانہ ہے، سوقیانہ نہیں۔ اسلیئے میری نظر میں ''اقبالِ جرم'' ایک صوفی کی لکھی ہوئی طویل حکایت ہے، جس میں اٹھارہ مقامات آتے ہیں، جن میں سے ایک بھی آہ و فغاں سے تہی نہیں۔ ''جرم'' سے شروع ہونے والی یہ کہانی بظاہر ''اقبال'' پر ختم ہو جاتی ہے۔ فی الحقیقت اس قصے کا ''گنہگار'' سے بہت پہلے آغاز ہوتا ہے اور ''اقبال

جرم'' کے بعد اصل کتھا کی ابتدا ہوتی ہے اور میری نگاہ میں یہی وہ دکھائی نہ دینے والی کہانی تھی جس کو بیان کرنے کیلئے سعید شیخ کو پورے دو سو صفحات پر مشتمل اس ناولٹ کا سہارا لینا پڑا ہے۔

انسان کی سرشت میں صدورِ گناہ کی استعداد رکھ کر اسے دنیا میں بھیجا گیا ہے' بلکہ بہ وطرح کے اس سانحے کا ظہور یا انسان کا جنت سے نکل کر دنیا میں آنا اسی گناہ کی توانائی کی بدولت ممکن ہوا اور یہ دنیا میں آنا اور رہنا' یہی تو سزا کا عمل ہے کہ یہ زیست روزِ قیامت ہے' ہر لمحہ گزشتہ لمحے کا حشر ہے اور بندے کا بدن تو صلیب ہے جس پر اس کی سزا یافتہ روح ساری عمر لٹکی رہتی ہے۔ جب آتا کو رہائی کا پروانہ ملتا ہے تو شریر قبر میں جا لیٹتا ہے اور یہ تو انسان کا مقدر ہے کہ وہ جب بھی قبر سے باہر نکلتا ہے اسے ایک قیامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یوسف کو اگر میں ''قیدی انسان'' کی علامت قرار دوں تو یہ جہان زنداں ہی قرار پائے گا' جس میں (ہم میں سے) ہر شخص اپنے اپنے حصے کی سزا کاٹ رہا ہے۔ جنہیں یہ شعور ہے کہ وہ عذاب کے ذائقے چکھ رہے ہیں ان کا دکھ سوا ہے۔ یہ درست ہے کہ یہاں گردشِ مدام سے دل گھبرا جاتے ہیں' لیکن جو ''یوسف'' کی طرح اپنے ''جرم'' کا اقبال کر لیں' ان کی زبان سے بے اختیار یہی ورد ہوتا ہے

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ہے داد

یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

گناہ انسان کی فطرت کا جزو لاینفک ہے' اسی لئے انسان جینے کے جرم میں مرنے کی سزا پاتا ہے۔ پھر بھی وہ (بالعموم) آخری سانس تک خود کو اور ساری دنیا کو یقین دلاتا رہتا ہے کہ وہ سچا ہے' اگر وہ سچا ہے تو پھر وہ تنہا کیوں ہے؟ شاید اسلیئے کہ سچائی تنہائی کا ثمر ہے اور تنہائی سچائی کی سزا۔ اسی ''سزا'' کو اگر عتاب یا عذاب قرار دیا جائے تو نفس کی تربیت اور باطن کی اصلاح کا ہر در امکان بند ہو جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ''اقبالِ جرم'' ایک صوفی کی طویل حکایت ہے' مصنف نے قدم قدم پر باطن کی کجی کو راستی عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں یہاں چند اقتباسات منتقل کرنے پر مجبور ہوں۔ ''فکشن اینڈ دی ریڈنگ پبلک'' کی مصنفہ مسز کیو ڈی لیوس نے بڑی گہری بات کہی تھی کہ ''ناول پر تنقید کرنے والوں کے ساتھ زبردست مشکل یہ ہے کہ وہ ایک باب کو بھی اقتباس کے طور پر پیش نہیں کر سکتے' حالانکہ ناول کے ''آہنگ'' کو پیش کرنے کیلئے ایک دو پیرا گراف قطعی کافی نہیں ہوتے۔''

بایں ہمہ میں ناخن کو گوشت سے جدا کر کے مصنف کے روحانی تجربے سے پھوٹنے والی چند حکمت آموز شعاعوں کو آپ کے سامنے ''مشاہدۂ حق'' کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔

''جب انسان بہت کمزور ہوتا ہے۔ اس کے شعور کی گرفت اس کے حیوانی جذبوں پر بڑی کمزور پڑ جاتی ہے۔ وہ کسی بھی بہانے انسان کے درجے سے گرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ بعض بندوں کو ان لمحات کا علم ہو جاتا ہے وہ خود کو سنبھال لیتے ہیں اور بعض ان کمزور لمحوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ اور وہ وہ کام کر جاتے ہیں جو نارمل حالات میں وہ کبھی نہ کرتے۔ آدمی کی جیت تبھی ہوتی ہے جب وہ اس وقت کی کمزوری سے اپنے آپ کو نکال لے جائے۔''

(ص 23)

''مصنف کے پاس الہام کی روحانی طاقت ہونی چاہیے۔ اس کے اندر سے آواز آنی چاہیے کہ کیا غلط ہے؟ کیا صحیح ہے؟۔۔۔ مصنف کا اندر آئینے کی طرح شفاف اور صاف ہونا چاہیے۔ اسے وہ کچھ نظر آنا چاہیے جو عام آدمی کو نظر نہیں آتا۔۔۔۔'' (ص 90)

سزا و جزا کا قدرت کا اپنا نظام بھی ہے جو ہمارے فہم و فراست سے بالا ہے۔ کوئی پتہ نہیں چلتا کہ جو سزا ہم ایک مجرم کو دے رہے ہیں وہ کس جرم کی ہے؟ یا پھر کسی ایسے جرم کی ہے جہاں تک قانون کی پہنچ نہیں تھی''۔

(ص 101)

''زندگی کی سمجھ اس وقت تک نہیں آ سکتی جب تک انسان کو اپنی ذات کا شعور نہ ہو'' (ص 107)

''دوسری طرف ابھی تک یوسف اپنے گناہ کے احساس میں بھیگ نہیں سکا تھا' کہیں نہ کہیں اس کے دماغ کے کسی حصے میں اپنی بے گناہی کی آڑ باقی تھی جو اسے مکمل طور پر جھکنے سے باز رکھتی تھی۔'' (ص 143)

یہ اقتباسات اپنے سیاق و سباق سے ہٹ کر ممکن ہے آپ کو ''ملفوظات'' کی ایسی مثلاً جلد کے ''اقوالِ زریں'' محسوس ہوئے ہوں' لیکن جب آپ ان عبارتوں کو کہانی کے تسلسل میں دیکھیں گے تو آپ کو یہ اُس کا اُسی طرح حصہ نظر آئیں گی جیسے کرنیں ماہتاب کا حصہ ہوتی ہیں' جیسے خوشبو گلاب کا حصہ ہوتی ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ سعید شیخ کے ہاں صوفیانہ شعور کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان کا ناولٹ ''اقبالِ جرم'' زندگی سے کٹا ہوا ہے یا کسی تصوراتی غیر مرئی یا خیالی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ ''اقبالِ جرم'' اس زوال آمادہ زندگی کی متعدد جہات پر محیط ہے۔ ورجینا وولف کے ناول کی لازمی شرط یہ پیش کی تھی کہ ''ناول کی ساری دنیا مسلسل تبدیل ہوتی نظر آتی ہے لیکن ایک عنصر تمام ناولوں میں مستقل طور پر باقی رہتا ہے یعنی انسان۔ ناول انسانوں کے متعلق لکھے گئے ہیں اسلیئے وہ ہمارے اندر ایسے ہی احساسات ابھارتے ہیں جیسا کہ انسان حقیقی دنیا میں ابھارتے ہیں۔ ناول فن کی وہ واحد ہیئت ہے جس کی واقعیت ہم کو یقین کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یعنی وہ حقیقی انسان کی زندگی کا بھرپور اور صداقت

شعارانہ ریکارڈ پیش کرتا ہے۔" "اقبالِ جرم" بے شک زندگی سے پیوست ایسا فن پارہ ہے جس میں زندگی کی نبض اسی طرح متحرک ہے جیسے جوہرِ حیات سے معمور ایک ذی نفس میں رواں دواں ہوتی ہے۔

ہنری جیمز نے کہا تھا کہ "ناول نگار کا موضوع ناول نگار کی ملکیت ہے اور اس کا پورا حق اُسے ملنا چاہیے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ اس نے اس سے بنایا کیا ہے؟"۔۔۔محمد سعید شیخ نے اپنے موضوع سے مکمل وابستہ رہ کر زندگی سے متعلق اپنے کامل طرزِ احساس کو اکمل انداز میں پیش کر دیا ہے۔ ہماری سوسائٹی کے تضادات پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے طنز کا وار بہت کاری ہے۔

فکشن لکھنے والے کے پاس اگر دراک مشاہدے کا ید بیضا نہیں ہے تو یہ ممکن نہیں کہ وہ تخلیق کا معجزہ دکھا سکے۔ اسی طرح انسانی نفسیات پر ان کی نگاہ غیر معمولی ہے۔ وہ قلبی احساسات ذہنی واردات سے لے کر ماحول و فضا کی تمام اکناف کو اس طرح سے حصار میں لے لیتے ہیں کہ کوئی ضروری تفصیل باقی نہیں رہ جاتی۔ جملہ جزئیات کو سمیٹنے کا ہنر اسے ہی آ سکتا ہے جس نے سالہا سال زندگی، اس کے بطون اور مظاہر پر تفکر کیا ہو۔ بلغاریہ کے افسانہ نگار ایمیلیں سٹائین نے کتنی بڑی حقیقت کو ان الفاظ میں قید کر دیا "ایک مصنف کی دونوں زندگیوں، دونوں سوانح یعنی عامیانہ سوانح اور ذہنی سوانح میں ہم آہنگی ہو تو کہانی (اور بڑی کہانی جیسے قارئین بھی سراہیں اور نقاد بھی) جنم لیتی ہے"۔ اقبالِ جرم کے خالق محمد سعید شیخ زندگی کے جس شعبے کے ساتھ متعلق ہیں ظاہر ہے اس بڑے فن پارے کی تخلیق میں ان کے گرد و پیش نے ان کی بڑی معاونت کی ہے۔ پولیس کے رویے، جیل کی انتظامیہ کا طریق کار، عدالتوں میں ہونے والی بے عدالتیاں، دیہاتی زندگی کی ہر اعتبار سے مکمل مرقع نگاری، مٹی سے رشتہ، جنسی تجربے کی پیچیدگیاں، معاصر سیاسی صورتحال، محسوس کی گھٹن قدروں کا انہدام، رشتوں کی معتوبیت۔۔۔ غرض "اقبالِ جرم" ہر طرف سے حیات سے بندھا ہوا ناولٹ ہے اور یہ بندھن اتنا مضبوط ہے کہ انہوں نے خلیل جبران کی طرح کسی جگہ یہ نعرہ بلند نہیں کیا۔

"قانون۔ قانون کیا چیز ہے؟ کس نے اسے دیکھا ہے؟ کس نے اسے آسمان کی بلندیوں سے آفتاب کی شعاعوں کے ساتھ اترتے دیکھا ہے؟ اور کس انسان نے مشیت ایزدی کو انسانی قلب سے متنفّر پایا ہے؟ اور کس زمانے میں فرشتوں نے انسان سے آ کر کہا کہ کمزوروں کو نورِ زندگی سے محروم کر دو بے حیثیتوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دو اور خطا کاروں کا آہنی پاؤں سے روند ڈالو؟"

معذرت کے ساتھ یہ فکشن کی زبان نہیں۔ نہ فکشن اس طرح کے واعظانہ ٹریٹ منٹ کا متحمل ہو سکتا ہے۔ ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ دولتمند ہمیشہ برا اور غریب سدا اچھا ہو گا۔ قانون امیر و غریب، سب کیلئے مساوی ہوتا ہے۔ ہمارا جذبہ ترحم کہتا ہے۔ وہ نادار پر ترس کھائے اور تونگر کو سولی پر لٹکا دے۔ قاتل کو قتل کرنا ظلم نہیں، عدل ہے۔ لیکن جبران معترض ہے "ایک آدمی نے دوسرے کو قتل کر دیا تو وہ قاتل ٹھہرا لیکن جب امیر نے قاتل کو قتل کروا دیا تو امیر عادل سمجھا گیا۔"

دنیا کا کوئی سماج "امیر" کو یہ حق سونپے بغیر جی نہیں سکتا۔ اسی حق کو ہم "قانون" سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ قانون اگر اوپر سے نہ بھی نازل ہوا ہو، تب بھی اتنا ہی محترم ہے جتنا اوپر سے آنے والا کوئی بھی حکم مکرم ہو سکتا ہے۔ ہاں اس کا غلط استعمال معاشرتی ناہمواری کا ضرور سبب بنتا ہے اور "اقبالِ جرم" میں سعید شیخ نے اسی پہلو کو ہدفِ تنقید بنایا ہے، لیکن ادیب کی حیثیت سے نہ کہ ایک مصلح کے مقام پر خود کو فائز کر کے انہوں نے تبلیغ کو اپنا شعار بنایا ہے۔

کافکا نے بڑا عمدہ اصول وضع کیا ہے "کہ آپ ناول کے ذریعے جو چاہے کر سکتے ہیں۔ زندگی کے کسی بھی گوشے میں جھانک سکتے ہیں۔ دنیا کے فکر کے کسی بھی شعبہ کی چھان بین کر سکتے ہیں لیکن بحیثیت مصنف کے آپ کسی بھی مقصد کا پروپیگنڈہ نہیں کر سکتے۔"

ایک معیاری فن پارے سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ وعظ و تلقین سے منزہ ہو، لیکن اثرات وہی مرتب کرے جو ایک صادق رشد و ہدایت سے وجود میں لاتا ہے۔ ہم فن تخلیق کاروں کو مشورہ دینے میں بڑی عجلت سے کام لیتے ہیں کہ کبھی اپنے ادب کو براہ راست ہونے اور پند و نصائح سے بچاؤ۔ لیکن ایک تخلیق کار ہونے کے ناطے مجھے خوب خبر ہے کہ یہ کتنا کٹھن کام ہے۔ اتنی بڑی قربانی دینا پڑتی ہے جس کا تصور بھی عام آدمی نہیں کر سکتا، اپنے بچے کو ذبح کرنے سے بھی بڑی اذیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن جب اس انداز میں بات کہی آ جائے جتنا ضمیر سے لبریز ہو اور نصیحتوں اور نعروں سے پاک ہو، پھر کوئی ادبی تخلیق جلدی سے نظر میں بھی نہیں جچتی۔ ہر طرف مٹی کا ایک محترم ڈھیر ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس مرض سے چونکہ اس عاجز نے بھی کچھ حصہ پایا ہے، اسلیئے مشاعروں کی شاعری سے لیکر صحافتی ادب اور صحافتی ادب سے لیکر سیاسی بیانات اور سیاسی بیانات سے لیکر ڈائجسٹی ادب اور ڈائجسٹی ادب سے لیکر میڈیا پر پیش کیا جانے والا مواد۔۔۔ ان سب میں مجھے سر مو قطعاً کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ جہاں مخاطب عوام ہوں معیار عوام ہوں وہاں سطح لازماً عوامی ہو گی۔

اس تناظر میں "اقبالِ جرم" کا مطالعہ میرے لیے ایک غیر عوامی ناولٹ کا مطالعہ ثابت ہوا ہے۔ سعید شیخ نے کس موضوع کو مس نہیں کیا؟ اس مختصر سے ناول میں زندگی کا ایک موج زن قلزم مقید ہے۔ فکشن کیلئے کوئی موضوع شجر ممنوعہ نہیں۔ بس یہ ہے کہ اس کا بیان مختلف ہو۔ خالص تخلیقی ہو۔ جیسے آکوپنکچر کی لمبی سوئی بھی مریض کے بدن میں ماہر ڈاکٹر اتار دیتا ہے اور مریض کو پتہ تک نہیں چلنے دیتا۔ چیر پھاڑ جراحت میں چل جاتی ہے ادب میں نہیں چل سکتی۔

۔باقی خاک زاد میں۔

خاک زاد

غالب عرفان (کراچی)

علیم صبا نویدی ہمارے عہد کے وہ زندہ اور متحرک تخلیق کار ہیں جن کی علمی و ادبی خدمات سے نہ صرف تامل ناڈو جیسا جنوبی ہند کا غیر اردو داں طبقہ فیضیاب ہے بلکہ اردو کی وہ نئی بستیاں جہاں اردو بولی، سمجھی، پڑھی اور لکھی جا رہی ہے۔ اور بتدریج نشر و اشاعت کی زبان بن گئی ہے' کافی حد متعارف ہو چکا ہے یوں تو انہوں نے شاعری اور نثر دونوں کو اپنی ذات کے اظہار کے لئے فراوانی سے استعمال کیا ہے لیکن جس علمی خانوادے سے ان کا تعلق ہے اس کا موروثی اثر فطری طور پر ان کی دین سے رغبت کی طرف منتج ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ ادھر گذشتہ چند سالوں سے میری نظر میں ان کی وہ تخلیقات کتابوں کی صورت میں گھوم رہی ہیں جن سے ان کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری کا والہانہ پن مترشح ہو رہا ہے مثلاً ابھی ایک سال قبل ان کا ایک گراں قدر کام ''نعتیہ شاعری میں نئے تجربے'' جب ایک کتاب کی صورت میرے مطالعے کا حصہ بنا تو مجھے حیرت انگیز مسرت کا احساس ایک مدت تک اپنی گرفت میں لئے رہا نہ صرف یہ کہ اس کتاب کے لئے انھوں نے مواد کن دقتوں کے بعد حاصل کیا بلکہ مختلف ہیتوں میں کہی گئی نعتوں میں کیسے کیسے مباحث اٹھائے اور کس طرح کن زاویوں سے ان نعتوں کو پرکھا یہ الگ تفصیل طلب بات رہی اور بات چھڑی تو بہت دور تک چلی جائے گی لہذا اسے رہنے دیجئے اس وقت میں ان کی تازہ ترین نعتیہ تخلیق ''خاک زاد'' پر چند جملے لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

یہ نظم دراصل ان کے تین تین مصروں پر محیط ایک ایک بند پر مشتمل ہے اور ہر ایک بند ایک ہی بحر اور ایک ہی وزن کا تسلسل ہے جسے انہوں ثلاثیات کا نام دیا ہے مکمل 186 بندوں پر پھیلی ہوئی ہے لیکن آخری چار صفحات پر 12 ثلاثیات جدید لہجہ راجعون کے عنوان سے موجود ہیں۔

نعت کے متعلق میرا تو یہ ایمان ہے کہ حب رسول کی غیر موجودگی میں دل تو اس کا نزول ہی نہیں ہو سکتا ہے پھر اگر زبردستی الفاظ سے کھلواڑ کی جائے تو لاشعور سے شعور تک اور شعور سے لب و لہجے تک اور اس کے بعد صفحہ قرطاس پر اس کے بکھرنے کا کام مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ یہی نہیں کہ سیرت کا مطالعہ اور قرآن فہمی اس سلسلے میں مدد و معاون ثابت ہوتا بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جن کی نعت ہوتی ہے وہی کہلوا بھی دیتے ہیں علیم صبا نویدی کی اس نظم میں مصرعے بولتے ہیں الفاظ سفر کرتے ہیں اور لہجہ تخاطب کرتا ہوا قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ کار بکثرت، کہنہ مشقی، قادر الکلامی اور موزوئی طبع کسے کہتے ہیں؟ جب جذبات میں ابال آتا ہے تو بے ساختگی کے لئے حرف کی تلاش نہیں ہوتی بلکہ شاعر کے اندر کا آدمی اس کے شعور میں موجود مطالعے سے فیض اٹھاتا ہے اور الفاظ شعر کا پیکر تراشتے ہیں یہ باتیں تو حقیقی شاعری کے اجزائے ترکیب کی ہیں لیکن اگر کوئی تخلیق کار حب رسول سے سرشار ہو کر قلم کو حرکت دیتا ہے تو ایک غیبی قوت اس کی حامی و ناصر بن کر اس سے ایسا کلام کہلواتی ہے جسے ترتیب دینے کے بعد پڑھ کر سب سے پہلے خود شاعر ہی حیرت زدہ رہ جاتا ہے چہ جائیکہ قاری! دل و دماغ کو منور کر دینے والے چند ایسے ہی بند علیم صبا نویدی کے ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔

آسمانوں کے بھید کا جوہر
سات عالم کے نور کا ماخذ
رونق کائنات کا مصدر

صبح اتری ہے ٹہنیوں سے ابھی
ٹوٹ کر جائے گی تھکن شب کی
اپنے آنگن کی کھول دو کھڑکی

سوچ میں گم ہیں منبر و محراب
ہے مؤذن نہ پیش امام کہیں
مندروں میں ہے مسجدوں کا خواب

مندروں میں مسجدوں کا خواب دکھلایا دکھلانا آج کی بات نہیں بلکہ جب سے اسلام برصغیر میں آیا ہے یہ کہانی ہر دور میں دہرائی گئی لیکن کس نے اب سے پہلے شعر کے پیکر میں ڈھال کر یہ تلخ حقیقت اجاگر کی ہے یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو اپنے عہد' اپنے کلچر' اپنی تاریخ کے ساتھ اپنی تہذیب کی پرکھ رکھتا ہو اور بدلتے ہوئے اقدار کے ساتھ ذہن میں پیدا ہونے والی فکر انفرادی اور فکر اجتماعی کی ارتقائی منزلوں کا باریک بینی سے جائزہ لے رہا ہو ''خاک زاد'' کی شاعری صرف عشق نبی ﷺ سے لبریز دل کی شاعری نہیں بلکہ او بہ ارتقا سفر کرتی ہوئی انسانی تاریخ اور جدید ایجادات سے مدد لیتی ہوئی انسانی سوچ کی دیدہ وری کے تانے بانے بھی بکھیرتی ہے ایک طویل نعتیہ نظم کے اندر شاعر کا انداز بیان کہاں کہاں کس کس عصری تناظر میں کس طرح جھولتا ہے اور پھر موتیوں کی ایک لڑی کی طرح مربوط محسوس ہوتا دکھائی دیتا ہے ذرا ان ثلاثیوں میں دیکھئے۔

شب کے ہاتھوں میں لاش سورج کی
دن کی باہوں میں چاندنی کا قتل
وقت کو فکر اپنی سج دھج کی

وقت غارت گر فروشوق
جسم گاہیں اسیر جلوۂ شب
صبح کی حد میں نیم بسمل ذوق

وقت غارت گر فروشوق ہے
جسم گاہیں اسیر جلوۂ شب
صبح کی حد میں نیم بسمل ذوق

شرافت لباس تک محدود
اجلے پن میں ہے تیرگی پنہاں
دور تک کھوکھلے بدن کی نمود

نعت گوئی دراصل عقیدت کا ایسا سفر ہے جس کی مسافت کبھی ختم نہیں ہوتی کیونکہ یہ کائنات کی اس ہستی کی مدح کا سلسلہ ہے جو ابد تک کے لئے راہ نجات بن کر دنیا میں ظہور پذیر ہوئی تھی میرے یہ کہنے کا مطلب دراصل یہ ہے

کر نعت گو شاعر جوں جوں اپنی عقیدت کے سفر میں آگے بڑھتا ہے اُسے لفظ و معنی کی نئی تفہیم عطا ہوتی ہے پھر والہانہ پن عود کر آتا ہے اور نئی مہمیز اسے اپنے سفر کی نئی منزلوں سے آشنا کرواتی ہے شاید ایسی ہی مسافتوں کے لئے میں نے کبھی یہ شعر کہا تھا۔

مسافتوں میں کہیں بھی کوئی پڑاؤ نہ تھا
سفر کی دھوپ کو دستار کر لیا میں نے

(غالب عرفان)

اس طویل نظم میں شاعر نے جگہ جگہ بے حس معاشرے کا تجزیہ اشاروں، کنایوں میں بھی کچھ اس طرح کیا ہے کہ بے ساختہ داد نکل جاتی ہے

دیکھیں چھ گئیں بھلائی کو　　الجھنوں کے بھنور کی گہرائی
چند عقیدوں میں بٹ گئی دنیا　　اس قدر نا پنے سے کیا حاصل
بوجھ سا لگ گیا خدائی کو　　ذہن جب ہو گئی ہے سچائی

اپنے منفرد انداز بیان کے ساتھ ''خاک زاد'' دراصل ایک خاک زاد کی عقیدت کا سفر نہیں بلکہ وہ وسیلہ ظفر ہے جو حضور ﷺ کی روحِ اقدس کے مقابل سر جھکائے اپنی حیرتوں کی تشنگی کچھ یوں پیش کر رہا ہے۔

جن کا مسکن ہے آسمانوں پر
اب انہیں ڈھونڈنے سے کیا حاصل

''خاک زاد'' میں کچھ ایسی تثلیثات بھی آپ کو متوجہ کریں گی جو ہیں تو اظہار کی سادگی کی مثال لیکن اس سادگی میں پُرکاری کے وہ جتن بھی کئے گئے ہیں جن سے آپ صرفِ نظر نہیں کر سکتے یہ دو بند ملاحظہ کیجئے۔

نیند ہے نعمت خداوندی　　زندگی ہے ٹہین ذروں میں
رات آ جاگا و کیف و سکوں　　آخری رات کتنی لمبی ہے
دن ہے آئینہ صحت مندی　　کوئی رشتہ نہیں ہے جسموں میں

مجموعی طور پر تین تین مصرعوں میں ایک موضوع اور ہر موضوع میں الگ تخلیق کائنات سے لے کر ذکرِ معراج تک کے واقعات کو سلیقے سے مرحلہ بہ مرحلہ مرصع، مسجع اور مقفّی سجادینا یوں بھی کوئی آسان کام نہیں جبکہ اس نظم میں علیم صبا نویدی کا توانا و جدید اسلوب آج کے قاری کو عقیدت مندانہ شاعری کا نیا ذائقہ فراہم کر رہا ہے اور یہ نیا ذائقہ یقیناً نعتیہ شاعری کے نئے در وا کرتا جائے گا انشاءاللہ! ٹھیک اُسی طرح جس طرح وہ اپنے ایک ثلیثے میں خدا کے حضور اس طرح سجدہ ریز ہیں:

جہاں تک گئی ہے جبینِ نیاز
وہاں کوئی منبر نہ کوئی مکیں
نئی ہے مری سجدہ گاہِ نیاز

بقیہ اقبال جرم۔

روحِ عصر سے منسلک ''اقبال جرم'' میں موجزن فکشن اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ محمد سعید شیخ نے اسے رواں اسلوب میں تحریر کیا ہے۔ سعید صاحب کی نثر روانی اور سہولتِ اظہار کی مثال قرار پاتی ہے۔ اس لئے انہوں نے پنجابی زبان سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ پنجابی ثقافت اور پنجابی زبان سے ان کی تخلیقی شناسائی امید ہے ان سے اس زبان میں بھی اچھا ادب لکھوائے گی۔

اگرچہ اس وقت فکشن لکھنے والے زیادہ نہیں (کیونکہ غالباً یہ دور شاعری کو تختۂ مشق بنانے کیلئے خاص ہو گیا ہے) پھر بھی اپنی آواز کی جداگانہ پہچان کافی مشکل پہلو ہے۔ اپنی علیحدہ شناخت کیلئے جتنا موضوع کا انتخاب اہم ہے، اس سے شاید ایک درجہ زیادہ اسلوب کا اچھوتا پن اہمیت کا حامل ہے۔ محمد سعید شیخ کی سادہ نگاری کوئی آسان عمل نہیں ہے۔ میرا بہت محدود تجربہ ہے، لیکن اتنا اندازہ ضرور ہے کہ مشکل لکھنا جس قدر آسان ہوتا ہے آسان لکھنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ سعید شیخ کی نثر کا بہاؤ اک لمبی ریاضت کا ماحصل ہے۔ اسلئے میں سعید شیخ کو اردو فکشن کا ''سہل ممتنع'' کہوں گا۔ اور میں سرحد پار کے اس محترم نقاد کو مشورہ دوں گا کہ وہ پہلی فرصت میں ''اقبال جرم'' کا مطالعہ کریں، جنہوں نے ناول کی زبان کیلئے یہ معیار مقرر کیا ہے۔

''اگر شاعری کیلئے الفاظ دودھ میں ڈھلے ہوئے ہونے چاہئیں تو ناول میں آبِ حیات سے۔ سنسکرت میں ایک اشلوک ہے جس کا مطلب ہے کہ ہر لفظ کا اپنا مسکن رہے۔ آسمان ایک کورا کاغذ ہے اور ستارے الفاظ۔ بکھرے ہوئے الفاظ ان پہاڑی رستوں کی طرح ہیں جو کبھی کبھی تو ایک دوسرے سے بہت دور چلے جاتے ہیں اور پھر اتنے نزدیک آ جاتے ہیں کہ جیسے ایکدوسرے میں سمو گئے ہوں۔ الفاظ بھی پہاڑی راستوں کی طرح زندگی کے انداز کو سمجھتے ہیں۔''

آخر میں یہی عرض کروں گا کہ محمد سعید شیخ کا یہ ناولٹ (جسے موجودہ پر آشوب دور کا رزمیہ (EPIC) کہنا بے جا نہ ہو گا) ٹھوس حقیقت نگاری کا ایک ایسا نمونہ ہے جس میں انسانی احساسات اور سماجی حالات کو ایک مربوط اور مضبوط نثری افسانے کی شکل میں اس طرح پیش کیا گیا ہے جس میں ورجینا وولف کے قائم کردہ معیار کے مطابق ٹریجڈی بھی ہے تنقیدِ حیات، معلومات، مذہبی اعتقادات اور نظام سے بحث، فلسفہ و شاعری غرض اظہار کے تمام قرائن اور وسائل موجود ہیں۔

مآخذ

1۔ اردو ناول کا نگارخانہ　مصنف کے۔ کے۔ کھلر
2۔ طرفیں　مصنف ڈاکٹر جمیل احمد خان
3۔ بیسویں صدی میں اردو ناول مصنف ڈاکٹر یوسف سرمست
4۔ ماہنامہ ''شام و سحر''　نومبر 1995ء

کینسر کہانی

امجد اسلام امجد (لاہور)

(ایک کینسر زدہ بچے کی زبانی)

میں ایسا پھول ہوں جس نے خزاں میں آنکھ کھولی ہے
مری پلکوں پہ آنسو اوس کی صورت لرزتے ہیں
مری کلیوں نے کھلنے کا کوئی موسم نہیں دیکھا!

مرے مولا مجھے دی ہے یہ کیسی زندگی تُو نے
مری سانسوں کی اُبھی ڈور اتنی مختصر کیوں ہے!
ابھی تو میں نے اس دنیا کا چہرا تک نہیں دیکھا

نہیں معلوم راتیں کس طرح خوابوں کے آنگن میں سنوارتی ہیں!
سنہرے دن ہمارے واسطے کیا لے کے آتے ہیں!
ہمارے خوں کی شریانیں (کہ جن میں زندگی کو رقص کرنا تھا)
اب ان میں موت کی پرچھائیاں کیونکر لرزتی ہیں!
ہماری منتظر آنکھوں سے کس نے چھین لیں
وہ سانس لیتی پھول تصویریں!
کہ جن کی سبز خوشبو سے ہوا میں جان پڑتی ہے۔
یہ کیسی موت ہے جو لمحہ لمحہ
زندگی کی راہ کو ویران کرتی ہے۔

ہمارے جسم کے اندر یہ کیسے سانپ نے ڈیرا لگایا ہے!
یہ کیسی بھیڑ ہے جو شہر کو سنسان کرتی ہے!!

مرے مولا مرے حصے کے جیون میں
یہ کیوں زینہ بہ زینہ موت کا سایا اُترتا ہے!
مری خالی نگاہوں میں یہ کیا منظر اُبھرتا ہے
کہ جس میں ہر طرف بس راکھ ہے بجھتی امیدوں کی

تمہارے گلشنوں کی خیر ہو اے بستیوں والو!
تمہارے ان خزانوں سے
اگر اک پھول ہی مجھ کو عنائت ہو تو ممکن ہے
مرا یہ ذلت گزیدہ درد خوردہ باغ بچ جائے!
مری اس رات کی تقدیر میں روشن سویرا ہو!
سے کی شاخ پر کل جو مہکتا پھول لہرائے
بہت ممکن ہے میرا ہو!!

○

رخصتی

(محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت پر)

شبنم شکیل (اسلام آباد)

اب مجھ کو رخصت ہونا ہے کچھ میرا ہار سنگھار کرو
کیوں دیر لگاتی ہو سکھیو جلدی سے مجھے تیار کرو
رو رو کر آنکھیں لال ہوئیں تم کیوں سکھیو بے حال ہوئیں
اب ڈولی اُٹھنے والی ہے لو آؤ مجھ کو پیار کرو
یہ کیسا انوکھا جوڑا ہے جو آج مجھے پہنایا ہے
میں حوروں جیسی دلہن بنی اب اُٹھو اور دیدار کرو
اک ہار ہے سرخ گلابوں کا اِک چادر سرخ گلابوں کی
اور کتنا روپ چڑھا مجھ پر اِس بات کا تو اقرار کرو
اِک بار یہاں سے جاؤں گی میں لوٹ کے پھر کب آؤں گی
تم آہ و زاری لاکھ کرو تم منت سو سو بار کرو
ہاں یاد آیا اِس بستی میں کچھ دیئے جلائے تھے میں نے
تم انکو بجھنے مت دینا بس یہ وعدہ اک بار کرو

○

نظم بہت آسان تھی پہلے

ندا فاضلی
(ممبئی بھارت)

نظم بہت آسان تھی پہلے
گھر کے آگے
پیپل کے شاخوں سے اُچھل کے
آتے جاتے
بچوں کے بستوں سے نکل کے
رنگ برنگ
چڑیوں کی چہکار میں ڈھل کے
میرے گھر جب بھی آتی تھی
جلدی جلدی میرے قلم سے
خود کو پورا لکھ جاتی تھی
اب سب منظر بدل چکے ہیں
چھوٹے چھوٹے چوراہوں سے
چوڑے رستے نکل چکے ہیں
بڑے بڑے بازار
پرانے گلی محلے نگل چکے ہیں
نظم سے مجھ تک
اب میلوں لمبی دوری ہے
ان میلوں لمبی دوری میں
کہیں اچانک بم پھٹتے ہیں
کوکھ میں ماؤں کے سوتے
بچے کٹتے ہیں
مذہب اور سیاست دونوں
نئے نئے نعرے رٹتے ہیں
بہت سے شہروں بہت سے ملکوں سے
اب چل کر
نظم مرے گھر جب آتی ہے
اتنی زیادہ تھک جاتی ہے
میری لکھنے کی ٹیبل پر
خالی کاغذ کو
خالی ہی چھوڑ کے رخصت ہو جاتی ہے
اور کسی فٹ پاتھ پہ جا کر
شہر کے سب سے بوڑھے شہری کی پلکوں پر
آنسو بن کر سو جاتی ہے

قیصر نجفی (کراچی)

(بے نظیر بھٹو شہید ایک قائدِ عظیم)

وہی تو ایک زندگی کے طور کی کلیم تھی
وہ بے گماں عظیم تھی، عظیم تھی، عظیم تھی

اسے تو اُڑ کے جانا تھا بہشت کی فضاؤں میں
کہ گلشنِ حیات میں وہ صورتِ نسیم تھی

عجب تھا خونچکاں نظارہ اب کے قتل گاہ کا
بریدہ سر تھیں تتلیاں ، لہو لہو شمیم تھی

اسے تو ایک روز قتل ہونا تھا یہاں کہ وہ
غریبوں کی تھی دوست بے سہاروں کی ندیم تھی

نہیں تھی اس کی ذات میں کسی بھی قسم کی کجی
کہ نقشۂ حیات میں وہ خطِ مستقیم تھی

زمانہ باپ بیٹی کو بُھلا نہ پائے گا کبھی
وہ قائدِ عوام تھا یہ قائدِ عظیم تھی

زمانہ تا بہ حشر یہ کرے گا قیصرؔ اعتراف
کہ وہ بھی باپ کی طرح ذہین تھی، فہیم تھی

○

کیسی سازش ہوئی

(محترمہ بینظیر بھٹو شہید کے حوالے سے)

ماجد سرحدی (پشاور)

لُٹ گیا اپنا گھر کیسی سازش ہوئی
ہم ہوئے دربدر کیسی سازش ہوئی

چھا گئیں پھر سے تاریکیاں کو بہ کو
پھر سے روٹھی سحر کیسی سازش ہوئی

لاکھ مانگی دعا زندگی کے لئے
وہ نہ لوٹی مگر کیسی سازش ہوئی

ہم کو بتلا گیا ہے یہ رنگِ سحر
خوں بہا رات بھر کیسی سازش ہوئی

اُس کو کھینچا ہے مٹی نے اپنی طرف
ہے کشش یا سفر کیسی سازش ہوئی

کیوں یہ پنڈی شہیدوں کی مقروض ہے
کیا ہوا نامہ بر کیسی سازش ہوئی

دیس پر آنچ آئے نہ ماجدؔ میاں
سوچنا ہے یہ پر کیسی سازش ہوئی

○

آہ بے نظیر بھٹو

دل نواز دِل (لاہور)

وہ سوچنے میں صورتِ حزن و ملال تھی
اور دیکھنے میں پیکرِ حسن و جمال تھی

اپنا جواب آپ تھی، خود ہی سوال تھی
تھی بے نظیر، آپ ہی اپنی مثال تھی

جیتی و جاگتی وہ حقیقت تھی اک کھلی
وہم و گمان آپ ہی خواب و خیال تھی

اُس کا شمار دیکھ تھا چاروں طرف یہاں
وہ شرق، غرب اور جنوب و شمال تھی

خوش شکل تھی وہ خوب تھی صورت میں ہر طرح
طوطی وہ تھی جو دہر میں شیریں مقال تھی

وہ باعمل تھی علم تھا اُس کا یقین تک
وہ اک طرح سے واقفِ آں حال و قال تھی

پستی پہ آنکھ تھی تو بلندی پہ تھی نظر
وہ سر بہ سر نگاہِ عروج و زوال تھی

صیاد جس کی تاک میں تھا ہر گھڑی یہاں
یہ بے نظیر صید وہی اِک غزال تھی

اُس کی ہر ایک چیز میں رکھ تھا رکھاؤ تھا
ہر کام اور کاج میں رکھتی کمال تھی

اُس جانِ جاں کو اپنی سیاست پہ ناز تھا
جانِ ہجومِ شوق تھی ہر دم بحال تھی

وہ تیز تھی مزاج کی لیکن تھی نرم دل
عادت کی گرچہ سخت تھی پر خوش خصال تھی

کس نے کیا ہے قتل اسے عین وقت پر
سازش تھی کیا یہ ملک کے دشمن کی چال تھی!

بے حال ہو گئی تھی سیاست اگرچہ خود
پھر بھی یہ بے نظیر کے دم سے بحال تھی

جو قتل اب ہوئی ہے ہوسر گم تھی بے بدل
نجم کا سر، مد ھرتھی وہ لے، تین تال تھی

تھی وہ جواں جہانِ حقیقت میں اے نظر
پر تجربے کی آنکھ میں وہ کہنہ سال تھی

دنیا کی اونچ نیچ کی رکھتی تھی وہ خبر
اُس کی ہر ایک بات سیاست پہ دال تھی

تھی اُس کی چال ڈھال میں جلوہ گری کہ وہ
شوکت تھی، آن بان تھی، شانِ جلال تھی

دِلؔ وہ تھی، لاجواب سیاست کی جان تھی
ماہر تھی اپنے کام میں وہ باکمال تھی

○

''بارہا''

خیال آفاقی (کراچی)

بارہا ہم نے خواب دیکھے ہیں،
بارہا ان سے گفتگو کی ہے،
بارہا وہ خفا ہوئے ہم سے،
بارہا ہم بھی ان سے روٹھے ہیں،

بارہا ان سے روٹھ کر ہم نے
خود انہیں دیر تک منایا ہے،
بارہا ان سے بدگماں ہوکر
خوش گمانی کے رنج جھیلے ہیں،

بارہا ان کو اپنی چاہت کا
اس طرح سے یقین دلایا ہے،
خالقِ کائنات پہ جیسے
کوئی مومن یقین رکھتا ہے،

بارہا زندگی کو ڈھونڈا ہے،
بارہا زندگی پہ روئے ہیں،
بارہا ان کو بھول جانے کی
کوششیں بھی ہزار ہا کی ہیں،

بارہا ہم نے یوں بھی سوچا ہے
کہ اگر ہوتے وہ ہماری طرح،
اور ہم ہوتے ان کے دل جیسے،
کس قدر کرب سے گذرتے وہ،
کیسی اذیت اٹھانی پڑتی انہیں،

کتنا اچھا ہوا کہ وہ نہ ہوئے،
جیسے ہم ہیں کہ پھر انھیں ہم سا
ہوکے دُکھ ایسا جھیلنا پڑتا،
جیسے اس وقت ہم عذاب میں ہیں،
زندہ ہیں تو بھی جیسے خواب میں ہیں،

بارہا خواب میں بھی سوچا ہے،
کیسے ناداں خیال ہو تم بھی!
کیا بھلا سوچنے سے ہوتا ہے!
بارہا پھر بھی ہم نے سوچا ہے۔

○

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بہار، بھارت)

انہونی کیا ہے؟

دھواں دھواں سا ہو گیا
تیرا میرا ساتھ!
تنہا کیسے کاٹ لوں
ساون کی برسات
کیسی ہے سوغات
تن تو گیلا ہو گیا
من کی بجھے نہ آگ
بجے نہ کوئی بات
جیسے بکھرے بال
آنگن چھت پر میں پھروں
پلکیں دونوں موند
انہونی کیا بات!!
دھواں دھواں سا ہو گیا
تیرا میرا ساتھ!!

معمہ

روز منزلوں کی خبر رکھتی ہے
زندگی کے حصے میں سفر کرتی ہے
بات ہے، بات ہی سے بنتی ہے
اپنے من کا ہرا شجر رکھتی ہے
گدگدی میں بھی فن رکھتی ہے
فیصلے کی دلہن رکھتی ہے
بے لوث اپنے وجود میں وہ
آنگن اور گلشن رکھتی ہے
اور ضرورت پڑنے پر
انگارے کا چلن رکھتی ہے
اس کی فطرت انوکھی ہے
کون ہے وہ کہاں ہے وہ
اس معمے کا حل کدھر ڈھونڈوں؟

منٹو کی یاد میں

ممتاز احمد (برمنگھم)

سارا اُردو ادب چھان مارا مگر
بانکا و کج کلاہ
تیرے بن دوسرا
ایک بھی نہ ملا تجھ سا اہلِ قلم
تو تھا اِک باکمال
بے مثال
تو کل بھی منفرد تھا
آج بھی
شاعرِ خوش نوا غالبِ یکتا کی طرح
الگ تھلگ ہیں
چار حرف تیرے نام کے
تیری شہرت دوام ہے
شعور تھا تجھے بشر کے
خوب پست حال کا
کتاب ہست و بود پہ
عبور تھا کمال کا
لکھا ہے جس ادا سے تو نے
اپنے ہر خیال کو
وہ ہر ادیب کے لئے
آج بھی مثال ہے
چراغ لازوال ہے
سلام تیرے قلم کے خرام پہ
سلام تیری شہرت دوام پہ

○

''عروسِ فن''

(ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے لئے)

حفیظ انجم کریم نگری (بھارت)

عروسِ فن کے سخن کے حسیں ہیں نظارے
جہانِ شعر میں نا کے گئے کئی نارے
حسین لگنے لگی ہے ادب کی یہ دُنیا!!
قلم نے آپکے لکھے ہیں سو جو شہہ پارے

اندھیری رات کے سنسان وادیوں سے پرے
وہ صبح نو کا فرشتہ بنے ہوئے ہیں کھڑے
لبِ جنوں پہ شکایت کا ایک لفظ نہیں
غمِ حیات سے بڑھ چڑھ کے خوب وار لئے

یہ فکر و فن کا محل ہیں سبھی نے گُن گائے
ہیں زندگی کو بڑی دور تک سجالائے
اسی لئے تو ہیں تعظیم میں سبھی اُنکی!!!
بزرگ نے آ کے یہاں پر جو پھول برسائے

ہزاروں سال کے ٹھٹھرے ہوئے کئی پودے
تمہاری قامت و تہذیب کے حریف بنے
ڈھنڈورا پیٹتی پھرتی ہے اِنکی تنگ نظر!!
دلوں میں بغض و حسد کے ہیں کوہسار لئے

ہیں پھول پتے سبھی آپ ور نہائے ہوئے
یہ ہار آپکی خاطر تو ہیں پروئے گئے
خوشی کا نشہ تو دیکھو جناب عاشق کا!!
ہیں انگ انگ سے انجم وہ مسکرائے ہوئے

○

آوارہ سفر کا انتظاریہ

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

میرے شہر کی ویران سڑکیں
جن کو مَیں نے اپنی رگوں کے خوں سے سینچا
جن کو مَیں نے اشکِ وفا سے
ہر لحہ آباد کیا
یہ لمبی آوارہ سڑکیں
میرے جنوں کے ساتھ رہی ہیں
میرے پاؤں نے اِن سڑکوں کو
گردش کے مقیاس سے پیہم ناپا ہے
سائیکل کی رفتار میں جی کر
زخموں کے انبار کو پی کر
ہلکی ہلکی آگ کی مدھم انگھیٹی کو تاپ رہی ہَیں
یہ لمبی آوارہ سڑکیں
جانے کب سے آتے جاتے ہر لمحے کو
چُپ چُپ اپنی آنکھیں کھولے دیکھ رہی ہَیں
میرے دھیان کی جوت جگائے جاگ رہی ہَیں
یہ لمبی آوارہ سڑکیں
اپنے گہرے زخم چھپائے ٹوٹے پھوٹے جسم اُٹھائے
میری تھکی آواز کی لے پر بھاگ رہی ہَیں
یہ بَن باسی پیاسی سڑکیں
جانے کب تک
میری طرح اِس شہر میں گھوم کے پھر واپس آ جائیں گی

○

پاٹھ شالا کے دروازے پر

پرویز مظفر (برمنگھم)

جب میں اسکول کی
چھوٹی سی دنیا سے نکلا تھا
کتنا معصوم سیدھا
صاف دل ہر نفرت سے دور
مسکراہٹ بکھیرتا تھا
جس میں سچائی تھی
محبت کی خوشبو پھیلتی رہتی تھی
چھل کپٹ کے کانٹے نہیں تھے
ایسے سب مہکتے ہوئے پھول
بستے میں لیئے گھر لوٹتا تھا

وقت کے گذرنے کے
ساتھ ساتھ
اب خودغرضی چالاکی نفرت کے شعلے
انتقام کی آگ جلن
بستے میں بھرتے چلے گئے
وقت کا پتہ ہی نہ چلا
بالوں میں پہلے
ایک دو سفید تار
پھر سارے بال ہی ------
اب پھر جب اُسی عمر میں لوٹا ہوں
اب جب یہاں پر پہنچا ہوں
تو پھر خیال آیا ------
لپک کر پاٹھ شالا کے دروازے پر پہنچا
مگر دروازہ بند ہے
جہاں میں اپنا وہ بستہ بھول آیا تھا

کیا خبر

شارق عدیل (ایٹہ، بھارت)

شہر کے آخری موڑ پر
ایک برگد کا بوڑھا شجر
زندگی سے بھرے
قہقہوں کی سماعت سے معذور ہے
شہر کے آخری موڑ پر
ایک خستہ مکاں
اپنی ویراں فضاؤں کی آواز پر
کان دھرتا نہیں کتنا مجبور ہے
شہر کے آخری موڑ پر
ایک مسجد کا لاغر بدن
اب اذاں کی صداؤں سے محروم ہے
کون جانے کسے ہے خبر
یہ بدلتی کرنسی کے رحم و کرم
اپنی قدروں کے شائستہ احساس کو
کتنے حصوں میں تقسیم فرمائیں گے

○

کرامت بخاری (لاہور)

تلخیِ ایام

کسی ساقی کا کرم ہے نہ کہیں چین نہ آرام
نہ کوئی مطرب گلفام
کوئی شوخی نہ شرارت نہ نظر کا پیغام
کوئی مے کش ہے نہ ساقی نہ کوئی رند نہ جام
نہ کوئی تشنۂ ترسیل پیام
آگ ہی آگ ہے یہ جراتِ اظہار کا دور
کرب ہی کرب ہے یہ فکر و نظر کی دُنیا
کچھ میسر ہی نہیں دہر میں بجز تلخیِ ایام
ہاں فقط تلخیِ ایام

○

جنگ

جنگ جیتنے والو!
موت بانٹنے والو!
باغِ زندگی کی شاخ کاٹنے والو
موت کی محبت کا موت ہی مقدر ہے
بھوک کے اضافے پر خوش نہیں ہوا کرتے

جنگ جیتنے والو!
موت بانٹنے والو!
جنگ کس نے جیتی ہے۔
تُم بھی ہار جاؤ گے میں بھی ہار جاؤں گا
موت جیت جائے گی
موت جیت جائے گی۔

زوال

فیصل عظیم (کناڈا)

وہ گر رہا ہے
وہ بت جو تم کو قد آوری سے ڈرا رہا ہے
جو اپنی ہیبت دکھا رہا ہے
جو اک زمانے سے بوجھ سے اپنے تم کو
اب تک
دبا رہا ہے
وہ بوجھ سے اپنے آپ ہی نیچے آ رہا ہے
لرز رہا ہے، چیخ رہا ہے
خود آج اپنی شکستگی سے الجھ الجھ کے
وہ پاؤں اپنے پٹخ رہا ہے
یہ شور سارا
یہ پاؤ ہو سب
اسی چٹخنے کا شاخسانہ ہے، دیکھ لینا
ابھی ذرا دیر اور ٹھہرو
جہاں پہ ہم سر کے بل گرے ہیں
وہیں پہ یہ بت بھی آ گرے گا

○

ہائیکو

صابر عظیم آبادی (کراچی)

اس میں کیا ہے شک
سب کو راہ دکھاتے ہیں
جگنو، رنگ، دھنک

○

عشق پہ کس کو زور
لے کر دل تڑپاتا ہے
آوارہ چت چور

○

غنچہ ہے نوخیز
آ جا تجھ کو پیار کروں
موسم ہے گل ریز

○

تارا، جگنو، رنگ
تاریکی کا خوف نہ کر
میں ہوں تیرے سنگ

○

بھول گئے پہچان
اپنا ہوش نہیں ہے تم کو
کیسے ہو انسان

○

لاتی ہے سوغات
کتنی دلکش ہوتی ہے
وصل کی پہلی رات

○

پیپل کی ہے چھاؤں
بیٹھ کے کچھ آرام کریں
دور ابھی ہے گاؤں

○

قطعات

قیصر نوری (کراچی)

ہر اک وجود کی ہوتی ہے کچھ نہ کچھ بنیاد
تلاش چاہیے اس کی کسی بہانے سے
کمالِ اہلِ ہنر ہے یہی ہنر مندو
حقیقتوں کو کشیدہ کرو فسانے سے

بدل گیا ہے زمانہ کچھ اسقدر لوگو
کہ اب تو اپنے پرائے کی کچھ تمیز نہیں
مفادِ ذات میں ہر شخص گم ہوا ہے یوں
نگاہ اس کی کہیں دل کہیں قدم ہے کہیں

تم آدمی ہو تو پھر آدمی کی شان رکھو
تخیلات میں اپنے نہ بند ہو کے رہو
فلک قدم میں ہو سورج نظر ملا نہ سکے
زمیں کی سطح پہ اتنے بلند ہو کے رہو

نتیجہ اس کا یقیناً برا نہیں ہوتا
بصدقِ دل اگر ایجاد پہ عمل ہوگا
اگر رہے گا تسلسل میں نہ تجربات دوست
نہیں جو آج ہوا ہے وہ کام کل ہوگا

○

تمہارے ساتھ

شاہد عزیز (آرے پور بھارت)

ابھی میں سو نہیں سکتا
ابھی ان کی آنکھوں میں
مسلسل جاگتے رہنے کی
خواہش جگمگاتی ہے
ابھی وہ درد باقی ہے
جو میرے جسم کے اندر
نسوں کے ساتھ بہتا ہے
جسے میں بھول جاؤں تو
ذرا کچھ چین مل جائے
ابھی تو وقت کے تاریک
جنگل سے کوئی آواز آتی ہے
اجالوں کی تمنا میں
کوئی سایہ بھٹکتا ہے
مگر سورج کبھی ان
اندھی گلیوں میں نہیں آتا
کبھی اک اور سیارہ
کسی بے نام انجانی
خلاؤں سے نکلتا ہے
تمہارے واسطے
وہ چاند لاتا ہے
زمیں سے کالے دھبوں کو
مٹاتا ہے
تمہارے ساتھ جینا ہے
تمہارے ساتھ مرنا ہے

○

''یومِ یکجہتی کشمیر''

شگفتہ نازلی (لاہور)

وحدت کی تصویر
ہر پَل پہ بنتی ہی گئی
ہاتھوں کی زنجیر!

ظلم اور جبر کی تاریکی
کب سے اور کب تک ہی رہے
بالآخر مٹ جائے گی!

ہر شہید کا لہو
ہے یہی پکارتا
ہو رہے گا سرخرو!

سیلِ آزادی روک پائے گی
سلسلہ عرصے سے یہ ہے جاری
اور کتنی سپاہ آئے گی؟

ہر دیا جلانا ہے
ہے جہادِ آزادی
آگے بڑھتے جانا ہے!

ہے ہر اک لمحہ وفاؤں کے لئے
--- ہاتھ اُٹھتے ہیں ---
مگر صرف دُعاؤں کے لئے!

رنج سے خوگر

ملک فضل حسین (برطانیہ)

حضرات! فورم کا ڈائریکٹر ہونے کے ناطے عموماً مجھ پر ہی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ میں ممبروں اور شاعروں کا تھوڑا بہت تعارف پیش کروں۔ اس ذمہ داری سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برا ہونے کیلئے مردم شناسی ضروری ہے وہ تو نہیں ہے البتہ دوستوں اور احباب کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش ضرور رہی ہے

یہ کیا ضرور کہ خود اپنی ذات لے کے چلو
مزہ تو جب ہے کہ زمانے کو ساتھ لے کے چلو

موضوعِ سخن کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانے کیلئے مرزا اسداللہ غالب کا ایک شعر عرض ہے فرماتے ہیں

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

مرزا غالب بہت مشکل پسند شاعر تھے اور پھر وہ اپنے ایک ایک مصرعے میں اپنے عہد کی کوئی نہ کوئی داستان سمودیتے کے عادی تھے۔ لہٰذا اُن کی شاعری کو سمجھنے کیلئے اُن کے عہد کی تاریخ کا علم بھی ضروری ہے۔ مذکورہ بالا شعر کے دوسرے مصرعے میں وقت اور فطرت کے اُس لا تجزیہ عمل اور ان کی مشکلات کا ذکر ہے کہ جس سے گزر کر ہی قطرہ نیساں ایک موتی بنتا ہے اور پھر اس پر مزید اُن مشکلات کا اضافہ جو لہر لہر میں گھڑیالوں نے کئی کئی دام بچھا رکھے ہوں۔ اس زیرو بم میں کسی قطرے کا گہر بننے تک محفوظ رہنا کس قدر مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آبی گہر کم یاب ہوتے ہیں۔ بس کچھ اس طرح ہی کی مشکلات اور محافظت درکار ہوتی ہے کسی شخص کو اسم بامسمّیٰ بننے تک اُردو فورم کی آج کی شام جناب ممتاز احمد کے نام ہے کہ یہ صاحب جب بھی کسی سے اپنا تعارف کراتے ہیں تو کچھ یوں فرماتے ہیں۔ ''انی ممتاز بدون امتیاز یعنی علامۃ الخرافات والھر لیات'' ممکن ہے کہ انہیں اسم بامسمّیٰ بننے تک مشکلات کا ادراک ہو گیا ہو لہٰذا یا اپنے تعارف میں 'ممتاز بدون امتیاز' کی اصطلاح استعمال کرتے ہوں مگر ان کی عربی خوانی سامع کے اوسان خطا نہ بھی کرتی ہو تب بھی اس مشکل میں ضرور ڈالتی ہوگی کہ کیا معلوم یہ کتنے بڑے علامہ ہیں جو اس قدر فصیح و بلیغ عربی اور وہ بھی فرفر بول رہے ہیں یعنی دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ اور اس پر طرفہ تماشہ کہ ساتھ ہی موصوف فردوسی، خیام، سعدی یا حافظ کا کوئی نہ کوئی شعر بھی داغ دیتے ہیں تا کہ داغ دہلوی کے ساتھ بھی نسبت قائم رہے۔ بقول حافظ

زشعر حافظ شیرازی گویند وی رقصند
سیاہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

حضرات: آپ نے بھی انہیں اس مشاہداتی نظر سے ضرور دیکھا ہو گا جب یہ کوئی مشاعرہ پڑھنے اسٹیج کی جانب جھومتے جھامتے یعنی کہ گویند وی رقصند جاتے ہیں اور پھر بزعم خویش ہی نہیں بلکہ بیچ مچ بھری مجلس میں مشاعرہ لوٹ کر ہی لوٹتے ہیں اور سونے پہ مزید سہاگہ یوں کہ اکثر فارسی کے اساتذہ شعراء کے کلام پہ فارسی ہی میں تضامین پیش کرتے ہیں اور ہم اس وجا بن ماں کو وہ تو حکر 'آب آب' کرمونیوں بچیاف ارسیاں گھرپائے گنگناتے رہ جاتے ہیں۔
بہر حال بات اگر داغ دہلوی تک ہی محدود رہتی تو شائد ہضم ہو جاتی مگر موصوف تو بات بات پہ غالب کا حوالہ 'چچا جانی'' کہہ کر دیتے ہیں۔ اگر ہم موصوف کی شخصیت اور شاعری کو انہیں ''دو حوالوں کی نظر سے دیکھیں تو قدوقامت میں ایک حد تک مشابہت بھی ملتی ہے اور وہ جو غالب کی شاعری 'دندان شکن' کہلاتی ہے اپنے اس بھتیجے پر پورا پورا اثر چھوڑ گئی ہے حالانکہ یہ نہ تو سیاہ چشمان کشمیری ہیں اور نہ ہی ترکان سمرقندی اور نہ ہی تنگ بندی مگر جب موج میں آتے ہیں تو اپنا کمال دکھا دیتے ہیں یعنی دھوتی پھاڑ کر رومال بنا دیتے ہیں۔ یہی ان کا ایک امتیاز ہے جب ہی تو ہم انہیں ممتاز مع الامتیاز کہتے ہیں۔
بقول غالب:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

شروع شروع میں ہم بھی جناب ممتاز احمد کی مذکورہ صید افگنی کے صید زبوں رہے ہیں اور اپنی کم مائیگی پر تو اب بھی شرمسار ہیں۔ ایک بار ممتاز صاحب نے ہم پر بھی ایک وسیع و عریض مضمون لکھا تھا اور سنا ہے کہ وہ کسی اخبار میں چھپا بھی تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ کچھ اتنا لمبا اور بے ڈھنگا تھا کہ شائد ہی کسی تلنگے نے پڑھا ہو۔ یہ تلنگا لفظ ہم نے جناب اقبال بھٹی سے مستعار لیا ہے۔ وہ مضمون ایک بار ہمیں بھی صاحب مضمون کی زبان سے سننے کی سعادت ملی۔ ماجرا کچھ یوں ہے کہ ایک بار ہم ایک بیگار میں پکڑے گئے۔ ہوا یوں کہ ہمیں اردو کے ایک معروف شاعر جناب محسن احسان کو کاونٹری سے اٹھا کر بریڈفورڈ پہنچانا تھا۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اور جناب ممتاز میرے ساتھ والی سیٹ پر متمکن تھے اور مہمان عزیز پچھلی سیٹ پر تشریف فرما تھے۔ جونہی گاڑی کاونٹری سے چلی جناب ممتاز نے غالباً مہمان خصوصی کو زیر دام لانے کے لیے اپنے سفری بیگ سے کچھ کاغذات نکالتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ ایک مضمون سنانا چاہتے ہیں اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ سفر میں کوئی باتیں کرنے والا اور وہ بھی ادبی قسم کی کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔ جناب ممتاز مضمون پڑھنے لگے تو جناب محسن احسان خراٹے بھرنے لگے۔ لہٰذا داد دینے کا فریضہ بھی ہمیں ہی انجام دینا

پڑا۔ چونکہ مضمون ہمیں پر تھا لہذا داد کے خوب ڈونگرے برسائے۔ جب مضمون ختم ہوا تو گاڑی بریڈفورڈ میں داخل ہو رہی تھی۔ جناب محسن احسان نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا کہ کہاں تک پہنچے؟ ممتاز صاحب نے جل بھن کر جو کچھ کہا وہ اس مضمون کے تنگ دامن میں سمویا نہیں جاسکتا۔ مگر جو کارآمد نکتہ ہم پر کھلا وہ یہ کہ جناب ممتاز احمد کے مضامین بیک وقت خواب آور و تریاق بند بھی ہوتے ہیں۔ اسی لئے تو جناب محسن احسان سارے راستے سوتے رہے اور ہم پل بھر کیلئے اونگھ بھی نہ سکے۔

جناب ممتاز احمد کی ان ہی امتیازی خصوصیات پر سوچتے ہوئے ایک روز ہم ان سے پوچھ بیٹھے کہ حضور آپ کے تخلیقی کو ہسار کن کن جاسحات پر سایہ فگن رہے ہیں۔ تو جواب ملا کہ ادیب عالم و منشی فاضل جیسی اسناد گھر بار حاصل کئے ہوئے ہیں یعنی مستند عالم اور فاضل ہیں۔ مگر ہماری تشنگی قلب نہ ہوئی۔ اگر اتنی سی کوہ کنی کیساتھ دودھ کی نہریں بہہ نکلیں تو نہ فرہاد کا نام رہتا اور نہ ہی شیریں دشت دلگیر میں نوردگر درہتی۔ لہذا انہیں مزید ٹٹولنے پر اس مخفی گنج گراں مایہ کا پتہ چلا جس نے ممتاز کو مع الامتیاز بنایا ہے۔ ہم نے پوچھا تو کہنے لگے۔۔۔ میرا تو نوعمری سے یہ اصول رہا ہے کہ ہر روز ایک آدھ نیا لفظ ضرور سیکھتا ہوں۔ جناب عالی! یہ سنتے ہی اپنا بے ہمت و کم مایہ قلم عش عش کر اٹھا۔ آنکھیں رشک سے اشکبار ہوئیں۔ دل نے چاہا کہ کاش ہم نے بھی یہی کچھ کیا ہوتا۔ زہے نصیب یہ مرتبہ جسے ملا ملا۔

محنت اور زیادہ محنت اور محنت کے ساتھ کبھی کبھی زیادتی بھی ہو جاتی ہے۔ ایک روز موصوف نے باتوں ہی باتوں میں یہ بتایا کہ وہ برصغیر کے نامور افسانہ نگار جناب سعادت حسن منٹو کی تحریروں کے دلدادہ ہیں۔ ہماری نگاہ میں منٹو کی شہرت کچھ اچھی نہ تھی جو کہ پریس کی پیدا کردہ تھی۔ ہم نے منٹو کو کبھی پڑھا نہیں۔ ان کے ایک آدھ افسانے مثلاً "ٹھنڈا گوشت" کا بس نام ہی سن رکھا تھا مگر ممتاز صاحب تو منٹو کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ ظالم کچھ اس طرح سے لکھتا ہے کہ الاماں و الحفیظ۔ موضوع کا کچھ اس طرح سے "دھڑن تختہ" کرتا ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی قاری کو بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ ان اصطلاحوں پر ذرا غور کریں اور پھر اندازہ لگائیں کہ جناب ممتاز کی شہرت کہاں سے کہاں تک ہے۔ جب ہم نے ان سے پوچھا کہ کیا ان کے پاس منٹو کی کوئی کتاب ہے؟ تو کہنے لگے یہ پوچھیں کہ کون سی کتاب ہے جو نہیں ہے۔ ہم نے ان سے ایک آدھ کتاب ہی مستعار لی اور دو چار افسانے پڑھے۔ اور جناب ممتاز کی شخصیت کا ہم پر ایک اور سربستہ راز کھلا۔ منٹو اپنے معاشرے پر بالکل ننگی آوازیں کستا تھا اور کوئی نکتہ تنقید اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ ممتاز صاحب بھی منٹو کی طرح اپنے سامعین پر آوازیں کستے ہیں اور سامعین انہیں مزاحیہ شاعر کا خطاب خلعت بار پیش کرتے ہیں۔

ان کی مزاحیہ شاعری میں اگر سنجیدگی کا پہلو تلاش کیا جائے تو اس آئینے میں ہمارا عکس بھی جا بجا ملتا ہے۔ ان کی سنجیدہ شاعری کی مثال ان کا ایک ہی شہ پارہ ہے اور وہی کافی ہے۔ یہ ایک حمد ہے جو انہوں نے پہلی بار اردو فورم کے اسٹیج سے پڑھی تھی۔ اور ہم آج تک ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ اس حمد کا ایک ایک مصرعہ ان کے سارے گناہوں کی بخشش کیلئے کافی و شافی ہے۔ یوں بھی ممتاز احمد کئی بار حج اور عمرہ کی سعادت حاصل کر کے اپنے سارے گناہ معاف کروا چکے ہیں۔ وہ حمد ان کی سنجیدہ شاعری کی "واسط" مثال ہے۔ یاد رہے کہ "واسط" عراق کے اس شہر کا نام ہے جہاں کے قلم بہت مشہور ہیں۔ انہیں دینے کیلئے ہمارے پاس وہ قلم تو نہیں ہے مگر ہم انہیں "مشزور قلم" کی دعائیں ہر وقت دیتے رہتے ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

چلئے جناب ممتاز احمد سے ہم مل کر درخواست کریں کہ وہ ہمیں اپنی وہ مذکورہ نظم ایک بار پھر سنائیں کیونکہ اپنے کلام کے پڑھنے کا سلیقہ اور انداز بھی ان کا اپنا اور جداگانہ ہے جس میں ان کا امتیاز منعکس ملتا ہے۔ ممتاز صاحب کے جملہ ہنر اور شخصی خصائل کا احاطہ اس مختصر سے تعارف نامے میں بڑا مشکل ہے۔ یہ کام ہم ان کے دیگر مداحوں پر چھوڑتے ہیں تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

۔ بقیہ یا نصیب ۔

تھا خود اسٹاک مارکیٹ کا نامور اور معتبر قیافہ شناس بن گیا۔ اُسے ان پیش گوئیوں کا بنیادی راز معلوم ہو چکا تھا۔ اب اخبار والے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور معاوضہ دے کر اسٹاک مارکیٹ کے لئے قیافہ آرائی کرواتے تھے۔

لیکن سٹہ بازار میں دن پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ وہاں کا تیس منٹ کا نصف گھنٹہ بھی برسوں کی طوالت پر محیط ہوتا ہے۔ اس نصف گھنٹے میں کروڑ پتی سڑک پر کاسہ لئے کھڑا نظر آتا ہے۔ چنانچہ جب ایک بنک نے اپنی سالانہ رپورٹ میں پانچ سو ملین پونڈ کا ناممکن الوصول قرضہ (بیڈ ڈیبٹ Bad debt) منسوخ (رائٹ آف Write off) کر دیا تو اس بنک کا بارہ پونڈ کا شیئر گھٹتے گھٹتے چار پونڈ کا رہ گیا۔ اسی طرح ایک سافٹ ویر اینڈ کمپیوٹر سروسز پروائڈر (Soft ware and Computer Services Provider) کمپنی نے منافع میں کٹوتی (پرافٹ وارننگ Profit Warning) کا اندیشہ ظاہر کیا تو اس کا شیئر بیس پونڈ سے گھٹ کر ایک پونڈ تیس پنس کا رہ گیا۔ اور تب حامد کا اسٹاک مارکیٹ میں سرمایہ کاری کے خطرات کا شدت سے احساس ہوا۔

☆

تخلیقِ عصر

نا زہ تصانیف کا تعارف

عطیہ سکندر علی

مقالات

اردو ادب کی حد تک یہ تاثر کافی پختہ ہو چکا ہے کہ تنقید اور تنقید نگار' محقق یا تجزیہ نگار وغیرہ خشک موضوعات کے حامل دقیق اور دلائل آمیز رویوں کے باعث پڑھنے سے عاری اور سمجھنے سے ماورا تحریریں جمع کر کے مفید کام انجام نہیں دے رہے۔ حالانکہ کام کوئی بھی ہو اُس کو کرنے کا طریقہ درست اور دلچسپی کا حامل ہو تو نتائج ہمیشہ مثبت ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے پیش نظر اس وقت ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے گیارہ تحقیقی مقالوں پر مشتمل ''مقالات'' کے عنوان سے تحریر کردہ ایسا پُر لطف' پُر مغز اور معنی آفریں نسخہ ہے' جس کے ہر ہر مضمون' ہر ہر صفحہ اور ہر ہر سطر میں پڑھنے والے کے لئے معلومات' دلچسپی اور حیرت کے ان گنت جہان محفوظ ہیں۔ ہمارے لئے مقام حیرت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب محترم نے اس قدر اہمیت کے حامل مضامین کو یکجا صورت میں پیش کرنے کیوں مناسب جان حالانکہ تھوڑے سے تردد اور جستجو سے ہر ہر مضمون کو کتابی شکل میں پیش کیا جاتا تب بھی کارنامے سے کم تصور نہ ہوتا۔ کتاب ہٰذا کے اوّلین مضمون ''ہومر کے لافانی رزمیے'' اس قدر جامعیت اور تفصیل کا حامل ہے کہ جس نے بھی ہومر کو پہلے پڑھا ہے اُس پر بھی ہومر کئی نئے زاویوں سے ہمارے سامنے آ کر اپنی اہمیت پہلے سے زیادہ منوانے لگتا ہے۔ اسی طرح ''شاکر اگلی ایک گمنام شاعر'' ''میرا امن دلی والے'' ''اردو دنیا کا پہلا بین الاقوامی شہری'' ''قصص ہند کا قضیہ'' ''یلدرم' منٹو اور فیض'' ''پطرس بخاری کا ایک نادر و نایاب مضمون'' ''عزیز احمد کی تاریخی کہانیاں'' ''پاکستان کی پہلی انگریزی فیچر فلم'' ''کامیڈی تھیٹر'' ''اطالیہ کی مصورانہ روایت'' میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے انتھک محنت اور جاں سوزی کے ساتھ اُن تمام کتب کے تفصیلی حوالے بھی درج کئے ہیں جو اپنی جستجو' لگن اور شوق میں زیرِ نظر کتاب کی تحقیق اور تحریر کے دوران اُن کے زیرِ مطالعہ رہیں۔ حوالے کے طور پر چند مضامین کے اقتباس بھی درج کئے جا سکتے ہیں مگر'' مقالات'' اور اس کے مصنف سے انصاف کا تقاضا اس امر کی قطعی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ایک علمی اور فکری تخلیق کے چند جملوں یا چند پیراگراف کو کوٹ کر کے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں نہیں صاحب ہرگز نہیں۔ زیرِ نظر صفحات اپنے عصر کی تازہ تخلیقات کے تعارف کے امین ہیں لہٰذا ہماری کوشش اور خواہش ہمیشہ یہی ہوا کرتی ہے کہ ہم ہر طرح کے تعصب اور تعلق سے بالاتر ہو کر اپنے عصر کی نمائندہ تخالیق کا بھرپور تعارف کرائیں'' مقالات'' کی نسبت بھی یہ مختصر تحریر ایک تعارف نامہ ہے' جس کی تحریر کے دوران راقم الحروف کا دل اور دماغ مسلسل ''مقالات'' کے جہانِ معنی کی سیر کرتے رہے ہیں۔ جیسے ہی ''مقالات'' آپ کے زیرِ مطالعہ آئے گی آپ بھی ایک مدت تک ''مقالات'' کی سحر آفرینی سے باہر نہ آ سکیں گے۔ ''مقالات'' طبع دوئم ایک سو پچاس روپے کے عوض نگل بکاؤلی۔ 225 نشتر بلاک' علامہ اقبال ٹاؤن لاہور سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

منڈروالی گلی

''بسا اوقات کہانیاں ہمارے گرد تتلیوں کی مانند اُڑتی رہتی ہیں' لیکن نا قابل گرفت تتلیوں کی مانند ہماری گرفت میں نہیں آ تیں۔ ہاں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غروب ہوتے ہوئے دن کا وہ لمحہ' جب دونوں وقت آپس میں گلے مل رہے ہوں اور آسمان واپس لوٹتے ہوئے پرندوں کے حصار میں آ چکا ہو' ڈھلتی ہوئی شام کسی محبوبہ دلنواز کی مانند سرگوشی میں کہانی سنانے آ جاتی ہے اور وقت تھم جاتا ہے لیکن کہانی سنانے کے لئے لازم نہیں کہ دن سنولا ہو چکا ہو یا رات اپنی زلفیں کھول دے' کبھی کبھار گرمیوں کی چمکتی اور تپتی دوپہروں میں جب تاریک کمروں میں نیم خوابیدہ بدن سلمندی کی کیفیت میں نیند کے آرزو مند ہوتے ہیں' اُس وقت دور کہیں گلی میں روزی کمانے کی خاطر کسی پھیری والے کی آواز ایک چیخ بن کر کانوں اُتر جاتی ہے' یا کوئی غیر مرئی قوت' خواب کی صورت خوابیدہ ذہن کو بیدار کر دیتی ہے' اور کہانی شروع ہو جاتی ہے۔۔۔'' کہانی: دوسرا سرا

''کچھ سمجھ میں نہ آیا' اس خط کے مطابق اپنی تاریخوں میں حسینہ بوا کے منگیتر نیروبی میں ایک کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے' یہ خط اُن کی کمپنی کی جانب سے ایک اطلاع تھی' میرے ذہن میں بارش شروع ہو چکی تھی' موسلا دھار بارش' حویلی روشنیوں میں نہائی ہوئی تھی' شہنائی کی دھن پر نوبت بج رہی تھی' زنان خانے میں گھنگروؤں کی جھنکار اور بھلے کی تال پر رقاصہ کا رقص جاری تھا' حسینہ بوا کا دلکش سراپا روشنیوں کی چھوٹ میں نمایاں تھا۔۔۔'' کہانی: بارشوں کا شور

''میری آنکھوں کے سامنے خلیفہ بغداد المستعصم اور اس کے بیٹوں کو قتل کر دیا جاتا ہے' میں بے بس دیکھتا رہتا ہوں' پھر ہلاکو کے لشکری بھر کے بغداد کے شہر کو لوٹتے ہیں' خلیفہ کے محل میں گھس کر وہاں سے سات عورتوں اور تیرہ خدام کو گرفتار کر کے لشکر میں لے آتے ہیں اور انھیں آپس میں بانٹ کر اپنے تصرف میں لاتے ہیں' میں یہ سب اپنی پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور بغداد فتح ہو جاتا ہے۔۔۔'' کہانی: یہ جنگل کٹنے والا ہے

ڈاکٹر انور زاہدی انوکھی کہانی کہتے ہیں نرالی ترکیبیں استعمال لاتے نئی ان دیکھے جہانوں کی سیر کراتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے اور بیان کرتے یا ہمیں ازبر کرانا چاہتے ہیں وہ سب کچھ ہمارا دیکھا بھالا جانچا پرکھا اور ہم پر گذرا

ہوا ہے فرق صرف محسوسات کا ہے' غور وفکر کا ہے یا جسم نمو کی کا فرمائی ہے مگر ایسی حقیقت جسے کہانی' افسانہ یا فکشن کہہ کر گزر جانا کم ازکم صاحب علم' بصیرت اور فکر کے لئے ممکن نہیں ہے۔"منڈروالی گلی"

درحقیقت ایسی پندرہ کہانیوں پر مشتمل افسانوں مجموعہ ہے جو کسی نہ کسی شکل' کسی نہ کسی دور اور کسی نہ کسی حوالے سے ہمارے ماضی' حال اور مستقبل کا منظرنامہ ہے۔جس سے باخبری کم ازکم باخبر لوگوں کے لئے انتہائی ضروری ہے۔جس کے لئے آپ ایک سو پچھتر پاکستانی روپوں کے عوض' دولت پبلی کیشنز پلاٹ 110' سٹریٹ 15' آئی ۔ نائن ۔ ٹو' اسلام آباد سے رجوع کرنا ہوگا۔

راگ۔راگ مٹی

محترمہ عذرا پروین 6 جنوری 1961 کو اپنی ننھیال اناؤ (یوپی' بھارت) میں پیدا ہوئیں ۔ ان کا آبائی وطن ملیح آباد ہے۔ عذرا پروین کا شمار جدید نسل کی نمائندہ شاعرات میں ہوتا ہے۔ان کے کلام میں ان کے عصر کے سیاسی' سماجی اور معاشرتی المیوں کے ساتھ ان کی زندگی کے درد و کرب کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔عذرا پروین صاحبہ کو غزل اور نظم میں یکساں مہارت حاصل ہے۔ بلاشبہ "راگ راگ مٹی" اُن کا پہلا مجموعہ غزل ہے مگر اُن کا لہجہ اور آہنگ اُن کے پختہ شعور کی جا بجا گواہی دے رہا ہے۔

باہر ہے طوفان میں اپنے اندر ہوں — خوف کے پتھر تلے دبا اک گھر ہوں
غازہ کرنا ہے دیا کار بہت — خود سے ملنا ہے دشوار بہت
سمٹ گئی تو شبنم پھول ستارہ تھی — بکھر کے میری لہر لہر انگارہ تھی
مری آنکھوں میں کھائل آ گئی ہے — جو لقیہ ہے عجب کی خاموشی ہے
شہد کی ہر سہ شرابی تھی — جاگنا ہی میری خرابی تھی
تر ہر زخم ہی دیدہ وری تھا — کہ یقیہ کھیل سارا سر سری تھا
میں دم گھٹنے سے پہلے کی گھڑی ہوں — یقیں آتا نہیں میں زندگی ہوں

گر مقصود محترمہ عذرا پروین کا محاکمہ ہوتا تو کہنے' سننے کے لئے "راگ راگ مٹی" میں محترمہ نے بہت سا مواد اور موضوعات فراہم کر دیئے ہیں۔منشا چونکہ "راگ راگ مٹی" سے آپ کے تعارف کی ہے لہذا محترمہ عذرا پروین کا مختصر تعارف اور "راگ راگ مٹی" سے چند نمائندہ اشعار آپ کی نذر کر کے کتاب اور صاحب کتاب کی جانب آپ کی توجہ دلانا ہے۔امید ہے درج بالا اشعار کی معنویت اور مفہوم آپ کو گرفتار سخن کرنے میں کامیاب رہے ہوں گے۔ ہمارے حسن ظن اور محترمہ کے اشتیاق کو بازیاب کرنے کا پتہ مندرجہ ذیل ہے جہاں "راگ راگ مٹی" نہایت ارزاں قیمت یعنی فقط پچاس ہندوستانی روپے کے عوض آپ سے ہم کلام ہونے کی آرزومند ہے۔ سائیہ دکاری: 35 فیروزشاہ روڈ' دہلی یا سوانی' منڈر مارگ' نئی دہلی' بھارت۔

ہاویہ

"جمیل احمد عدیل کئی اعتبار سے انوکھا کہانی کار ہے' فلسفہ' تصوف اور مغربی انشاپردازی اُس کی قوت بن سکتے ہیں مگر وہ اردو ادبیات کا ایسا اُستاد ہے جو ایک مخصوص نقطہ نظر رکھتا ہے اور واشگاف انداز بھی ۔جمیل احمد عدیل کے پاس مشاہدے کی قوت ہے' وسیع مطالعہ ہے' فلسفے سے لگاؤ ہے اور ذخیرۂ الفاظ کی بھی کمی نہیں جس کے باعث وہ اپنے تازہ افسانوی مجموعے "ہاویہ" میں اپنے قاری کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کرتا نظر آتا ہے"۔۔۔۔ڈاکٹر انوار احمد

"ہاویہ میں شامل افسانوں کا خمیر معاشرے کے تلخ اور سنگین حقائق سے اُٹھایا گیا ہے۔ یہ افسانے موجودہ دور کی بے ہنگم زندگی کے پریشان کُن مسائل اور آج کے انسان کے جذباتی فشار اور ذہنی انتشار کی مکمل طور پر ترجمانی کرتے ہیں"۔۔۔۔ڈاکٹر سید قاسم جلال

عصر حاضر میں عالمی افسانے کے بدلتے ہوئے معیارات اور پاکستانی افسانے کی صورت حال کو پیش رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ جمیل احمد عدیل کے افسانے ہمارے معاشرے کے بعض جدید اور منفرد پہلوؤں کو حقیقی انداز میں اجاگر کرنے میں کامیاب رہے ہیں"۔۔۔۔ڈاکٹر سید شبیہ الحسن

"ہاویہ کی کہانیوں میں بلاشبہ جمیل احمد عدیل نے اپنے جداگانہ انداز' طرز اور بیان سے ہمارے اردگرد پھیلے موضوعات' کردار اور روزمرہ صورت حال کو کہانیوں کا روپ دے کر ہمیں آئینے کے مقابل لا کھڑا کیا ہے"۔۔۔۔افتخار مجاز

جمیل احمد عدیل کے ہاں واقعہ محض پہیلی بنا نہیں رہتا' دانش پچ ماق ہو جاتا ہے۔ عمل کیا ہے اور ارادہ کیا؟ نئی اسطورا کے مقدر میں عبرت کی حکایت لینا ہی کیوں لکھ دیا گیا ہے؟ یہ جو آدمی معدوم ہو رہا ہے تو اس کے کیا معنی ہیں؟ جب قدموں تلے کی مٹی اُچھلنے لگتی ہے تو وجود کی تختی پر کیا نقش بنتے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جو جمیل احمد عدیل کے افسانوں میں ڈھل کر ایک بنیادی سوال کا حصہ ہو جاتے ہیں کہ یہ اس بار آدمی ہے کیا"۔۔۔۔محمد حمید شاہد

"ہاویہ" آج کے انسان اور اس کے گرد ہونے والی ہولناکیوں کی داستان کا ایسا منظرنامہ ہے جس میں ہمارے دور کا ہر چہرہ اور چہرے کی ہر لکیر میں ہماری تقدیر کی کہانی نہاں اور پنہاں ہے جسے پڑھنا' پڑھ کر سر دھننا تو جمیل احمد عدیل کا کمال ہے تئی' اس کے اندر چھپی حکمت کو سمجھنا اور سمجھ کر عمل کرنا آپ کا فرض بھی ہے"۔۔۔۔گلزار جاوید

صفحات دو سو سات مجلد قیمت دو صد روپے دستیابی کا پتہ: پورب اکادمی اسلام آباد

تیرا کراسنگ پر کھڑا آدمی

بھارت کے کثیر لسانی معاشرے میں اردو زبان نے جس سخت

جانی کا مظاہرہ کیا ہے اُس کی مثال دنیا میں کم کم ملتی ہے۔ اس سخت جانی میں جن لوگوں نے اپنا خونِ جگر شامل کر کے اس زبان اور ادب کو جاودانی عطا کی ان میں نام جناب دیپک بُدکی کا بھی ہے جن کے پاس انگریزی اور ہندی جیسے مضبوط اور ترقی یافتہ اظہار کے وسیلے دستیاب ہوتے ہوئے بھی اردو زبان اور اردو ادب کو اہمیت واولیت دینا اس زبان اور ادب سے اُن کے سچے عشق کی دلیل ہے۔ جناب دیپک بُدکی اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ عہدوں کے باوصف رہے اہلِ قلم ہیں جنھوں نے اردو زبان اور اردو افسانے کو ایک اعتبار ایک تقدس اور ایک مقام افتخار عطا کیا ہے۔ ''زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'' سے قبل جناب دیپک بُدکی کی دو افسانوی مجموعے ''ادھورے چہرے'' اور ''چنار کے پنجے'' اردو ادب کے تمام حلقوں سے اعتبار کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ جناب دیپک بُدکی نے اپنے تازہ افسانوی مجموعے ''زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'' میں اپنے تئیس افسانے شامل کئے ہیں جو برصغیر کے اہم جرائد میں شامل ہو کر اپنی اہمیت منوا چکے ہیں۔ جناب دیپک بُدکی کی اردو افسانے میں اہمیت وانفرادیت کی بابت اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ بُدکی صاحب باریک بین مشاہدے کے حامل ایسے تخلیق کار ہیں جو چیزوں کو دیکھتے تو اُن کے اصل رنگ میں ہیں مگر اپنے انداز میں کرتے ہیں۔ سخت سے سخت بات اور بری سے بری شکل بھی بُدکی صاحب کے قلم سے ادا اور بیان ہوتے ہوئے نرم وملائم اور خوش شکل ہو جاتی ہے۔ مثال کے لئے ہم ''چہارسو'' مئی جون 2006 میں شامل دیپک بُدکی کے افسانے ''سرحدیں'' کا ذکر کرنا چاہیں گے جس میں مصنف نے سرحد کی دونوں جانب بسنے والوں کو قدیم ہندی باشندے ثابت کرنے کے لئے جس قدر سخت استدلال پیش کیا اُسی قدر رنگین اور ملائم طرزِ تحریر اختیار کر کے اُسے نہ صرف سب کے لئے قابلِ قبول بلکہ دلچسپ بھی بنا دیا۔ اسی طرح اُنھوں نے اپنے دیگر افسانوں میں بھی تجربے اور مشاہدے کے عمدہ امتزاج سے اپنے قاری کو دلچسپ اور مفید مواد فراہم کیا ہے۔ ہماری رائے سے اتفاق کرنا نہ کرنا آپ کا حق ہے مگر اس سے قبل جناب دیپک بُدکی کا تازہ افسانوی مجموعہ ''زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'' حاصل کرنا اور زیرِ مطالعہ لانا ضروری ہے جس کے لئے آپ کو میزان پبلیشرز: بالمقابل فائر بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز، بٹہ مالو سری نگر سے رجوع کرنا ہوگا جہاں ''زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'' دوصد پچاس ہندوستانی روپے کے عوض دستیاب ہے۔

مسافتوں کی تھکن

- ''بقول ہنری لوبر، انسان میں علم کے تین سرچشمے ہیں عقل، ادراک اور تفکر۔''
- ''اور مسلمان تو ہیں ہی اس طرح کے۔ اپنے اسلاف کے کارنامے کتابوں کے قبرستان میں دفن کر کے ان پر فخر کرتے ہیں۔''
- ''اُنھوں نے بہت عقیدت سے راشد کی تصویر کو بوسہ کیا اور زیرِ لب بولیں 'لو راشد آج میں نے اپنی پہلی محبت دفن کر دی۔'''
- ''آپ جانتی ہیں؟ آسکر وائلڈ کے بقول محبت کا ایک گھنٹہ سو برس کی بے محبت زندگی سے بہتر ہے۔''
- ''وہ دیوار کی طرف منہ کئے چپ چاپ لیٹی تھیں اور ذہن کی سکرین پر مسلسل ماضی کی فلم چل رہی تھی۔''
- ''فرحاد! آپ کیوں سوچتے ہیں کہ میں اپنے فیصلے پر پچھتا رہی ہوں یا مجھے کوئی یاد آ رہا ہے؟''
- ''جی میں کہہ رہی ہوں 'مشرق والے جس سے محبت کرتے ہیں اُس کا احترام اور تقدس قائم رکھتے ہیں۔''
- ''کوئی بات نہیں مجھے سگریٹ کا دھواں برا نہیں لگتا بلکہ کچھ بھولی بسری یادیں جاگ اُٹھتی ہیں۔''
- ''مس انیس اپنے ذہن کے بند گنبد سے باہر نکلئے اور دیکھئے دنیا کہاں جا پہنچی ہے۔ آپ کیوں خود کو روایتوں کی زنجیر میں قید کئے بیٹھی ہیں۔''
- بس میری ناک کٹنی تھی کٹ گئی۔ اب مجھے کیا پتہ کون کس رنج میں گیا ہے۔''

محترمہ عذرا اصغر نے اردو افسانے میں مشرقی تہذیب، روایت اور مشرقی اقدار کو جس سلیقے اور ہنرمندی سے برتا ہے اُس سے اردو ادب کا قاری بخوبی آگاہ ہے ''مسافتوں کی تھکن'' محترمہ کا تازہ معاشرتی ناول ہے جس میں مصنفہ نے نہایت بردباری سے ہلکے پھلکے مگر دلچسپ انداز میں معاشرے میں مروج اُن برائیوں کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے جن کی جانب یا تو ہم جان بوجھ کر توجہ دینا نہیں چاہتے یا اُن کے سبب پھیلنے والی سماجی اُلجھنوں سے ناآشنا ہیں۔ بلاشبہ عذرا اصغر کا تازہ ناول ''مسافتوں کی تھکن'' ہمارے معاشرے کی گھٹن، بے چینی اور فرسودہ روایات کو اجاگر اور نمایاں کرنے کا ایک عمدہ ذریعہ ہے مگر اُس میں قاری کی دلچسپی کے وہ تمام لوازمات موجود ہیں جو ایک مشرقی اور معاشرتی ناول میں ہونا چاہیے۔ ناول کا پلاٹ، کردار اور مکالمے مصنفہ کی گرفت میں رہتے ہوئے اپنے اپنے مقام پر نہایت موزوں اور چست ہیں ایک بار ناول کو شروع کرنے کے بعد آپ چاہتے ہوئے بھی خود کو اُس سے الگ نہیں کر سکتے۔ تفصیل یا خلاصہ بیان کر کے ہم اُس لطف کو ضائع کرنا نہیں چاہیے جو مصنفہ نے کئی برتوں کی مشقت اور ریاضت کے بعد کتابی شکل میں پیش کر کے معاشرتی ناول کے باب، آپ کے لئے مہیا کیا ہے ''مسافتوں کی تھکن'' دوسو سولہ صفحات مجلد پر مشتمل ہے جو عزیز پبلشرز اردو بازار لاہور سے دوسو پچاس پاکستانی روپے کے عوض دستیاب ہے۔

بی ۔ایس ۔جین جوہرؔ

(فن اور شخصیت)

بی ۔ایس ۔جین جوہر (فن اور شخصیت) سے روایسے جواہر پارے جڑے اور جڑے ہوئے ہیں جن کی آب و تاب اپنی اپنی جگہ اہم بھی ہے ور مسلم بھی۔قلم اور زبان کے توسط سے لفظ سات دہائی ادا اور تحریر کرنا کس قدر آسان نظر بتانا اور نبھانا اُسی قدر مشکل ہے۔جناب بی۔ایس ۔جین جوہر سیماب سکول کے اپنے قابل اعتبار نمائندہ سخن ہیں جو کم وبیش سات دہائیوں سے اس زبان بلیغ اور کلام حلیم کی خدمت میں مصروف ہیں۔قدرت نے جس فیاضی اور فراخ دلی کے ساتھ انھیں دنیاوی نعمتوں سے سرفراز کیا ہے جوہر صاحب نے اُسی قدر ان سے بے اعتنائی برتی ہے۔زندگی کے تمام ادوار جن میں قدرت کی عطا کردہ لذتوں سے حظ اُٹھایا جا سکتا تھا جین جوہر صاحب نے شعر وسخن کی نظر کر کے وہ مقام آفرین حاصل کر لیا ہے۔جس پر آج اردو ادب کے بے شمار حلقے رشک بھی کرتے ہیں اور فخر بھی۔اردو شاعری پر حسن وعشق کا الزام لگانے والے جین جوہر صاحب کی نسبت اس لئے بھی شیفتگی کے جذبات رکھتے ہیں کہ جوہر صاحب نے مایوس تو اس موضوع لطیف کو بھی نہیں کیا مگر ملی اور قومی شاعری کو جس قدر توجہ اور انہماک سے اہمیت دی ہے اُسکو نہ سراہنا اُس کی جانب سے سرسری گذر جانا جین جوہر صاحب سے زیادہ اپنے اور اپنی زبان کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہے۔اب یہاں اُس عقاب جوہری کا ذکر لازمی ہے جس نے اردو ادب کے اس گوہر نایاب کو فن وشخصیت کی تشتری میں سلیقے اور قرینے سے پیش کر کے موجودہ اور آنے والے زمانوں کے لئے اہم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔جی ہاں! اور میں ڈاکٹر، حافظ خالد حسین مہندی، صدر شعبہ اردو چودھری میرن سنگھ یونیورسٹی (میرٹھ، یوپی) انڈیا۔ڈاکٹر صاحب ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ نامور مصنف اور جید نقاد بھی ہیں جس کا ثبوت آپ نے زیر نظر کتاب میں صفحہ اول تا آخر فراہم کیا ہے۔سب سے اول وزیر اعظم ہند کا تحسین نامہ بابت جین جوہر صاحب ازاں بعد محمد حسین کھیانوی ایڈووکیٹ، بشیر بدر صاحب، خلیق انجم صاحب ور رئیس صدیقی صاحب کے تحسینی پیغامات ہیں۔تعینی کے عنوان سے ڈاکٹر خالد حسین کی تحریر نہ صرف جین جوہر صاحب بلکہ اردو زبان وادب کی بابت بڑی مفید، مدلل اور معرکی ہے۔مضامین کے باب میں جناب مظہر امام، جناب عبد القوی دسنوی، محترمہ صغریٰ مہدی، جناب رفعت سروش، ڈاکٹر یونس نمازی، ڈاکٹر اسلم نیدی، احمد سحر شاہجہاں پوری، ڈاکٹر رضیہ حامد، اختر شاہجہاں پوری، مولانا سید قمر شاہجہاں پوری، مولانا سید عقیل الغروی، جناب متین طارق، محترمہ انور زہت، جناب فصیح اکمل قادری، ڈاکٹر ثروت خان، ڈاکٹر مجاہد فراز، جناب اطہر نیر، جناب وجیندر سنگھ پرواز، جناب یوسف ناظم، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، جناب محمد ایوب واقف، ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ، ڈاکٹر امام اعظم، جناب سیفی سرونجی، جناب اقبال انصاری، شری کلدیپ گوہر اور سید امتیاز الدین وغیرہم۔مراسلت کے باب میں جو شخصیات نمایاں ہیں اُن میں پروفیسر تحقیق اللہ، جناب افتخار امام صدیقی، جناب شباب للت، جناب محسن بھوپالی اور جناب ندا فاضلی۔"جی۔ایس۔جین جوہر" (شخصیت اور فن) دوسو چوبیس صفحات مجلد پر مشتمل ہے اور نرالی دنیا پبلیکیشنز: بازار دہلی گیٹ، دریا گنج، دہلی، بھارت پر دوصد ہندوستانی روپے کے عوض دستیاب ہے۔

باتیں حسن یارکی

''غزلیں اُنھوں نے گنتی کی لکھی ہیں مگر اُن کے پس منظر میں گویا سارے کلاسیکی اُردو ادب کی روایت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ چراغ حسن حسرت کی غزل ایسی ہوتی ہے کہ جب تک سننے والا اپنی شعری میراث سے کما حقہٗ آگاہ نہ ہو اُن کے اشعار کا لطف نہیں اٹھا سکتا''۔۔۔عابد علی عابد

''انھوں نے بہت کم غزلیں لکھیں اس کے باوجود اُن کے بعض مصرعوں کا ضرب الامثال کی حیثیت حاصل کر جانا اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ قادر الکلام شاعر تھے''۔۔۔احمد ندیم قاسمی

''مولانا چراغ حسن حسرت اردو کے صاحب طرز ادیب اور روزانہ کالم نگاری میں امام کا درجہ رکھتے تھے۔وہ بے حد شگفتہ نثر اور دلکش نثر لکھا کرتے تھے جس باعث اُن کے اندر کا شاعر اُس طور نہ ابھر سکا جس طور اُبھرنا چاہیے تھا۔شعر انھوں نے کم کہے مگر خوب کہے''۔۔۔سید ضمیر جعفری

''ڈاکٹر طیب منیر نے چراغ حسن حسرت کی زندگی اور تحریری کارناموں پر مبسوط اور مستند کام کرنے کے ساتھ ماضی کی گرد میں گم ان کے منتشر کلام کو بڑی محنت وکاوش سے یکجا صورت میں مرتب کر کے بے حد وسیع ادبی و تحقیقی خدمت سرانجام دی ہے''۔۔۔پروفیسر جلیل عالی

تازہ تخالیق کے تعارف میں' اردو ادب کی حد تک ٹیپ ٹاپ جملے اور ترا کیب اکثر استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ ہماری کوشش البتہ یہ ہوا کرتی ہے کہ کتاب اور صاحب کتاب کی بابت' احباب علم کی رائے کو اولیت واہمیت دے کر تصویر کو جامعیت کے ساتھ آپ کے روبرو اس طرح پیش کیا جائے کہ اُس میں تازگی اور توانائی کا تاثر ضرور موجود ہو۔بات اگر چراغ حسن حسرت جیسے جواں کار اور ہر دم تازہ دم قلم کار کی نسبت کی جائے تو تازگی اور توانائی کے طاقتور جھونکے خود بہ خود آپ کی جانب رواں دواں ہو جاتے ہیں اگر گفتگو کا موضوع پروفیسر طیب منیر جیسے دُھن کے پکے اور لگن کے مضبوط آدمی کی کاوش کا ہو تو قلم اور قلم کار دونوں شگفتگی کے احساس سے سرشار ہو جاتے ہیں۔یہاں پہنچ کر اصل میں گفتگو کا آغاز ہونا چاہیے کہ پروفیسر طیب منیر صاحب نے کس طرح خون جگر کے چراغ جلا کر جناب چراغ حسن حسرت کی بابت جستجو اور تحریک کا درخشاں باب رقم کیا ہے۔ہماری رائے میں مناسب یہ ہے کہ آپ اس ماہر جوہری کے تلاشے اور تراشے ہیرے کی نہ صرف جانچ پرکھ کریں بلکہ اُن کے اس نادرو نایاب کارنامے پر جس قدر بھی ممکن ہو سکے دردو تحسین کا حق دار بھی ٹھرائیں تاکہ پروفیسر صاحب آپ کی عطا کردہ توانائی کے طفیل کسی اور فراموش کردہ گوہر نایاب کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا کر اردو ادب میں ایک اور سنہرا باب رقم کر سکیں۔''باتیں حسن یار کی'' کل ایک سو اٹھانوے صفحات' مجلد کی حامل ہے' جس کی قیمت ایک سو پچانوے روپے اور دستیابی کا پتہ' پورب اکادمی' اسلام آباد ہے۔

سرو و فکر

اصناف سخن میں رباعی سب سے زیادہ مشکل صنف ہے یہی وجہ ہے کہ شعرا کی اکثریت اس صنف سخن پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ہچکچاتی ہے۔ عروض پیچیدگیوں اور فنی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا مشکل مرحلہ ہوا کرتا ہے۔ جناب سرور انبالوی' اردو شاعری کے تمام اصناف سخن میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کے بعد رباعی جیسی جان لیوا صنف سخن پر توجہ مبذول کی ہے۔سرور انبالوی صاحب منافقانہ رویوں اور تعلقات عامہ سے بالاتر اور خاموشی سے شعرو ادب کی خدمت میں مصروف ایسی بے نیاز شخصیت کے مالک انسان ہیں کہ جن سے محبت وعقیدت کرنے والوں کا شمار نہ صرف پاکستان بلکہ بھارت اور برطانیہ تک پھیلا ہوا ہے۔آج کی محفل میں ہماری خواہش ہے کہ ہم اور آپ مل کر محفل رباعی میں جناب سرور انبالوی کا استقبال کریں اور اُنھیں فراخدلانہ مبارکباد بھی پیش کریں''۔۔۔قمر رئیس

چڑھتے ہوئے سورج کی ضیا ہیں ہم لوگ
جلتے ہوئے صحرا میں صبا ہیں ہم لوگ
سودا نہ اصولوں پہ کبھی ہم نے کیا
مظلوم کی ہر آن نوا ہیں ہم لوگ

بلبل کا ترانہ ہے نہ کوئل کی صدا
پھیلا ہے فضاؤں میں عجب سناٹا
رعنائی گلشن بھی ترے ساتھ گئی
ہر شخص نظر آتا ہے تنہا تنہا

پیچیدہ سراسر ہے نظام ہستی
ہے عارضی دنیا میں قیام ہستی
بھولے ہوئے ہیں مقصد ہستی کو سرور
چھن جائے گی اِک روز زمام ہستی

سرور انبالوی صاحب کے ذاتی لطف وکرم سے یہ قدر شوق سیرابی کے لئے' گلی نمبر 7، ڈھیری حسن آباد' راولپنڈی سے رابطہ لازمی ہے جہاں ''سرو و فکر'' بہ قیمت یک صد پچاس روپے آپ سے ہم کلام ہونے کو بیتاب ہے۔

عالمی اردو ادب

''میں نے آج تک عالمی اردو ادب کے جتنے بھی خاص نمبر شائع کیے وہ مالی تعاون اور مدد کے بغیر ہی کئے ہیں۔ میں کبھی کسی ادارے یا انجمن سے

مالی امداد لینا پسند نہیں کرتا نہ اُن تھرڈ اور سیکنڈ گریڈ ادیبوں سے واسطہ رکھتا ہوں جو ایک تشہیر کے لیے بڑی بڑی رقم جیبوں میں بھر بھر کے پھرتے ہیں۔ آپ نے پیش نظر عالمی اردو ادب کا یہ خاص شمارہ بھی کسی طرح کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر نہیں بلکہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی قد آور اور بین الاقوامی حیثیت کی خدمات کے اعتراف میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اس بات میں ذرہ برابر شک کی گنجائش نہیں کہ آج تحقیق وتنقید کی دنیا میں نارنگی صاحب وہ واحد شخصیت ہیں جن کا پوری اردو دنیا میں دل سے احترام کیا جاتا ہے۔ اس سے قبل بھی آپ کی نظر سے جناب نارنگ کی نسبت بے شمار خاص نمبر اور اشاعتیں یقیناً گذری ہوں گی اس کے باوجود عالمی اردو ادب کے اس خاص شمارے کی بابت آپ کی رائے جاننے کی خواہش دل میں موجود ہے"۔۔۔۔ نند کشور کرم

اس بات میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں کہ آج تک اردو دنیا میں جس قدر احترام محبت اور ہر دلعزیزی پروفیسر گوپی چند نارنگ کو دستیاب ہے اس سے پہلے کسی کے حصے میں نہ آئی تھی۔ درست یہ بات بھی ہے کہ آج تک جتنے انٹرویو گوشے اور خاص نمبر نارنگ صاحب کی شخصیت وفن پر نکلے ہیں اس کی بھی اس سے پہلے نظیر نہیں ملتی۔ ہوسکتا ہے نارنگ صاحب کے ناقدین ان کی نسبت کثرت اشاعت کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوں۔ ایسے احباب کی خدمت میں یہی عرض کیا جاتا ہے کہ سمندر کی گہرائی اور گیرائی جس قدر بھی جانچی اور پرکھی جائے اسی قدر اُس کے اندر سے نئے خزانے اور نئی دریافت برآمد ہوتی ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب، علوم وفنون کا ایسا سمندر ہیں کہ جس کے اندر جستجو، تحقیق اور اشتیاق کے بے پناہ دفینے محفوظ ہیں۔ تلاش جس قدر وسیع ہوگی دریافت اُس قدر بیش قیمت اور نایاب ہوگی۔ آپ کے دل میں بھی یقیناً پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب جیسے سمندر علم سے سیراب ہونے کی آرزو انگڑائی لے رہی ہوگی جس کی تسکین کے لئے اولین فرصت میں عالمی اردو ادب کے مدیر جناب نند کشور کرم سے ذیل کے پتے پر رابطہ کیجئے جہاں فقط تین صد ہندوستانی روپوں کے عوضیہ بیش قیمت دستاویز آپکی دسترس میں آسکتی ہے۔

F.14/21/D، کرشن نگر، دہلی 110051، بھارت

"چلو جاپان چلتے ہیں"

○ ''استقبالیہ کلمات کے بعد سب سے پہلے کچھ طلبہ نے کورس کی شکل میں مشہور پاکستانی فلمی گیت ''جان بہاراں رشک چمن، اے جانِ من'' پیش کیا جس کا ایک مقصود شائد یہ تھا کہ اوساکا یونیورسٹی والے اردو فارسی کے تاریخی رابطوں سے بخوبی واقف ہیں۔''

○ ''وارد حسینہ نے جو اپنی وردی سے سیلز افسر لگ رہی تھی، پیچھے پیچھے آنے کو کہا اور خراماں خراماں چلتی ہوئی بائیں جانب واقع ایک کمرے میں داخل ہوکر پہلے سے بھی زیادہ دوستانہ مسکراہٹ سے گویا ہوئیں۔''

○ ''ہمارا ہوٹل [illegible] ڈاؤن ٹاؤن یعنی پرانے شہر میں واقع تھا جس کے اردگرد بہت سے نائٹ کلب بھی تھے یوں اُسے ''بازارِ حسن'' بھی کہا جاسکتا تھا۔''

○ ''زیادہ تر یہی موضوع زیر بحث رہا کہ پردیس میں غیر مانوس خوراک، ذائقے، حلال وحرام اور ذبیحے کے مسائل کا حل نکالا جائے۔ حاضرین کی کثرت بسم اللہ پڑھ کر، مجبوری میں کسی بھی جانور کا گوشت کھانے کی حامی تھی جبکہ کچھ لوگ اسے حرام قرار دے رہے تھے۔''

○ ''مشاعرے کے بعد کھانا کورین ریستوران میں تھا جس کی انفرادیت تھی کہ ہر میز کے درمیان ایک برقی انگیٹھی نصب تھی۔ آرڈر کے مطابق کچا لیکن سلیقے سے کٹا ہوا مچھلی اور گائے کا گوشت لاکر دیا جاتا جسے گاہک خود آگ کے اوپر رکھی جالی پر سینکتا، پکاتا اور کھاتا تھا۔''

○ ''اوساکا سے ہمیں جاپان کی مشہور ''بلٹ ٹرین'' کے ذریعے ٹوکیو واپس آنا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے نام کی مناسبت سے گولی کی رفتار یعنی تین سو کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ جلد ہی چھ سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی ٹرین چلانے پر بھی کام ہورہا ہے۔''

○ ''جاپانی قوانین کے مطابق جاپان میں رہائش رکھنے اور کاروبار کرنے کے لئے جاپانی بیوی کا ہونا ضروری ہے سو معدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر سب نے مقامی عورتوں سے شادیاں کررکھی ہیں اور بیشتر ایک ٹکٹ میں دو مزے لے رہے ہیں۔''

○ ''جاپانی بزرگ نے کہا کہ تحفے کی رسید میں تم سے اس لئے مانگ رہا ہوں کہ بطور غیر ملکی تم نے اس پر ٹیکس ادا نہیں کیا، بطور جاپانی پہلے میں اس پر ٹیکس ادا کروں گا پھر اسے استعمال کرنے کا حق دار ہوں گا۔''

مذکورہ بالا اقتباسات جناب امجد اسلام امجد کے سفرنامہ ''چلو جاپان چلتے ہیں'' سے بلا کسی تبصرے، تعارف اور تمہید کے آپ کی نذر کئے جا رہے ہیں کیونکہ جناب امجد اسلام امجد ان تمام تکلفات سے قطعی طور پر ماورا اور بے نیاز ہوچکے ہیں۔

صفحات دوصد ستائیس مجلد معہ آرٹ پیپر پر رنگین تصاویر، قیمت تین سو دس روپے، دستیابی، دوست پبلی کیشنز، پلاٹ [illegible]، سٹریٹ [illegible]، آئی۔ نائن۔ ٹو، اسلام آباد

رس رابطے

(جستجو، ترتیب، تدوین)

وقار جاوید (راولپنڈی)

برادرم گلزار جاوید صاحب زاد لطفہٗ

آپ سے، اور آپ کی معرفت 'چہارسُو' سے اور عزیزم وقار جاوید سلمۂ سے تعارف ہوا۔ کئی مہینے ای میل اور ڈاک کے ذریعے، کمال کا رابطہ رہا۔ پھر ۹ سے ۱۲ فروری کے دوران آپ سے دو (تشنہ) ملاقاتیں بھی رہیں۔ اگرچہ اُن دنوں آپ اپنے عزیزوں پیاروں کے معاملات میں کافی مصروف اور فکر مند تھے۔ مگر اپنے اِس دوست سے اور عزیزان مُنیس مرزا اور سید مظہر جمیل صاحبان سے ملنے، آپ کو بہر حال آنا تھا، سو آپ تشریف لائے۔ کیا عرض کریں؛ مختصر یہ کہ، وضع داریاں ہیں آپ ایسے مہربان کی، جو ہم سے گوشہ گیروں کو نوازتی رہتی ہیں۔ 'چہارسُو' کا وہ شمارہ جو اوّل اوّل ہمارے آپ کے رابطے کا سبب بنا تھا، کراچی پہنچ چکا تھا؛ تاہم آپ تشریف لائے تو اور بھی کا پیاں عطا کر دیں۔ اپنے تو مزے آ گئے۔ قریب و دور اپنے دوستوں، نیاز مندوں کو بھیج رہے ہیں اور آپ کے حصّے کی داد بھی خود ہی سمیٹ رہے ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اِس گوشہ گیر لکھاری، ام ح پر آپ نے کیا کمال کا خاص گوشہ ترتیب دیا ہے۔ آپ اور آپکے ایسوسی ایٹ، وقار میاں طاہر، مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سبحان اللہ۔ 'قرطاس اعزاز' سے لے کر 'رُو براست' اور محبت کرنے والوں بزرگوں کے منتخب خطوط اور اس شمارے کے 'لے آؤٹ' تک سبھی کچھ بے مثال ہے۔ بعض سوالات تو مجھ ایسے بے دھڑک آدمی کو بھی چکرا دینے والے لگے ہوں گے۔ تاہم (آپ کے تیکھے انداز کی داد دینے کے ساتھ) اس بات کی داد بہر حال چاہوں گا کہ آپکے اس دوست نے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے کسی 'چالاکی یا گریز' سے کام نہیں لیا۔ (آداب عرض کرتا ہوں۔) 'رُو براست' کی پہلی جلد جو آپ نے عطا کی تھی میرے مطالعے میں ہے۔ کیا انٹرویوز ہیں! سبحان اللہ! پڑھتا جاتا ہوں، واہ واہ کہتا ہوں اور دعا کو ہوں۔ یہ بڑا بے مثل کام کیا ہے آپ نے۔ عام قاری اور ریسرچ اسکالروں کے لیے ایسا اچھا اور منضبط کام میری نظر سے ابھی تک نہیں گذرا تھا۔ خدا آپ کو ہمت اور حوصلے اور صحت سے نوازتا رہے۔ پرسانِ حال کو دعا اور سلام۔

اسد محمد خاں (کراچی)

برادرم عزیز گلزار جاوید' خوش رہیے!

چند روز پہلے نیا ''چہارسو'' مجھے مل گیا تھا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ اتنا اچھا رسالہ مجھے باقاعدگی سے عین وقت پر مل جاتا ہے اور اس کے مطالعہ کے دوران گویا آپ کی رفاقت کا احساس بھی جی لیتا ہوں۔ میرے بعض دوست بھی بار بار اِسے پڑھنے کے لئے لے جاتے ہیں۔ 'اوراق' کے بند ہونے کے بعد آپ کے علاوہ ایک 'تخلیق' آ جاتا ہے اور کراچی کا ''روشنائی''۔ اس محبت بھری توجہ کے لئے آپ لوگوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ میں نے اِدھر کئی ماہ سے۔ شاید ایک ڈیڑھ سال سے کچھ بھی نیا نہیں لکھا۔ آپ جیسے بعض عزیز دوستوں کو ایک اپنی کہانیاں ہی دے پاتا ہوں اب خالی ہاتھ شرمندہ سا ہو کے رہ جاتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ مطالعے کے لئے وقت کھلے کھلے مل جاتا ہے۔ یہ بھی نہ ہو تو جان پر بن جائے

جوگندر پال (دہلی، بھارت)

برادرم گلزار جاوید صاحب!

سلام مسنون۔ پچھلے دنوں بریڈفورڈ (لندن) کے افسانہ نگار مقصود الٰہی شیخ نے آپ کے انٹرویوز کی کتاب پڑھی تو انہیں معلوم ہوا کہ ڈیرہ غازی خان میں 1942ء میں شیخ منظور الٰہی (جو ان کے بڑے بھائی تھے) کے پڑوس میں مجھے رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ انہوں نے فون پر بتایا کہ منظور الٰہی مرحوم کے ایک صاحبزادے ظفر منظور جو میرے بچپن کے دوست تھے' اب لاہور میں آباد ہیں۔ نصف صدی سے زیادہ عرصے کے بعد ظفر منظور کا سراغ آپ کے انٹرویو سے لگا۔ آپ کی کتاب تو ''شرلک ہومز'' سے بھی سبقت لے گئی' مبارکباد برادرم حقیقت یہ ہے کہ آپ کے انٹرویوز اب حوالے کی کتاب بن گئے ہیں' پچھلے دنوں مجھے بانو قدسیہ پر کام کرنے کا موقعہ ملا تو اس کتاب نے بڑی معاونت کی۔ ایم اے' ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبا کی اب کثرت ہو گئی ہے۔ انہیں اپنے کام کا بہت سا مواد آپ کی کتاب سے ملتا ہے۔ آپ نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ آپ اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی چھاپ رہے ہیں؟ اب اس میں کیا تاخیر ہے؟ اسے صدقہ جاریہ سمجھ کر جلدی شائع کر دیں۔ اردو دنیا آپ کی شکر گزار ہو گی۔ سجاد نقوی صاحب نے فون پر بتایا کہ نہیں چہارسو کا نیا پرچہ مل گیا ہے۔ جس میں آپ نے مجھے بھی نمائندگی حاصل کرنے کا شرف عطا کیا ہے۔ لیکن تازہ پرچہ مجھے نہیں ملا۔ کیا دوسری بار بھیج سکیں گے؟ سجاد نقوی صاحب کی اطلاع کے بعد اشتیاق ہزار چند ہو گیا ہے۔ یہ عریضہ ایک خاص مقصد کے لیے لکھ رہا ہوں۔ میں ان دنوں ڈاکٹر وحید قریشی پر کام کر رہا ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ آپ نے ان کے فکر و فن اور شخصیت پر چہارسو کا ایک نمبر شائع کیا تھا۔ شاید یہ بھی مجھے نہیں ملا۔ ڈاک میں گم ہو گیا ہوگا۔ ازرہ کرم اس پرچے کی ایک کاپی بھی عنایت فرمائیں۔ اور اس خط کو S.O.S سمجھیں۔ اس تکلیف کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ محترمہ بانو قدسیہ پر میں نے کتاب مکمل کر لی ہے۔ آپ کے تعاون کا شکر گزار ہوں۔

انور سدید (لاہور)

محترم گلزار جاوید صاحب! اسلام علیکم

یہ لیجئے اِس بار آپ نے چہارسو کا قرطاس اعزاز اسد محمد خاں کے

نام نکال ڈالا۔ سبحان اللہ۔ اسے پڑھ کر مجھے پہلا سبق یہ ملا کہ جو افراد واقعی قدرت کی طرف سے لکھنے پڑھنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں انھیں کچھ تلاش نہیں کرنا پڑتا۔ اُن کے اِردگرد ہی اتنے نئے نویلے انوکھے اور اُس کے ساتھ ساتھ کرب ناک حقائق بکھرے پڑے ہیں کہ اگر ذرا آنکھ کھول کر انھیں اپنا موضوع بنالے تو بہت کچھ کمال دکھایا جاسکتا ہے اور نام بھی کمایا جاسکتا ہے۔ اِدھر کچھ کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ اِسی فکر میں لگے رہتے ہیں کوئی نئی بات کہی جائے۔ اور اُن کی ہزار فکر کے باوجود وہ کچھ نہیں کہہ پاتے۔

مشکور حسین یاد (لاہور)

برادرم گلزار جاوید صاحب سلام علیکم

ڈاکٹر بکل (دہلی) کے توسط سے چہار سو کا تازہ شمارہ مل گیا۔ شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر بکل کو بھی شکریے کا خط لکھ دیا ہے۔ میں نے گوشۂ اسد محمد خاں' میں شامل ہر تحریر کو جی لگا کر پڑھا۔ خاں صاحب ہمارے اہم ترین نمائندہ لکھنے والوں میں بڑا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کی ہر تخلیق خواہ وہ نثری ہو یا شعری قاری کو متاثر اور متحیر کیے بغیر نہیں رکھتی۔ اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ آپ نے اس کی جس خواہش' آرزو' التجا سے شمارہ ترتیب دیا ہے اُسے شرف قبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔ میری تمام تر نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔۔

فضیل جعفری (ممبئی بھارت)

گلزار بھائی' خوش رہو

کئی بار آپ کو خط لکھنے کی کوشش کی مگر کوئی نہ کوئی مداخلت ہوتی ہی رہی۔ اور آپ کو' چہارسو' کی رسیدگی کی اطلاع بھی نہ کرسکا۔ جو بابت ماہ جنوری فروری 2008ء مجھے کئی ہفتے قبل دستیاب ہوا۔ اور یہ بے حد خوشی کا مقام ہے کہ اِس بار آپ کا نشانہ' جناب اسد محمد خاں' افسانہ نگار رہے۔ میں نے اس سے قبل نہیں سہ ماہی بادبان میں پڑھا تھا۔ اور پسند بھی کیا۔ جناب محمد اقبال بھٹی کی نظم 'اپنے پیارے وطن کے نام' جس کا ایک ایک لفظ آنسوؤں اور درد میں لپٹا ہے۔ پڑھتے پڑھتے آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ اِس طرح کے خیالات کا اظہار وہی شخص کرسکتا ہے جو اپنے وطن سے والہانہ پیار کرتا ہو کاش ان کے دل کی پکار اُن کے وطن کا ہر شخص سن سکے اور محسوس کرسکے۔ ڈاکٹر رینو بہل کی سسٹر کی لڑکی' اچھی لگی۔ نیلین مرزا کا مضمون' نئی زمین' نئے آسمان' تراشتا ہوں' باوجود طویل ہونے کے پسند آیا۔ اس مرتبہ جابجا غلطیاں در آئیں جسکے باعث اچھا شعر بھی بے مزہ سا ہو کر رہ گیا۔ حصہ نعت' نظم ونثر خوب ہے۔ غالب عرفان کی نظم روح قائد کا پیغام خوب ہے۔ قیصر نجفی کی نظم' ایک شام' اچھی لگی۔ آجکل اس قسم کی نظمیں خال خال ہی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ جسمیں احساس کی ترجمانی ہو۔ اور آپ کا پراؤ راست حسب معمول اچھا لگا۔

یوگیندر بہل تشنہ (دہلی بھارت)

برادر محترم گلزار جاوید

''چہار سو'' برابر موصول ہو رہا ہے جس کے لئے انتہائی ممنون ہوں۔ اس مرتبہ آپ نے ''اسد محمد خاں'' سے قارئین چہار سو بلکہ ادب دوست حلقوں کو متعارف کراکے بہت بڑا ادبی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اُن کے نام اور کلام سے ادبی حلقے کافی حد تک ناواقف تھے اور وہ خود بھی ''ستائش'' کے خوگر نہیں ایسے لوگ ہمارا ادبی اثاثہ ہیں جو ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا'' سے بے نیاز ادب اور فن کی آبیاری اپنے خون جگر سے کررہے ہیں۔ یہ آپ کا زندہ ادبی کارنامہ ہے کہ ایسے ستھرے فنکاروں سے متعارف کراتے رہتے ہیں اور خود گوشۂ گمنامی میں رہنے میں عافیت سمجھتے ہیں۔ اِس قسم کی شخصیات کو گوشۂ گمنامی سے منصۂ شہود پر لانے کا سہرا آپ جیسے ادب دوست حضرات کے سر ہے اللہ تعالیٰ آپ کے ارادوں کو استقامت عطا فرمائے

سرور انبالوی (راولپنڈی)

مکرمی تسلیم!

چہارسو کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اسد محمد خاں پر آپ نے بہت اچھا گوشہ ترتیب دیا ہے۔ ان کے افسانوں میں جو گہرائی اور وزن ہے وہ چیز دیگر کی حیثیت رکھتا ہے۔ آجکل کے بہت کم افسانہ نگار کسی خاص افسانے میں اتنی گہرائی تک اترنے کی ہمت مہیا کرپاتے ہیں۔ اس کا تازہ ثبوت ان کا افسانہ 'ئی دادا ہے جس کی نہ صرف بُنت بہت مضبوط ہے بلکہ آخری حصہ بھی ایک نئی تہذیبی فکر کا مظہر ہے۔ باقی معاملہ آپ کے دلچسپ اور پرخیال انٹرویو نے پورا کردیا ہے۔ فاری شانے جو خطوط مرتب کئے ہیں وہ ان پر سنہ اور تاریخ نہ ہونے سے عجب طرح کا التباس ہوتا ہے۔ ان خطوط میں تاریخ تو ہونا ہی چاہئے تھی۔ اسد محمد خاں کی نظموں میں کسی خاص تخلیقی قوت کا احساس نہیں ہوتا۔ بس صرف ایک نظم 'تو پھر یہ دیکھا'' مجھے پسند آئی۔ ممکن ہے یہ میری نظر ہی کا قصور ہو۔ صفحہ چار پر اسد محمد خاں نے WITH DUE APOLOGY لکھا ہے۔ کیا وہ اس کو معذرت کے ساتھ نہیں لکھ سکتے ہیں؟ انگریزی سے یہ مرعوبیت کہاں تک ہمارے ذہنوں سے چپکی رہے گی؟ محسن احسان میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ بہت شعر عمدہ نکالا ہے

خورشید نہ مہتاب ، نہ جگنو نہ ستارہ
جینے کی ہوس دل میں لئے مرگئے ہم بھی

مشکور حسین یاد کی بہت لمبی ردیف ''کی آنکھوں میں آنسو ہیں'' والی غزل کوئی تاثر نہیں چھوڑ سکی۔ میں نہیں سمجھتا کہ غزل میں اگر صرف قافیہ اور ردیف ہی ہو اور باقی کچھ نہ ہو، تو اس سے کوئی اچھی غزل نکل سکتی ہے۔ اساتذہ نے تین الفاظ سے زیادہ لمبی ردیف کو مستحسن نہیں مانا ہے۔ شبنم شکیل، مامون ایمن، کرشن کمار طور اور ڈاکٹر انور سدید کی غزلیں خوب بلکہ بہت خوب ہیں۔

خدا اب ہے، خدا پہلے نہیں تھا
تو کیا اچھا برا، پہلے نہیں تھا۔

طور

اس شمارے میں اور بھی بہت کچھ لائق مطالعہ ہے۔ چہارسو واقعی دورِحاضر کا ایک دلچسپ اور اہم ادبی رسالہ۔

نامی انصاری (کانپور،بھارت)

بھائی گلزار جاوید صاحب سلام محبت!

دو روز قبل آپ کا ''چہارسو'' (بنام شہریار) جسے آپ نے میری خواہش کی تکمیل میں ارسال فرمایا تھا موصول ہوا تو تب سے اب تک کسی دلچسپ ناول کی طرح اس کے مطالعے میں غرق ہوں۔ میرے علم کے مطابق شاید ''چہارسو'' کا یہ پہلا شمارہ ہے جس میں صرف ایک شاعر (یعنی نابغہ شاعر) کے حوالے سے اتنی تفصیل اکٹھا کردی گئی ہے کہ شاید ہی اس کی شاعرانہ شخصیت کی کسی جہت پر کوئی زاویہ اظہار کا رخ روشن حاصل نہ کر سکا ہو۔ بات یہ نہیں کہ انہیں موجودہ عہد کے ادبی مشاہیر نے خوبصورت ترین الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا بلکہ ہر نامور نقاد نے انہیں بصد احترام سراہا ہے اور کیوں نہ سراہے کہ شہریار کی شاعری یقیناً۔۔۔۔''عصر حاضر کی بے کیف اور بے رس شاعری کے اس دور میں ایک تازہ جھونکے کی مانند ہے''۔ (وزیر آغا) ہنوز مطالعے کا تسلسل آپ کی نوازش کی بدولت جاری ہے۔ تازہ شمارہ بھی یقیناً نہ صرف آپ کی تجسس پسند طبیعت کا غماز ہے بلکہ شخصیت، فن اور اہمیت کے لحاظ سے ایک ایسے نابغی ادیب وشاعر کا منظرنامہ ہے جسے پیش کرنے کے بعد چہارسو کے صفحات انمول بن گئے ہیں یوں تو جب سے آپ یہ جریدہ ترسیل کرتے آرہے ہیں اس کا ہر شمارہ میرے پاس محفوظ ہے مگر اس شمارے کو ''دوستوں'' کی دست برد سے مجھے بالخصوص بچانا ہوگا اسد محمد خاں کے حوالے سے جن لوگوں نے بھی بات کی وہ اپنی جگہ اہم تو ہے ہی مگر مبین مرزا اور مظہر جمیل نے جس تفصیل سے روشنی ڈالی اس سے خان صاحب کی شعروادب میں انفرادیت کھل کر سامنے آئی ہے۔ میں نے ان تاثراتی تحریروں کے مطالعے کے بعد بالخصوص فرصت کے چند لمحے نکال کر ''مئی دادا'' پڑھا اور کیا بتاؤں کب تک اس تحریر کے طلسم میں کھویا رہا ویسے بھی میں فکشن کا رسیا ہوں لیکن آج یہاں برملا اس حقیقت کا اعتراف کرتا چلوں کہ اسد محمد خان کی یہ تحریر آنے جانے والے ہر زمانے میں اردو کے ادب عالیہ میں ہمیشہ تابندہ ورخشندہ رہے گی۔ اس افسانے کو پڑھتے ہوئے کئی جگہ تحریر کی شگفتگی نے مجھ پر ایسی وارفتگی طاری کی کہ میں بے تحاشا ہنسنے لگا بلکہ وہ ایک جگہ شجرہ نسب کی تفصیل نے تو مجھے قہقہہ لگانے پر مجبور کردیا اور بیگم بے چاری رسوئی سے دوڑی چلی آئیں کہ کیا حادثہ رونما ہوگیا! بھئی اسد محمد خان زندہ باد اور گلزار جاوید پائندہ باد۔ یہاں ایک اور حقیقت ''قرطاسِ اعزاز'' کے حوالے سے عرض کرتا چلوں تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ اردو ادب کے ان طلسمی وتاریخی کرداروں کا ''چہارسو'' کے قیمتی صفحات پر اعتراف کے ذریعے آپ مجھ جیسے ان ہزاروں قاریوں پر احسان بھی کررہے ہیں جن کے لئے ماضی میں ان کی کتابیں پڑھنا بوجوہ ممکن نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کا یہ مشن جاری و ساری رکھے آمین! براہ کرم کمپوزنگ کی غلطیوں پر نہیں تو کم از کم پروف ریڈنگ کے سہو پر دھیان دیجئے نثر کے علاوہ شاعری میں بھی یہ شکایت عام دیکھی جارہی ہے۔ سرور انبالوی جیسے کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر سے بےوزن مطلع کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ دوسرے مصرع میں ایک لفظ ''کے'' کے اضافے نے مصرع بے وزن کردیا ہے اصل مصرع یوں ہوگا۔
چھوڑ دیتی ہے یہ رستہ بیج دھارے کے لئے۔

غالب عرفان (کراچی)

محترم گلزار جاوید صاحب!

اسلام علیکم۔ چہارسو کا شمارہ ستمبر اکتوبر ۲۰۰۷ء ملا۔ بہت بہت شکریہ میں آپ کا اور جناب شہریار کا مشکور ہوں۔ جناب شہریار نے اسپیڈ پوسٹ سے چہارسو روانہ کیا۔ آپ نے اس شمارے کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے بہت محنت کی ہے تمام مضامین عمدہ ہیں خصوصاً گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، بیدار بخت اور سرور الہدیٰ کے مضامین پسند آئے۔ اس سے پہلے فون پر میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ چہارسو بھیجتے رہیں آج پھر ایک بار لکھ رہا ہوں کہ چہارسو سے محروم نہ رکھیں یا پھر وہ سبیل بتائیں جس سے چہارسو ملتا ہے۔

یٰسین احمد (حیدرآباد،بھارت)

محترم گلزار جاوید صاحب

اسلام علیکم۔ جنوری فروری ۲۰۰۸ء کا ''چہارسو'' ملا یاد آوری کا شکریہ! سب سے اول تو جناب غالب عرفان صاحب کا شکریہ کہ انہیں میری نظم ''صدائے بیگانگی کا مراقبہ'' پسند آئی۔ پھر آپ کی ہمت اور محنت کو شاباش کہ ہر بار اتنا عمدہ اور جامع ومعیاری مواد پر مشتمل جریدہ نکال لیتے ہیں۔ وہی اٹھان اور وہی عظمت وشان جو کبھی آغاز زمانہ میں ''نیرنگ خیال'' کو حاصل ہوتی تھی۔ گوشہ کے علاوہ باقی حصہ بھی کسی طرح کم نہیں اور پھر کون سا ادبی ماہنامہ آج زندہ ہے۔ دو ماہنامے جو آپ کے تھے۔ مدیر حضرات کے ساتھ ہی وداع ہوگئے۔ ماہنامہ ''افکار'' کراچی صہبا لکھنوی اور ماہنامہ ''سریر'' کراچی ڈاکٹر فہیم اعظمی، ہاں ایک عزیز اور راضی بھائی اظہر جاوید کا ماہنامہ ''تخلیق'' ضرور ہے جو کچھ ادب کی خدمت کررہا ہے۔ مختصر تو جیسے تو ناک پر دھرا ہے مگر ادب کے لئے بہت کچھ کررہے ہیں۔ ویسے بھی ماہنامہ کے لئے لوگ زرسالانہ کے طور پر رقم بھیجتے ہیں اور یہ حضرت دس سال کے دئے ہوئے پیسے بھی واپس کردیتے ہیں۔ ''لو بھائی تین ہزار کا چیک حاضر ہے اتنا ہی آپ نے دیا ہوگا'' مجھے دسمبر ۲۰۰۷ء اور جنوری

۲۰۰۸ء کا تخلیق نہیں ملا تھا۔ میں نے پچھلے ہفتے دونوں بیٹوں کو لاہور بھیجا تا کہ وہ بھگوان سٹریٹ پُرانی انارکلی سے دسمبر ۷ء اور جنوری ۰۸ کا شمارہ خرید کر لائیں مگر اُن بیوقوفوں نے جناب اظہر جاوید کو بتا دیا کہ ''ہم پنڈی سے آئے ہیں اور پروفیسر زبیر کنجاہی کے بیٹے ہیں۔ ہمیں دسمبر ۷ء اور جنوری ۰۸ کا تخلیق خریدنا ہے۔'' انھوں نے دسمبر ۷ء کا ماہنامہ دیا اور بتایا کہ جنوری فروری ۰۸ء کا شمارہ اکٹھا ہے جو بھیجا جا چکا ہے۔ دسمبر ۷ء کے شمارے کے پیسے نہیں لیے، اُن کی مہربانی۔ غزلوں کے چند شعر بہت پسند آئے۔

گذشتہ دور کی تاریخ گم شدہ کا ورق
ہمارے سامنے بن کر سوال آیا ہے
غالب عرفان

تُو نے ہر غم سے نوازا ہے ترا خاص کرم
مجھ کو اب یہ بھی نہیں یاد کہ کیا مانگا تھا
مہندر پرتاپ چاند

صابر تغیرات زمانہ سے ان دنوں
اُترا ہُوا ہے چہرہ انسانیت کا رنگ
صابر عظیم آبادی

مصلحت ساز مصلحت اندیش
بزم دنیا میں ارجمند رہے
مشتاق شبنم

قرطاسِ اعزاز (اسد محمد خان) انتہائی کامیاب ہے۔ اسد محمد خان کا افسانہ ''بُرجیاں اور موز'' اور آپ کا ''برِاہِ راست'' خامے کی تخلیق ہیں۔ خط طویل ہو رہا ہے اتنا ہی کافی ہے۔

زبیر کنجاہی (راولپنڈی)

محترمی و مکرمی آداب!

چہارسو کا دوسرا شمارہ ''اسد محمد خاں کے نام'' موصول ہوا۔ شکریہ!
آپ نے اپنے خط میں جس محبت اور خلوص کا اظہار کیا وہ قابلِ تعریف ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ہم سب کے دلوں میں ایسے جذبے پیدا کر دے تا کہ یہ کشاکش ماحول ختم ہو اور لوگوں میں پیار۔ محبت خلوص انسانیت کا جذبہ کارفرما ہو۔ اس شمارے میں آپ نے میری دو تخلیقات نعت اور غزل شامل کر کے ایک اور احسان کر دیا یعنی ایک نہ شُد دو شُد واہ کیا بات بچ کر دی ہے نعت میں مقطع شاید میری تحریر کی خرابی کی وجہ سے گڑبڑ ہو گیا ہے۔ اصل اس طرح تھا۔

دیدار کی تو بات ہی پرویز اور ہے
مجھ کو تو ہے قبول مدینے کی دُھول بھی
کرشن پرویز (دہلی بھارت)

گلزار بھائی اسلام علیکم
مزاج بخیر۔ کراچی سے واپسی پر ''چہارسو'' ملا تو اطمینان ہوا۔ یقیناً آپ کی ہمت و کاوش ہے جو ادب کی خدمت میں سرگرداں ہیں۔ یہ کام دیوانے ہی کر سکتے ہیں کوئی خدمت ہو تو ازراہِ کرم مطلع فرمائیں۔ کراچی میں اہلِ محبت جن میں خصوصاً مکتبہ عالمین، حلقہ فکر جدید، تخلیق انٹرنیشنل۔ اور اللہ والا شاہل ہیں نے نیپا آڈیٹوریم میں جشن ماجد سرحدی کا اہتمام کیا تھا۔ مختصر مشاعرہ بھی ہوا۔ جاوید منظر، اقبال مجیدی پیش پیش تھے۔ پروفیسر شاھدہ حسن اور علی حیدر ملک کے مضامین خوب تھے۔ پروفیسر آفاق صدیقی، جمال نقوی اور اردو لٹریری سوسائٹی والوں نے بھی ادبی نشستوں کا انعقاد کیا۔ محترمہ بینظیر کی شہادت نے ماحول کو سوگوار بنایا۔ بہر حال داستان بینظیر والی شاعرہ بینظیر بھٹو کی دعا مغفرت کیلئے ان کے گھر گیا۔ ملا کر ہمارا تعلق ادب اور قانون سے ہے مگر آنکھیں بند تو نہیں کی جا سکتیں۔ قرطاسِ اعزاز ''اسد محمد خاں'' کے نام کر کے آپ نے حقدار کو حق دیا ہے یہ سلسلہ جاری رکھیں۔ ادب کی تاریخ اس طرح مرتب ہوتی ہے۔ براہ راست حسبِ معمول خوب ہے اور حصہ نظم و نثر قابلِ تحسین۔ دیگر احباب کیساتھ ساتھ گلفتہ نازلی اور خیال آفاقی کو آداب۔

ماجد سرحدی (پشاور)

برادرِ مکرم گلزار جاوید صاحب! آداب و نیاز۔
چہارسو کے تازہ شمارہ (بابت جنوری فروری ۲۰۰۸ء) کا عطیہ موصول ہو کر فردوسِ نظر ہوا۔ آپ کا کرم نامہ خلوص اور محبت کے جن شدید جذبات کا حامل ہے اس کا جواب کہاں سے لاؤں؟ آپ علم و ادب کے جو بے لوث خدمت انجام دے رہے ہیں اس پر رشک بھی آتا ہے اور تحریک بھی حاصل ہوتی ہے۔ خدا آپ ایسے نیک بندے کو ہمیشہ شادمان و کامران رکھے یہی دعائیں دل سے نکلتی ہیں۔

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ بھارت)

برادرِ عزیز گلزار جاوید اسلام علیکم!
حسبِ سابق ''چہارسو'' سوئے خاکسار بھی آیا شروع تا آخر دل کھول کر بات چیت کی ہر ماہ اہلِ ادب کے لئے آپ نے گوشہ سجانے کی جو روایت قائم کی ہے اسے برقرار رکھا۔ اس کے علاوہ دیگر عنوانات پر بنی تخلیقات بھی نظر گذار ہوئیں، نظم و نثر دونوں ہی کا بیشتر حصہ اپنے روایتی حوالے سے لائق مطالعہ ہے نہ جانے کیوں جب ایسے موقعوں پر نگاہ شوق ادب کے مختلف زاویوں پر سفر کرتی ہے تو محسوس ہوتا ہے ہم کاٹھ کے گھوڑے پر سوار ہیں، اپنی حرکات سے خوش گمان ہو کر سمجھتے ہیں کہ سرپٹ دوڑ رہے ہیں، صدیوں کا سفر سالوں میں نہیں بلکہ منٹوں میں کر رہے ہیں۔ جبکہ فی الاصل ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں صدیوں پہلے موجود تھے، ماخن برابر بھی تو آگے نہیں کھسک سکے۔ یوں ہمارے محترم

نقادانِ ادب رسم تنقید ادا کرنے کی خاطر ہر لکھنے والے کو نئی جہتوں کا مسافر اور نئے جہانوں کا سفیر لکھتے نہیں تھکتے، کسی قدر خوبصورت خیالات لا راور پھلجڑیاں چھٹتی نظر آتے ہیں۔ ''صاحب کتاب فکرونظر کے نئے زاویے تلاش کرتا اور نئے رجحانات کی طرف محو پرواز دکھائی دیتا ہے۔'' میرے بھائی! کیا یہ سب لفظوں کا گورکھ دھندا نہیں؟ اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم بحیثیت مجموعی از کار رفتہ خیالات اور فرسودہ مضامین کی جگالی کئے جاتے ہیں۔ (الا ماشا اللہ) ناقد سرِ نگریاں ہو کہ نہ ہو، انصاف انگشت بدنداں ضرور ہے یہ دیکھ کر کہ ہم لوگ وقت کا کس سفاکانہ انداز میں اجتماعی قتلِ عام کرنے میں بیباک نظر آتے ہیں۔ ذرا نہیں سوچتے کہ یہ عمر عزیز قدرت کا عظیم عطیہ ہے مگر ہم خیالی محبوب اور جعلی درد والم کے لاحاصل تذکروں میں وقت کو یوں گنوا رہے ہیں گویا خودکش حملوں کی ریہرسل میں مصروف ہوں۔ نثر میں آج بھی بچاری مظلوم طوائف کا غم انسانی دوست افسانہ نگاروں کو کھائے جارہا ہے۔ اور غزل گو شاعر! اسے تو آج بھی ''عورت'' سے گفتگو نے عدیم الفرصت بنا رکھا ہے۔ حالانکہ وہ عورت کون ہے جس سے یہ غزل کے پردے میں محوِ کلام چلا آتا ہے اس کی آج تک تحقیق ہو سکی نہ تخصیص ممکن ہو سکی۔ برادر محترم ایک احساس پریشان کئے تھا سو اس کا اظہار اس صورت کر بیٹھا کہ آپ سے باتیں بھی ہو گئیں اور کچھ جی ہلکا ہو گیا۔ ورنہ ہم کہاں اور کس کس کو سمجھانے جائیں گے، اوروں کو چھوڑیئے شاید خود کو بھی قائل نہ کر سکیں۔ امید ہے آپ مع احباب عافیت میں ہوں گے۔ دعا گو ہوں، مہربان خالق و مالک آپ کو اور مجھے اپنی پناہ میں رکھتے ہوئے صحیح سوچنے اور درست کام کرنے کی توفیق رفیق بخشے اور میاں نظیر کی طرح تاسف نہ کرنا پڑے کہ

جس کام کے لئے جہان میں آیا تھا اے نظیر
خانہ خراب تجھ سے وہی کام رہ گیا

خیال آفاقی (کراچی)

محترم جناب گلزار جاوید صاحب،

آداب!

کچھ دن پہلے ہی ''چہارسو'' کا جنوری فروری کا تازہ شمارہ اپنی مخصوص آب وتاب کے ساتھ ہمدست ہوا۔ کرم فرمائی کے لیے تہہ دل سے مشکور ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ چہارسو کی addiction ہو گئی ہے۔ ایک شمارہ ملتا ہے اس کے ایک ایک صفحے کا مطالعہ ہوتا ہے۔ شعری حصے کا لطف لیا جاتا ہے آرام سے ایک ایک افسانہ پڑھا جاتا ہے، یہاں تک کہ رس رابطے بھی نہیں چھوٹتے۔ ابھی یہ ختم بھی نہیں ہوتا کہ اگلے شمارے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ آپ اسے addiction نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے۔ بہر حال یہ عادت اور چہارسو کا نشہ اچھا لگتا ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ آپ نے افسانوں کی تعداد بڑھادی ہے۔ یہ بہت ہی خوشی کی بات ہے۔ اصغر ندیم سید کا ''بڑا چیمپیئن'' قصائی کے پیشے کی جو تصویر اور تفصیل پیش کرتا ہے وہ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی افسانے میں نہیں پڑھی۔ افسانہ نہ صرف دلچسپ مگر معلوماتی بھی ہے۔ سلطانہ مہر کا افسانہ ''دل کی آبروریزی'' ایک دردناک افسانہ ہے جو دل کو چھو جاتا ہے۔ یہ تو رشتوں اور انسانیت کی آبروریزی ہے۔ ''بانو سیو آہیتی''، ''یہ وفا کی سخت راہیں'' ہمارے سماج اور نفسیات کی تصویر پیش کرتا ہے۔ ''مجرم'' دلچسپ افسانہ ہے مگر اس کا اختتام دل میں رنج پیدا کرتا ہے۔ اسد محمد خاں کے دونوں افسانے ''برجیاں اور سوز'' اور ''سٹی دادا'' لاجواب افسانے ہیں۔ ''برجیاں اور سوز'' دیر تک دل و دماغ پر چھایا رہا۔ اتنے خوبصورت افسانے پڑھنے کو ملے مگر گلزار جاوید اس محفل میں شامل نہیں تھے۔ اُن کی کمی محسوس ہوتی رہی۔ جسے کچھ حد تک ''براہ راست'' کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کی۔ اس میں اندازِ گفتگو اچھا لگتا ہے قرطاسِ اعزاز کا آپ کا یہ جو سلسلہ ہے بہت ہی خوب ہے۔ اس کے ذریعے نامِ گرامی ادیب کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہو جاتی ہے۔ اسد محمد خان صاحب کے بارے میں بہت کچھ جاننے کو ملا۔ ''زندگی سے مجھ کو پیار ہے'' پڑھ کر مزا آیا۔ ''گل وگلزار کا رنگ'' تو رنگ برنگ پھولوں سے سجا ہوا ہے۔ جس محفل میں مشہور شعرا اپنے کلام کے ساتھ شامل ہوں اُس محفل کے بارے کیا کہنا۔ اس بار شعری حصے کی تعداد بھی آپ نے بڑھادی ہے۔ آپ نے دور دراز کے ادیبوں اور شعرا کو ایک ہی جگہ جمع کر کے چہارسو کی محفل بہت اچھے سے سجائی ہے۔ رباعیات، نظمیں اور دوہے غزلوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ آپ کی اس کامیابی پر آپ کو مبارکباد دیتی ہوں۔ ''چہارسو'' کے بارے جو صفوت علی صفوت نے اپنی غزل میں بیان کیا ہے میں اُس سے متفق ہوں۔

رینو بہل (چنڈی گڑھ، بھارت)

اسلام علیکم اور بہت آداب

محترم گلزار جاوید صاحب۔ امید ہے اب رسالہ گم ہونے سے پیدا ہونے والی برہمی کم ہو چکی ہوگی اور اب آپ کی طبیعت ناخوش نہیں ہوگی۔ معلوم نہیں محکمۂ ڈاک رنگ، نسل، ملک، ہر حد حتیٰ کہ براعظم تک کے امتیاز سے بالاتر ہو کر میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتا ہے۔ میں نے کینیڈا کے محکمۂ ڈاک سے ایک سروس لی تھی جس کے تحت پرانے پتے پر آنے والی تمام ڈاک نئے پتے پر بھیجی جا رہی تھی مگر آپ کا پارسل پتہ نہیں کیوں نہیں بھیجا گیا، آپ کو بھی ذہنی کوفت ہوئی اور مجھے بھی اور افسوس بھی۔ آپ کا پھر شکریہ کہ آپ نے پچھلا شمارہ دوبارہ بھیج دیا ورنہ میں آپ کی تحریر پڑھنے سے بھی محروم رہ جاتا۔ یہ آپ کے نہیں میرے مفاد کی بات تھی سو شکریہ

فیصل عظیم (کناڈا)

جانِ برادرا ہدیۂ خلوص و محبت

عین انتظار کی گھڑی میں ''چہارسو'' اپنی تمام تر خوبصورتی اور خوش نمائی کے ساتھ ہاتھ لگا۔ کس طرح شکریہ ادا کروں۔ اس کرمفرمائی کے لئے الفاظ کہاں ساتھ دے رہے ہیں۔ میں تو یوں کرنے لگا ہوں کہ ہر نماز کے بعد صدق دل سے آپ کی صحت اور تندرستی کے لئے خدائے بزرگ و بالا سے دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ ضرور بالضرور اللہ اس عاصی کی دعائیں قبول کرے گا۔ قرطاسِ اعزاز کے سلسلے میں اس بار قرعہ فال جناب اسد محمد خاں کے نام نکلا۔ ان کو میری طرف سے بہت بہت مبارکباد۔ یہ اعزاز اپنے آپ میں بڑی معنویت اور طمانیت رکھتا ہے۔ اسد محمد خاں بھرپور شخصیت کے مالک ہیں وہ ایک بڑے افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ پُرگو شاعر بھی ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری اور شاعری کی بہتر سے بہتر پہچان کے لئے چہارسو کے صفحات پر ان کے افسانے اور ان کی شاعری کے نمونے درج ہیں۔ انھوں نے ریڈیو اور ٹی۔وی کے لئے تو بے پناہ لکھا ہے۔ ابھی بھی ان کا قلم متحرک ہے اس لئے ان سے یہ امید وابستہ کرنا کہ ابھی وہ ادب کو بہت کچھ دیں گے غلط نہیں۔ آپ نے قرطاسِ اعزاز ان کے حق میں کرکے ایک ٹھوس کام کیا ہے۔ نظموں اور غزلوں کا حصہ اس بار اور بھی جاندار ہے۔ نثری حصے میں بھی عمدہ چیزیں ہیں۔ غرض کہ رسالہ کے تمام تر مشمولات خوب سے خوب تر ہیں۔ چہارسو کی یہ خصوصیت یقیناً بے مثال ہے کہ اس میں ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کی حصہ داری بھرپور رہتی ہے۔ خدا میرے ''چہارسو'' کو ہمیشہ ہمیشہ زندہ و سلامت رکھے۔ آمین ثم آمین

محمد ایوب واقف (ممبئی/بھارت)

محترمی گلزار جاوید تسلیمات

اسد محمد خاں صاحب (الف میم خے) کی بابت آپ نے جو اپنا حق ادا کیا یہ صرف اور محض توفیق و تائید ایزدی ہے (ساقی فاروقی کی آپ بیتی قسط وار مکالمہ کراچی) مبین مرزا کے ادارے اکادمی بازیافت سے جنوری ۲۰۰۸ میں طبع شدہ بازار میں آ گئی ہے جس میں خان صاحب کے حوالے سے ساقی نے بہت کچھ لکھا ہے۔۔۔ عصر حاضر میں غیر مسعود کے بعد خان صاحب اور پھر ان دونوں جیسا تو کوئی نہیں ہاں ''کہانیاں'' بنانے اور بننے والے بے شمار بلکہ بقا رمسعود صاحب کے الفاظ میں ''قطار اندر قطار''۔ نیلوفر اقبال' طاہرہ اقبال' حامد سراج' جاوید اختر بھٹی' نگہت نسیم اور بھارت کے بہت سے کہانی کاروں کے استثناء کے ساتھ کہ یہ سب واقعی مہان ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

انور جاوید ہاشمی (کراچی)

انکل اسد صاحب محترم

مدت سے آپ کی تخلیقات کا قاری اور آپ کا مداح ہوں مگر ''چہارسو'' میں آپ سے تفصیلی ملاقات کے بعد دل باغ باغ ہو گیا جس کے لئے گلزار جاوید بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میں نے آپکو چچا کہہ کر اس لئے مخاطب کیا کہ میری پیدائش بھی بھوپال کی ہے اور میرے والد صاحب مظفر حنفی صاحب کو بھی بھوپال بہت پسند ہے جس کا ذکر وہ اپنی تحریروں اور اشعار میں کیا کرتے ہیں۔ مثلاً

اے مظفر کس لئے بھوپال یاد آنے لگا
کیا سمجھتے تھے کہ دلی میں نہ ہوگا آسمان

یا

سولہ دلّی میں قطعی' سترہ بھوپال میں
بارہ برس ساتیں گذریں مغربی بنگال میں

پرویز مظفر (برمنگھم)

مکرمی! محترمی! اسلام و اکرام

کہسار جرنل۔۔۔۔ ہندوستان کے تازہ شمارے میں ''چہارسو'' کا اشتہار نظر سے گذرا تھا' نام اپنی معنویت کے اعتبار سے متاثر کرتا ہے۔ شہر ادب کی چہار سمتوں میں بیک وقت پھیل کر نئی زندگی کے نوخیز رجحانات کا احساس دلاتا ہے۔ پھر اس کے بعد آنکھیں حیرت اور استعجاب سے گزرتی ہیں، کرزر سالانہ ''دلِ مضطرب نگار وفیقانہ'' دولت کے لیے خوار ہوتے ہیں کے دور میں یہ کون ہے جو اپنے اجداد کے دیرینہ اوصاف کی انگلی پکڑ کر راہ حیات میں نکل پڑا ہے جبکہ آج کل انسان سب کچھ بھول کر صرف دولت کی ڈگڈگی پر ناچ رہا ہے۔ پاکستان میں ڈاکٹر فہیم اعظمی صاحب ''صریر'' کراچی کے شماروں میں مسلسل شائع کیا کرتے تھے ان کے انتقال کے بعد جناب شاہد شیدائی صاحب کاغذی پیرہن' میں شائع فرما رہے ہیں' اور کبھی کبھار کی صورت میں 'تخلیق' آئندہ' حریم ادب'' میں بھی کلام شائع ہی جاتا ہے۔ شکریہ عزیزان پاکستان

شارق عدیل (ا،د، بھارت)

محترم گلزار جاوید صاحب

''چہارسو'' بڑے تواتر سے مل رہا ہے اس کرمفرمائی کے لیے شکر گذار ہوں۔ تازہ شمارے کا اسد محمد خاں کے نام منسون کیا جانا بھی ایک اچھا اقدام ہے۔ یقیناً وہ اس کا استحقاق رکھتے ہیں اصغر ندیم سید اور سلطانہ مہر کے افسانے جبکہ انوار فیروز' عارف شفیق' محمد ظہیر' مشکور حسین یاد' محسن احسان' غالب عرفان اور کرشن کمار طور کی منظومات دامن دل کو کھینچتی ہیں

ڈاکٹر جواز جعفری (لاہور)

برادر گرامی گلزار جاوید صاحب! سلام مسنون!

آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے 'چہارسو' کا تازہ شمارہ جنوری فروری ۲۰۰۸ بھجوایا۔ اس شمارے کی دو کاپیاں آپ نے ارسال کیں دوسری کاپی الطاف حسین اسد صاحب کو میں نے دے دی ہے۔ آپ کو شکریہ کا خط لکھنے میں تاخیر

ہوگئی ہے معذرت! جس روز پرچہ ملا اس سے اگلے ہی روز مجھے بھارت جانا تھا۔ دس روز وہاں قیام رہا۔ دو روز پہلے لوٹا ہوں۔ وہاں جوگندر پال صاحب سے ملاقات میں آپ کا اور آپ کے پرچے کا ذکر آیا اور اچھے لفظوں اور تحسین آمیز پیرائے میں آیا۔ تازہ شمارے میں اسد محمد خاں کا گوشہ خاصے کی چیز ہے۔ مبین مرزا اور مظہر جمیل نے اسد محمد خاں کے افسانوں پر عمدہ مقالات پیش کیے ہیں۔ خاں صاحب نے "میں کیوں لکھتا ہوں" میں اپنے تخلیقی عمل سے متعلق خیال افروز باتیں لکھی ہیں۔

ناصر عباس نیّر (لاہور)

محترم گلزار جاوید صاحب

اسلام علیکم: "چہارسو" کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ آپ کی محنت کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ اسد محمد خاں پر شمارہ مختص کرکے آپ نے بلاشبہ ایک ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ موجودہ عہد کی ایک اہم ادبی شخصیت کو چہارسو کے ذریعے ذاتی اور شخصی حوالے سے متعارف کروا کے آپ نے ان کی تخلیقات کی تفہیم کا اہتمام کیا ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں تھا کہ اس میں اسد محمد خاں کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا یعنی اُن کے کچھ اور افسانے پڑھنے کو ملتے۔

اسد فیض (راولپنڈی)

مدیر محترم سلام مسنون۔

خدا کرے کہ نیا سال سب کے لئے مبارک ثابت ہو!

نئے سال کے استقبال کی ایک صورت "چہارسو" کا مطالعے میں آنا بھی ہوا کرتا ہے۔ اسد محمد خان صاحب کے نام "قرطاسِ اعزاز" اس سلسلے کی ادبی فتوحات میں اک اور گراں قدر اضافہ ہے۔ براہ راست "صاحبِ قرطاسِ اعزاز" کی شعری وفنی جہتوں کے مختلف زاویوں سے سیر حاصل آگہی ہوئی۔ 'With Due Apology' سے تصنیفی و تالیفی ترتیب سے واقفیت پائی۔ "میں کیوں لکھتا ہوں" میں لکھنے کے جواز خوبصورتی و دلچسپی سے پیش کیے۔ "زندگی سے مجھ کو پیار ہے" کے تحت ہمعصروں و قلمکاروں کے اخلاص نامے ان کے علمی و ادبی مقام ومرتبے کو احسن انداز سے متعین کرتے ہیں۔ عرصۂ شاعری کو نئے عنوانات سے مزین کرکے محترم محمود الحسن (گل وگلزار کے رنگ) پروفیسر زبیر کنجاہی صاحب (گھر سے باہر گرمیں) اور محترم ستیہ پال آنند (معبود کے در پر) کو بجا طور پر خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ تخلیقِ عصر میں نئی کتابوں کے حوالے سے روشن خیالی اور عصری شعور کا جہان آباد ہے۔ "مانوسیہ امیتی" اپنے اندر معمول سے ہٹ کر انوکھے اقتباسیے کا تحیر لیے ہوئے ہے۔ "بے وفا کی سخت راہیں" انسانی نفسیات کی عمل ورد عمل کے حوالے سے متضاد ومتصادم کیفیات کو اُجاگر کرتا ہے قارئین نے آپ کی کہانی کی کمی محسوس کی ہوگی۔ اب کچھ ذکر کمپوزنگ کے حسن و سلوک کا ہو جائے۔ غزل کے چوتھے شعر کا پہلا مصرعہ یوں ہے "خدمت گزاری نے ہے کیا طرفہ صلہ دیا"۔ "لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"۔ غالب کے مستعار اس مصرعے کو واوین میں نہیں کیا گیا۔ دیدہ ور کے دوسرے قطعے کا دوسرا مصرعہ "یہ بھی فرق تجھ کو پتہ نہیں جو حقیقت اور ہے مجاز میں" اور پانچویں قطعے کا تیسرا مصرعہ "بہت جھڑ کو دیکھ دیکھ کے پژمردگی نہ ہو" اپنی درست ترتیب میں اس طرح تھے۔ اور ان پرستزاد قطعات کے مصرعوں کی طوالت واختصار بھی کوئی خوشگوار تاثر نہیں دیتی جو سراسر از خود ہے۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

برادر محترم گلزار جاوید صاحب سلام ورحمت،

تازہ شمارے میں قرطاسِ اعزاز اسد محمد خان کے نام ہے۔ حسبِ روایت اس بار بھی مدیر رسالہ کا انتخاب لاجواب ہے۔ اسد محمد خان اردو کے ایک اہم ادیب وشاعر ہیں۔ بلکہ صاحبِ طرز افسانہ نگار ہیں۔ ان کا شمار ان افسانہ نویسوں میں ہوتا ہے جن کے ہاں اسلوبیاتی سطح پر زبان کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اسد محمد خان کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ ان کے افسانوں کی زبان ان کی ذہانت میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ جو ان کی کہانیوں کو عقل وشعور کی ایک خاص سطح بخش دیتی ہے جیسی کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مضامین میں پائی جاتی ہے۔ اگر ہم سے کوئی اردو فکشن میں اسد محمد خان کے فنی تفاعل کے بارے میں استفسار کرے تو ہمارا جواب ہوگا، Asad Muhammad Khan Intellectaulises The Fiction۔ اسد محمد خان کا شاملِ اشاعت افسانہ "برجیاں اور سوز" ایک طوائف کے کوٹھے کا منظر وپس منظر پیش کرتا ہے مگر کہیں بھی جنسی بھوک، جنسی حکمت یا جنسی عمل کے ذکر سے قلم آلودہ نہیں کیا گیا۔ دراصل اسد محمد خان کوٹھے کی زندگی سے زیادہ اس زندگی کے محرکات کے بیان میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور بین السطور سماجی ومعاشرتی حقائق کھولنے کی کاوش کرتے ہیں "براہ راست اسد محمد خان کی ذہنی موشگافیوں کی دستاویز ہے جو انٹرویو سے زیادہ ایک علمی وادبی مقالا محسوس ہوتی ہے۔ بلاشبہ ان کا مطالعہ وسیع، ذہن زرخیز اور فنی ریاضت بے پناہ ہے۔ اسد محمد خان نے اپنے دوست سرویشور دیال سکسینہ کی نظروں کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ ان میں سے چند "چہارسو" کے تازہ شمارے میں شامل ہیں۔ ان نظموں کا لسانی وفنی نظام انھیں ایک کامیاب مترجم ہی نہیں مکمل نظم گو شاعر بھی ثابت کرتا ہے۔ اگر وہ نظم نگاری پر بھی توجہ مرکوز رکھتے تو یقیناً ایک بڑے افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے نظم نگار بھی تسلیم ہوتے۔ عقیلہ اسماعیل کا مضمون "جمالیاتی ذوق کا امین" جسکا ترجمہ رضی مجتبیٰ نے کیا ہے اسد محمد خان کی شخصیت اور فن کے تعارف کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ عقیلہ نے افسانہ نگاری کی روح فن تک پہنچنے کی کامیاب کاوش کی ہے۔ مترجم کی کاوشیں بھی سراہے جانے کے قابل ہیں۔ مبین مرزا اسد محمد خان کی طرح ایک ذہین قلمکار ہیں۔ وہ تخلیق وتنقید دونوں میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کا مضمون "نئی

زمین نئے آسمان ترا شا" زیرِ نظر شمارے میں خاصے کی چیز ہے مرزا صاحب نے دقتِ نظر سے اسد محمد خان کی افسانہ نگاری کا تجزیہ پیش کیا۔ ان کا تجزیہ بجائے خود ایک علمی و ادبی شہ پارہ ہے۔ وہ نہ صرف افسانہ نگاری کے بھی عارف ہیں اور اسد محمد خان کے فن اور شخصیت کی معارفت بھی انہیں حاصل ہے۔ ہم ان کے صادر کیے ہوئے ہر فتوے کو بلا چون و چرا تسلیم کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ سب کے سب اخلاص نیت اور ادبی دیانت داری کے مظہر ہیں۔ ان کی تخلیقی تنقید کی بنیادی خصوصیت توازن اور غیر جانب داری ہے۔ ان کی رائے میں جو منطقی استدلال پایا جاتا ہے وہ بہت کم تنقید نگاروں کے ہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ سید مظہر جمیل نے اپنے مضمون "اسد محمد خان کا جہان فن" میں اسد محمد خان اور غالب میں مشابہت دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی صدی کے ایک عظیم شاعر کی کسی افسانہ نگار میں مشابہت تلاش کرنا ہمیں کچھ عجیب سا لگا ہے ہر چند سید صاحب نے خان صاحب کی افسانہ نگاری کی فنی جہات کا بڑی مہارت سے احاطہ کیا ہے۔ تاہم ایک ادیب کو ایک شاعر کی شبیہ قرار دینا غیر منطقی سی بات ہے۔ البتہ سید مظہر جمیل کی اس رائے پر صاد "اسد محمد خان جس ملائمت اور دھیرج سے کہانی کا آغاز اٹھاتے ہیں، اس کا اختتام بھی ویسے ہی سبک انداز سے ہو جاتا ہے، نہ کوئی دھماکہ نہ کوئی بینگ (bang) ہاں ایک ہلکے سے ارتعاش کی کیفیت ضرور رہتی ہے۔ چونکا دینے والی بات جو ہمارے بعض معتبر اور طرح دار افسانہ نگاروں کی امتیازی خوبی ٹھہری ہے۔ اسد محمد خان کے ہاں نہیں ملتی" اسد محمد خان کا ایک اور شامل اشاعت افسانہ "مئی دادا" ان کے فنی مزاج کا عکاس ہے جو انسانی محبت کے جذبے میں گندھا ہوا ہے۔ "مئی دادا ایک تہذیبی کردار ہے جو گنگا جمنی کلچر کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور بہر زاویہ فکر احساس انسانیت کو اجاگر کرتا ہے۔ شمارے کے دیگر مشمولات میں اصغر ندیم سید کا افسانہ "بڑا چیمپئین" ایک بیانیہ ہے۔ جو کہانی کار کی زبان و بیان پر قدرت کے شواہد فراہم کرتا ہے البتہ فنی اعتبار سے یہ افسانہ نگاری کے تقاضوں کو کما حقہ پورا نہیں کر سکے ہیں۔ مثلاً تصادم تجسس، نقطہ عروج اور افسانوی اختتام پر اس افسانے میں انہوں نے توجہ نہیں دی ہے۔ سلطانہ مہر کا افسانہ "دل کی آبرو ریزی" اپنے عجیب و غریب عنوان کے باوصف ایک تاثر آفرین کہانی ہے۔ جو ماں کے ایثار کی ایک عبرت انگیز مثال پیش کرتی ہے۔ سماج و معاشرہ کی ایسی ایسی سفاک حقیقتیں آئے دن سامنے آتی ہیں کہ انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سلطانہ مہر کی مہارت فن پر دلالت کرتے ہیں۔ نعت کے درج ذیل اشعار ہمیں اچھے لگے۔

بے سہارا ہوں ڈھونڈنے جاؤں کہاں
جب کہا میں نے مجھے آئی صدا طیبہ کو چل

اسلم راہی

جو نہی نبی ﷺ کے نور کی تشکیل ہو گئی
اک عکس نا تمام کی تکمیل ہو گئی

مظہر بخاری

میں اور کیا دوں دعا تجھ کو اے مرے ہمدم
لگن تجھے بھی لگائے خدا مدینے کی

خورشید انور رضوی

"گل و گلزار کا رنگ" میں محسن احسان، کرشن کمار طور اور اسلم راہی کی غزلیں ہمیں پسند آئی ہیں۔ شاید محمود الحسن نے مولانا حالی کا درج ذیل شعر نہیں پڑھا ہے

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ وہ در کی صورت

ورنہ یہ شعر نہ کہتے۔

ان کے جاتے ہی یہ کیا حال ہے میرے گھر کا
اب نہ وہ در کی ہی صورت ہے نہ دیوار کا رنگ

شاید ہمارا ایک شعر کمپوزنگ کے تیر کا نشانہ بن گیا ہے جس میں لفظ "میرے" اضافی کمپوز ہوا ہے۔ شعر کچھ یوں ہے۔

وہ چند سانس تھے جو ختم ہو گئے آخر
میں اب بھی وقت کے ہونٹوں پہ ہوں، مرا تو نہیں

قیصر تمکین (کراچی)

گلزار جاوید بھائی السلام علیکم

کنول صاحب کے ذریعے چہار سو مل رہا ہے۔ میں اس عنایت کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ تازہ شمارہ اسد محمد خان صاحب کی ہمہ جہت شخصیت سے خوب انصاف کرتا ہے "شب خون" سے سوغات میں اسد محمد خان صاحب کی تخلیقات دیکھنے کی عزت حاصل ہوتی رہی ہے۔ اک بار مکمل تعارف حاصل ہوا۔ With Due Apology سے ہی ان کی شخصیت کھلنے لگتی ہے۔ اور پھر "میں کیوں لکھتا ہوں؟" کا جواب دے کر انھوں نے قاری کو ہم نوا بنانے کے جتن کیئے ہیں۔ مختلف مشاہیر کا اسد محمد خان پر بھرپور مضامین لکھنا ان کی مقبولیت کا غماز ہے۔ دل کی آبرو ریزی (سلطانہ مہر صاحبہ) بہت پسند آیا۔ دیگر شعراء کی غزلیات بھی مزہ دے گئیں۔ "گھر سے باہر" کرنوں میں آپ نے ہند و پاک دونوں کے مشاہیر جمع کر دیے ہیں خاص طور پر ڈاکٹر جواز جعفری کی غزل متاثر کرتی ہے۔ صوتی قافیے بھی انہوں نے خوب استعمال کیے ہیں۔ پاک۔ بلاک۔ کے ساتھ ساتھ عراق۔ عاق۔ لاک Lock بھی مزہ دیتا ہے۔ تازہ تصانیف کا تعارفی سلسلہ بہت اچھا ہے۔

رؤف خیر (حیدرآباد بھارت)